جلد ۱۰۶ جولائی سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال

سلسلۂ تاریخ ہند

عہد مغلیہ

مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

(جلد اول)

ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے عہد کی فارسی وانگریزی اور اردو میں ہندو و مسلمان مورخین نے جو بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے ہیں، اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور دور جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں قیمت [illegible]

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (ایم۔اے)

کشمیر

سلاطین کے عہد میں

خطۂ جنت نظیر کشمیر کو علمی و تمدنی و سیاسی اعتبار سے ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے اس وقت تو ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف ہیں، اس کتاب میں اس لالہ وگل کی سرزمین پر مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ان کی بہت ہی مستند اور مفصل، سیاسی اور تمدنی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، قیمت: [illegible]

(مرتبہ جناب محب الحسن صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ) مترجمہ ملک حماد عباسی صاحب ایم۔اے۔ (اعظم گڑھ)

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

جلد ۱۰۶ - ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۷۰ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مسلمانوں کے پرسنل لا میں حکومت جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، فی الحال کسی تبدیلی کا ارادہ نہیں رکھتی، لیکن ادھر چند دنوں سے جس زور شور سے اس کا پروپیگنڈا جاری ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ یہ مسئلہ سنجیدہ شکل نہ اختیار کرلے، مسلمانوں کا پرسنل لا محض معاشرتی نہیں بلکہ مذہبی مسئلہ بھی ہے، اسکے متعلق کلام مجید میں صریح احکام موجود ہیں، مذہب، تہذیب اور زبان وہ بنیادی چیزیں ہیں جن پر قوموں کی انفرادیت اور انکے قومی و ملی وجود کا مدار ہوتا ہے، اسلئے کوئی قوم بھی ان میں مداخلت گوارا نہیں کرسکتی اور ان کو چھیڑنے سے بڑے بڑے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اسی لیے دنیا کے تمام دستوروں میں ان کے تحفظ کی پوری ضمانت ہوتی ہے، اور ہندستان کے دستور میں بھی موجود ہے، مسلمانوں کا معاملہ تو الگ رہا خود اکثریت میں جنکا مذہب اور کلچر قریب قریب یکساں ہے، زبان اور صوبائی مسائل پر کتنا بڑا انقلاب برپا ہے، مذہب کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ نازک ہے، اسلئے مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی دستوری حقوق، جمہوریت اور قومی مصالح سب کے خلاف ہے

پرسنل لا کے مسئلہ میں بعض اسلامی حکومتوں کی مثال اور چند مغرب زدہ مسلمان مردوں اور عورتوں کا مطالبہ دلیل نہیں بن سکتا، کسی مسلمان کو بھی اس میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے، یہ حکومتیں مسلمان ضرور ہیں لیکن اسلامی نہیں ہیں، اور انکے یہاں پورا قانون شریعت رائج نہیں ہے، اور وہ خود مغربی تہذیب کے طلسم میں گرفتار ہیں، دوسری بڑی بات یہ ہے کہ یہ حکومتیں خواہ کتنے ہی آزاد خیال اور ترقی پسند ہوں بہرحال مسلمان ہیں اور ان پر رائے عامہ کا اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ وہ کوئی اقدام ایسا نہیں کرسکتیں جس سے مسلمانوں کی ملی خصوصیت کو نقصان پہنچے، اس وقت اسلامی حکومتوں میں ٹرکی اور مصر سب سے زیادہ ترقی پسند اور مغربی تہذیب سے

متاثر ہیں، اس کے باوجود ان کے یہاں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا پورا نظام اور مذہبی امور کی وزارتیں قائم ہیں، اس لیے ان کی ترقی پسندی سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی کی شکلیں بھی موجود ہیں، مصطفیٰ کمال نے اپنے زمانہ میں بہت سی مذہبی چیزیں ختم کردی تھیں لیکن ترک قوم مسلمان ہے، اس لیے بعد کی حکومت کو انھیں پھر سے جاری کرنا پڑا، اور آج ٹرکی میں ہر مسلمان کے لیے مذہبی تعلیم لازمی ہے، بڑے بڑے مذہبی ادارے قائم ہیں، اور مصر تو دنیائے اسلام میں مذہبی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے، اسلیے حکمران طبقہ کی آزادی پسندی سے جو دینی نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی مذہبی تعلیم اور مذہبی نظام وغیرہ سے ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کی ملی خصوصیات میں فرق نہیں آنے پاتا بلکہ خود حکومت اس کو قائم رکھتی ہے، اس لیے اسلامی ملکوں پر ہندوستان کے مسلمانوں کا قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، یہاں تو کوئی چیز بھی مسلمانوں کے اختیار میں نہیں ہے، اس لیے کسی نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی، باقی مغرب زدہ اور حکومت وقت کے چشم و ابرو کے پابند مسلمانوں کی کسی زمانہ میں بھی کمی نہیں رہی ہے جب جن سنگھ تک کو مسلمان مل جاتے ہیں تو حکومت کا کیا سوال۔

اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور سے قابل غور ہیں، ایک یہ کہ ہندوستان کے کتنے مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں، اس زمانہ میں جب ایک بیوی اور اس کے بچوں کا بار اٹھانا مشکل ہے، ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ہمت کون کرسکتا ہے، اس سے زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہوتی ہیں وہ مستزاد ہیں، ہزار دو ہزار مسلمانوں میں شاید ایک دو مثالیں اس کی مل سکیں، ان کی سزا کے لیے زندگی کی تلخیاں کافی ہیں، دوسرے کلام مجید میں بیویوں کے درمیان عدل و مساوات کی شرط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت ہے، ورنہ ایک پر قناعت کرنے کا حکم ہے، اگر اس اجازت سے کوئی مسلمان غلط فائدہ اٹھاتا ہے، اور دوسری بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس کے لیے شرعی عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس کا تدارک کرنا علماء کا فرض ہے، حقیقت یہ ہے کہ

اس قسم کے مسائل میں دشواریوں کا حل اس لیے نہیں نکلتا کہ مسلمانوں کا شرعی نظام قائم نہیں ہے، ورنہ یہ دشواریاں پیش نہ آتیں، علماء کو ان کا حل سوچنا ہے، ورنہ زمانہ کی رَو کو روکنا دشوار ہو جائیگا۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں کی تجارت عرصہ سے بند ہے، اب پاکستان نے اخبارات اور رسالوں پر بھی پابندی عائد کر دی ہے، نہ وہاں کے اخبارات یہاں آسکتے ہیں اور نہ یہاں سے وہاں جا سکتے ہیں، جس سے دونوں کے علمی حلقوں کو پریشانی ہے، معارف کے قدردان پاکستان میں زیادہ ہیں، کچھ خریدار تو ہر پرچہ رجسٹری منگانے کے لیے تیار ہیں لیکن اس میں مصارف زیادہ ہیں، اس لیے پرچے معمولی محصول پر بھیجے جاتے ہیں، جو کسٹم والوں کی مہربانی سے بہت کم پہنچتے ہیں، اور اکثر و بیشتر خریداروں کو دو دو مرتبہ پرچہ بھیجنا پڑتا ہے، پھر بھی نہ پہنچنے کی شکایت برابر آتی رہتی ہے، اگر یہ بندش قابل اعتراض لٹریچر کو روکنے کے لیے کی گئی ہے تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں، لیکن خالص علمی و ادبی پرچوں کو روکنا جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، سخت زیادتی اور علم و فن پر ظلم ہے، حکومت پاکستان سے ہماری درخواست ہے کہ ایسے پرچوں کو مستثنیٰ کر کے ان کی فہرست شائع کر دے، معارف کے خریدار پاکستان میں زیادہ ہیں، اس لیے اس بندش سے اسکو اتنا مالی خسارہ ہو رہا ہے کہ اگر وہ دار المصنفین کا ارگن نہ ہوتا، جس کو ہر حال میں جاری رکھنا ہے، تو محض اس کی آمدنی سے اس کا چلنا مشکل تھا، ہندوستان میں اتنے خریدار نہیں ہیں کہ تنہا اس سے اسکے مصارف پورے ہو سکیں، کاش ہماری آواز حکومت پاکستان تک پہنچ سکتی، ہندوستان کے اسلامی اداروں سے علمی ہمدردی یہاں کے مسلمانوں کی بڑی خدمت ہے،

مقالات

اسلامک اسٹڈیز کا مقصد اور اسکی تاریخ

از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی

(۲)

فقہ کا مطالعہ اسلامی فقہ کو مشرقیات میں اس کا جائز مقام دلانے کا سہرا ولندیزی (ڈچ) مستشرق سوک ہرخرنیہ کے سر ہے۔ جو یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کے تیسرے رکن متصور ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان سے پہلے ہدایہ کا مکمل انگریزی ترجمہ ہو چکا تھا، اور اسلامی قانون پر یورپ کی مختلف زبانوں میں چند ایک متفرق کتابیں لکھی جا چکی تھیں لیکن پروفیسر ممدوح نے فقہ اسلامی کے ساتھ خاص اعتنا کیا اور اس کے تمام متعلقہ مباحث پر بہت سے مقالے اور رسالے لکھے اور فقہ کے اصول اور ارتقاء پر علمی انداز سے بحث کی اور مزید تحقیقات کے لیے راستہ کھول دیا۔ اس موقع پر ان کے کام کی تفصیل ناممکن ہے۔ لہذا چند ایک اشاروں میں اکتفا کی جاتی ہے، پروفیسر ممدوح ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اسلامی فقہ اور دوسری اقوام کے قوانین میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اکثر قوموں کے قوانین صرف انسانوں کے باہمی تعلقات سے سروکار رکھتے ہیں لیکن اسلامی فقہ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کے تعلق کو بھی اپنے دائرۂ عمل میں شامل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ روزانہ زندگی کے

Christian Snouck Hurgronje (B. 1857; d. 1936)

ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے ہدایات دیتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا دائرہ لامحالہ وسیع تر ہے ،
اس سے پروفیسر موصوف کی مراد فقہ کے ان ابواب سے ہے جو عبادات کے متعلق ہیں ۔ انھوں نے
اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ بہت سے اسلامی ملکوں اور قوموں نے اسلامی شریعت کو اختیار
کر رکھا ہے لیکن متعدد ملک ایسے بھی ہیں ، مثلاً انڈونیشیا ، جہاں عرف و عادت یعنی رواجی قانون
کا ابھی تک زور ہے ۔ اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ صورت حال تسلی بخش نہیں لیکن رواج کو روا
رکھنے کا اسلام کو عملی طور پر یہ فائدہ پہنچا ہے کہ اس کی عام اشاعت کے راستہ میں کوئی مشکل
حائل نہیں ہوئی ،

پروفیسر سنوک ہرخرنیہ پروفیسر سنوک ہرخرنیہ امام غزالی کی روحانیت اور اخلاقی برتری کے بڑے
مداح تھے ، اور ان کو اسلامی اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ اور اعلیٰ معلم تسلیم کرتے تھے ، آپ نے اکثر دوسرے
ولندیزی مستشرقین کی طرح اپنی طالب علمی کے زمانہ میں الٰہیات کے شعبہ میں تعلیم پائی تھی ، اور
عقیدۃً عیسائی تھے لیکن اسلام اور اسلام کے مدت العمر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام آخر کار
ایک لائق احترام مذہب ہے کیونکہ وہ اپنے پیرووں کے سامنے ایک معین نصب العین پیش کرتا ہے
اور انسانی زندگی کا ایک مقصد قرار دیتا ہے ، اور ان کو ایک خاص راستہ پر لگاتا ہے ، اور
اس طرح ان کو پریشان خیالی سے بچاتا ہے ،

سنوک ہرخرنیہ اور دوسرے مستشرقین کا ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ان کو اسلامی ملکوں کا
سفر کرنے اور مسلمانوں کے ساتھ ایک عرصہ تک رہنے سہنے کا اتفاق ہوا تھا ، پروفیسر ممدوح
مسلمانوں کے شعائر دینی کا بہت پاس کرتے تھے ، اور ان کے انداز فکر سے بخوبی واقف تھے ، اسلیے
ان کی مسلمانوں کے ساتھ خوب گزرتی تھی ، اور جو مسلمان ان کے ساتھ میل جول رکھتے تھے ، وہ
ان کے حسن اخلاق کے گرویدہ ہو جاتے تھے ، ان کے متعلق ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ

آپ نے ۱۸۸۵ء میں سات ماہ کا عرصہ مکہ مکرمہ میں گزارا تھا، کیونکہ وہ اسلام کو اس کے اصلی مرکز میں رہ کر سمجھنا چاہتے تھے۔ مکہ میں وارد ہونے سے پہلے آپ نے پانچ ماہ جدہ میں بسر کیے تاکہ عربی معاشرہ کے آداب سے واقفیت حاصل کریں اور حجاز کے لہجے سے بخوبی متعارف ہو سکیں۔ مکہ مکرمہ کی اقامت پر ابھی سات ماہ گزرے تھے کہ جدہ کے فرانسیسی قنصل نے آپ کے بارے میں حکام سے چغلی کھائی اور آپ بصد حسرت و یاس حجاز کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، تاہم آپ نے اس مختصر سی مدت میں اہل مکہ کی زندگی کے ہر پہلو کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور واپسی پر مکہ مکرمہ کے متعلق ایک جامع کتاب لکھی جس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں مکہ کی مکمل تاریخ ہے۔ اور دوسرے حصہ میں اہل مکہ کی زندگی کا ایک مکمل مرقع ہے، ان دنوں مفتی احمد بن زینی دحلان زندہ تھے، اور مکہ کی سوسائٹی میں ایک بلند مقام رکھتے تھے، ان سے سنوک ہرخرنیہ کی اکثر ملاقات رہتی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب میں مفتی صاحب کے متعلق ایک خاص باب باندھا ہے، اور ان کے علم و فضل، علمی مشاغل اور عام عادات و اخلاق کا ایک بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے، اس کے علاوہ وہاں کے مروجہ طریق تعلیم اور دیگر علمی کوائف کے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کے اس دوسرے حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔[1]

حجاز سے واپسی کے بعد آپ انڈونیشیا میں ہالینڈ کی حکومت کے مشیر مقرر ہوئے، اور اس تقریب سے آپ نے وہاں سترہ سال گزارے، اس دوران میں آپ اپنی حکومت اور قوم کو یہی مشورہ دیتے رہے کہ اسے انڈونیشیا میں اپنے سیاسی اور اقتصادی مفاد سے سروکار رکھنا چاہیے، اور مسلمان رعایا کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، اہل اسلام کی اپنی

---

[1] Snouck Hurgronje, Mekka in The latter part of The 19 Cetury (Daily life, Customs and Leaning) Translated by J. H. Mohanan. Brill Leiden, 1931

ایک مکمل شریعت ہے، اس لیے ڈچ حکومت کو ان پر اپنے قوانین ٹھونسنے سے احتراز کرنا چاہیئے''

یہ ایک منصف مزاج مغربی عالم کی معقول رائے ہے جس نے اسلام اور شریعت اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسلام کو ایک واجب الاحترام مذہب قرار دیا تھا اس رائے کے پڑھنے کے بعد ناظرین کرام ان بدقسمت اسلامی ملکوں اور قوموں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے، جو بغیر کسی مجبوری اور بیرونی دباؤ کے ازخود اس قسم کے طوق اپنے گلے میں ڈالتے ہیں اور ان کو اپنے لئے "ترقی کا طرہ" سمجھتے ہیں۔

۱۹۰۶ء میں جب پروفیسر ڈی خویہ (De Goeje) لائڈن یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہوگئے، تو ان کی جگہ سنوک ہرخرنیہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور بیس بائیس سال تک اس مسند پر فائز رہے، آپ اپنے ملک میں اپنے زمانے کے چوٹی کے عالم تسلیم کیے جاتے تھے، چنانچہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں لائڈن میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا اٹھارواں اجلاس منعقد ہوا، تو آپ ہی نے اس کی صدارت کی تھی اور اس موقع پر آپ نے جو پُرفکر خطبہ دیا تھا، اس کا خلاصہ "معارف" بابت ستمبر ۱۹۳۲ء میں دو ڈھائی صفحوں میں قلمبند کرچکا ہوں[1]، اس کے یہاں اعادہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، پروفیسر ممدوح متوسط قد کے انسان تھے، جثہ مختصر سا تھا لیکن چہرہ بڑا باوقار تھا، اور ان کی ٹھوڑی پر جو چھوٹی سی ریشں تھی، ان کے متین چہرہ پر بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی، آپ ۱۹۳۶ء میں اس دنیا سے انتقال کرگئے، اور اپنے پیچھے شوقِ تحقیق علمی شغف اور حسن اخلاق کی ایک قابل تقلید مثال چھوڑ گئے۔

---

[1] میں نے خوش قسمتی سے مستشرقین کی کانگریس کے مذکورہ بالا اجلاس میں شرکت کی تھی، اور اس میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا، اس اجلاس کی مفصل روداد خاکسار کے قلم سے معارف بابت ستمبر ۱۹۳۲ء (ص ۰۰، تا ۱۹۹) میں شائع ہوچکی ہے، شائقین اس کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

پروفیسر ممدوح بالعموم اپنی ملکی زبان یعنی ڈچ میں لکھتے تھے، اگرچہ ان کے بعض مضامین فرانسیسی اور انگریزی میں بھی ہیں۔ ان کے تمام متفرق مقالے، رسالے اور مضامین جمع کرکے انکی زندگی ہی میں چھ جلدوں میں طبع کر دیے گئے تھے۔ ان کی ایک آدھ کتاب انگریزی میں بھی ہے، مثلاً انھوں نے جو لکچر امریکہ میں اسلام پر دیے تھے، وہ انگریزی میں "محمڈن ازم" کے نام سے ۱۹۱۶ء[۲] میں شائع ہو گئے تھے۔ ان خطبوں میں انھوں نے بدو اسلام اور اسلام کے مذہبی اور تاریخی ارتقاء اور عالم اسلام کی موجودہ حالت سے بحث کی تھی۔ ان کے جو اہم مقالات فقہ پر فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں، ان کو پروفیسر شاخت (متوفی ۱۹۶۹ء) اور پروفیسر بوسکے نے ایک الگ مجموعہ کی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ پروفیسر ممدوح کی چند کتابوں کے نام حاشیہ میں مندرج ہیں۔[۱]

اسلامک اسٹڈیز کا چوتھا رکن

نولڈکہ، گولڈ سیہر اور سنوک ہرخرنیہ کے ساتھ ساتھ یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کے چوتھے رکن مشہور جرمن مستشرق یولیس ولہاوزن (Julius Wellhausen) (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۸ء) ہیں، جو اپنے علم و فضل اور غیر معمولی تبحر اور خصوصاً اپنی گہری بصیرت اور تنقیدی مہارت کے اعتبار سے انیسویں صدی کے ایک عبقری سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے تورات کے تنقیدی مطالعہ میں نام پیدا کیا، جس کو علماء کی اصطلاح

۱ے Snouck Hurgronje, C

1. Verspreide Geschriften. 6 vols. Brill, Leiden, 1923-1927
2. Mohammadanism. Lectures on its Origins, its religious and political Growth and its Present State, New York & London
3. Selected Works of C.S. Hurgronje, edited in English and French by G.H. Bousquet and J. Schacht. Leiden, 1957

میں (Higher Criticism) یعنی بائبل کی "تنقید عالیہ" کہتے ہیں، پروفیسر ولہازن تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہودیوں نے اپنی قومی تاریخ پیش کرنے میں بڑی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے، اور اپنے اکابر اور مشاہیر کے کارناموں کو خصوصاً فتح کنعان کے سلسلہ میں، بڑے مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اگر ان کو تاریخ اور تنقید کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کی حقیقت قومی افسانوں سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی۔ اور یروشلیم (بیت المقدس) کی حکومت ایک معمولی سی ریاست تھی جس کو ایک عظیم الشان سلطنت ظاہر کیا گیا ہے۔ عہدنامۂ قدیم گویا یہودیوں کا "شاہ نامہ" ہے جس کی حقیقت تاریخی افسانوں سے زیادہ نہیں۔

علماء کی ایک جماعت نے پروفیسر ولہازن کے نتائج تحقیق کو قبول کر لیا، لیکن دیگر علماء نے ان سے شدید اختلاف کیا، خصوصاً یہودی علماء، پروفیسر ممدوح کی تنقید سے سخت خوف کھاتے تھے، کیونکہ اس سے ان کے دین کی بنیادیں ہی متزلزل ہو گئی تھیں۔ بہرحال اس سلسلہ میں جو مباحثہ اور مجادلہ کئی سال تک جاری رہا، اس سے بیزار ہو کر پروفیسر ولہازن نے ۱۸۸۲ء میں تھیالوجی یعنی الٰہیات کی کرسی دراست چھوڑ دی، اور اس کی بجائے سامی زبانوں کا درس دینے لگے۔ اور رفتہ رفتہ اپنی توجہ بیشتر اسلام اور تاریخ اسلام پر مبذول کر دی۔

پروفیسر ولہازن نے اسلامیات کے سلسلہ میں سب سے پہلے واقدی کی کتاب المغازی کا جرمن زبان میں ایک ملخص ترجمہ شائع کیا۔[۱] اس کے دیباچہ میں پروفیسر موصوف نے چند ایک پُرمغز جملوں میں اسلام کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہونے کی توجیہ فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ

---

[۱] J. Wellhausen. Muhammed in Medina

Das ist vakidi's Kitab at Maghazi in verkurzter deutscher Wiedergabe, Berlin-1882

میں نے اپنی تحقیقات کا رخ عہد نامۂ قدیم (یعنی تورات) سے عربوں کی طرف اس مقصد سے پھیرا ہے کہ میں اس شجر صحرائی (یعنی عرب قوم) کی حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہوں جس پر بنی اسرائیل کے انبیاء اور علماء نے اپنی شاخ یعنی تورات کا پیوند لگایا تھا. کیونکہ مجھے اس بات میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے کہ عبرانی لوگ جس بضاعت اور استعداد کے ساتھ تاریخ کے منظر پر نمودار ہوئے تھے. اس بضاعت (یعنی مجموعۂ خصال) کا صحیح تصور اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے، جب عبرانیوں کا مقابلہ عرب العاربہ سے کیا جائے، اس مرحلہ میں یقیناً اس خالص عروبہ کا سوال پیش آتا ہے جیسی کہ وہ اسلام سے پہلے تھی لیکن اس عروبہ کا سمجھنا آسان نہیں ہے،

غرضکہ پروفیسر ولہازن نے اسلامیات کے شعبہ میں اعلیٰ پایہ کا جو تحقیقی اور تصنیفی کام کیا ہے وہ بیشتر تاریخی نوعیت کا ہے، اس سے علماء آج تک استفادہ کر رہے ہیں، اور وہ دوسروں کی ترغیب وتشویق کا باعث ہوا ہے. مثلاً پروفیسر بکیر نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ میرے دل میں تاریخ اسلام کے مطالعہ کا شوق پروفیسر ولہازن کی محققانہ تصنیفات ہی کے دیکھنے سے پیدا ہوا تھا.

اسلامیات کے ائمہ اربعہ　الغرض نولڈکہ، گولڈ سیہر، سنوک ہرخرنیہ اور ولہازن، یہ ائمۂ اربعہ ہیں، جن کی علمی مساعی سے انیسویں صدی کے نصف ثانی میں یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد پڑی، یہ چاروں فضلاء ایک دوسرے کے ہمعصر تھے، اور آپس میں مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے، اور ایک دوسرے کے قدرشناس تھے، یہی وہ ارکان یا اساطین علم ہیں، جن کی تحقیقات اور تصانیف پر اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کھڑی ہوئی اور اس نے یورپ کے علمی حلقوں میں ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کی، صفحات بالا میں ان کے بارے میں جو مختصر نوٹ لکھے گئے ہیں، ان سے مقصود ان کا سرسری تعارف ہے، ورنہ ان کے علمی کارناموں کے تفصیلی جائزہ

کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔

میں نے جن چار ارکان کا ذکر کیا ہے، ان کی حیثیت اسلامک اسٹڈیز کے اماموں اور بانیوں کی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامیات کا مطالعہ گذشتہ صدی میں صرف ان چار علماء تک محدود تھا، بلکہ مغرب کے دیگر علماء نے بھی ان مباحث میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، اور ان کی تعداد یوماً فیوماً آج تک بڑھتی چلی آرہی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس مختصر سے جائزہ میں ان سب کا تذکرہ کرنا ناممکن ہے۔

الفرڈ فان کریمر مذکورہ بالا ارکان کے ہمعصر علماء اسلامیات میں سے البتہ الفرڈ فان کریمر[1] کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس نے یورپ میں سب سے پہلے مسلمانوں کی تمدنی اور ثقافتی تاریخ (Cultural history) لکھی تھی، فان کریمر آسٹرین قوم سے تھے، اور ان کی تمام تصانیف اور تمام مقالات جرمن زبان میں ہیں، وہ سات سال تک اسکندریہ میں قنصل کے عہدہ پر مقرر رہے، اور کچھ عرصہ شام میں بھی مقیم رہے، انھوں نے نہ صرف اپنے مطالعہ سے مسلمانوں کی قدیم تاریخ اور ان کے تمدن کے متعلق وسیع معلومات فراہم کر لی تھیں، بلکہ اسلامی معاشرہ کے براہ راست مشاہدہ سے بھی مسلمانوں کے طرز خیال اور ان کے مسائل کی بڑی گہری بصیرت حاصل کر لی تھی، ان کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں[2] جن کے نام حاشیہ میں دیے گئے ہیں، پہلی کتاب اسلام کے چند بنیادی تصورات کے بارے میں ہے، جس میں فاضل مصنف نے ہستی باری تعالیٰ اور عقیدۂ رسالت کے علاوہ مسلمانوں کے سیاسی نظریات سے بحث کی ہے، اور یہ کتاب ابتک علماء کے طبقہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

---

[1] Alfred von Kremer (b. 1828; d. 1889)

[2]
1. Geschichte der herrschenden Ideen des Islam (1868)
2. Culturgeschichte des Orients unter den Chalifen. 2 vols. Wien, 1875-77

فان کریمر نے اپنی دوسری کتاب میں جس کے دو حصے ہیں، عہد خلافت کی تمدنی اور ثقافتی تاریخ قلمبند کی ہے، اور تقریباً بیس عنوان قائم کرکے اسلامی نظام مملکت، دربار خلافت عسکری نظام اسلامی قانون، شہری معاشرت، تجارت، صنعت وحرفت، علوم وفنون اور عربی ادب اور شعروشاعری کے متعلق بڑی قیمتی معلومات فراہم کردی ہیں، اور ان کو بیشتر اعلیٰ قدیم مصادر سے اخذ کیا ہے، اور بعض معاملات کی اپنی رائے سے مزید وضاحت کی ہے، جرجی زیدان کی تاریخ "التمدن الاسلامی" کی تبویب وترتیب کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فان کریمر کی کتاب اس کے پیش نظر رہی ہے اور اس نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے، جس طرح تاریخ "آداب اللغۃ العربیۃ" کی تالیف میں . ن آفندی نے پروفیسر بروکلمن کی معروف "تاریخ الادب العربی" (جرمن) کو بطور نمونہ اختیار کیا ہے، جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہوگا صلاح الدین خدابخش مرحوم (۱۸۰۰ء تا ۱۹۳۱ء) نے فان کریمر کی پہلی جلد کا انگریزی میں ترجمہ کردیا تھا، جو کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوچکا ہے، فان کریمر کا کام علمی لحاظ سے ایسے اعلیٰ پایہ کا ہے کہ نولدکہ اور گولڈسہر جیسے مبصرین نے بھی اس کی تحسین کی ہے۔

اسلامک اسٹڈیز کی ابتدا کی جو مختصر تاریخ میں نے صفحات گذشتہ میں بیان کی ہے، اس میں میری ذاتی تعبیر کو بہت کم دخل ہے، کیونکہ یہ وہ باتیں ہیں جو مغربی علمی دنیا میں مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ہمارے ملک میں بھی جو باخبر اور وسیع النظر عالم ہیں، وہ ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں، میں نے یہ مختصر بیان ان احباب کے پاس خاطر سے قلمبند کیا ہے، جن کو اسلامیات کے ساتھ کسی لحاظ سے دلچسپی ہے، لیکن یہ امور ابھی تک ان کے علم میں نہیں آئے۔

اسلامک اسٹڈیز کی اصطلاح جب یورپ کے علمی حلقوں میں اسلام اور اسلامی مسائل کے مطالعہ نے

ایک مستقل شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کرلی، تو جرمنی میں اس کے لیے Islamwissenschaft کی اصطلاح مروج ہوئی، چنانچہ جب پروفیسر بابنگر (Babinger) کا برلن یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو وہ Professor fur Islamwissenschaft کہلائے۔ اسلامیات کو جرمنی میں Islam kunde بھی کہتے ہیں، چنانچہ کچھ مدت ہوئی برلن میں اسلامی مسائل اور عالم اسلام کے حالات کے مطالعہ کے لیے جو انجمن قائم ہوئی تھی، وہ — Gesellschaft fur Islam kunde) کے نام سے موسوم ہوئی تھی، ان کے علاوہ اسلامیات کے لیے جرمنی میں ایک تیسری اصطلاح Islam studien بھی مستعمل ہے، چنانچہ پروفیسر بکر نے اپنے مضامین اور مقالات کے مطبوعہ مجموعہ کا نام Islamstudien رکھا تھا۔

فرانس میں اسلامیات کو Etudes Islamiques کہتے ہیں اور یہ اصطلاح وہاں ایسی مروج اور مقبول ہو چکی ہے کہ ۱۹۲۶ء میں وہاں کے مشہور اسلامی رسالہ Revue du monde musulmane کا نام بدل کر Revue des Etudes Islamiques رکھ دیا گیا تھا،

انگلستان میں اسلامیات کو Islamic studies کہتے ہیں، اور وہاں اس شعبہ علوم کی ایک مستقل حیثیت مدت سے تسلیم کی جا چکی ہے، چند سال ہوئے لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں اسلامک اسٹڈیز کے لیے ایک خاص پروفیسر شپ قائم ہوئی تھی، اور اس پر ڈاکٹر چارلس بکنگھم کا تقرر ہوا تھا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کی اصطلاح سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں استعمال ہوئی تھی، اور اسلامیات کے متعلق کمیشن کی تجاویز ایک خاص باب میں قلمبند ہوئی تھیں،

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) اگست ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

اسلامیات کا موضوع 1 اسلامیات یا اسلامک اسٹڈیز کا اصلی اور بنیادی موضوع بحث دینِ اسلام

جولائی ۱۹۷۰ء تا دسمبر ۱۹۷۰ء

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

ل —sungen über den Islam. Heidelberg, 1910

اسلامیات کا موضوع اسلامیات یا اسلامک اسٹڈیز کا اصلی اور بنیادی موضوع بحث دینِ اسلام اور اس کی تعلیم ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام کے مطالعہ میں "اسلام کے مذہبی ارتقاء" کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جس کے بغیر اسلام کا مطالعہ کسی صورت میں مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام کے مذہبی ارتقاء سے ہماری مراد ملت اسلام کی مذہبی تاریخ ہے، جس کے اشارے ہیں (۱) مذاہب فقہ کا نشو و نما، (۲) مختلف اسلامی فرقوں کی تشکیل اور ان کے مخصوص عقائد (۳) صوفیہ کے طریقوں اور سلسلوں کا ظہور اور (۴) قدیم اور جدید مذہبی تحریکوں کی تفصیل زیر بحث آتی ہے۔

مذکورہ بالا مباحث کے علاوہ اسلامیات میں ان چیزوں کا مطالعہ بھی داخل ہے جو اسلام کی تعلیم اور اس کے اثر سے معرض وجود میں آئیں یعنی (۱) علوم دینیہ اسلامیہ (۲) ملت اسلام یعنی عالم اسلام (۳) ملت اسلام کی سرگذشت اور اس کا تمدن، یعنی اسلام کی سیاسی اور تمدنی تاریخ۔

بہرصورت اسلامک اسٹڈیز کا چرخ دین اسلام کے محور کے گرد گھومتا ہے، وہی اس کا مرکز ہے اور وہی اس کی علت غائی (Raison d'être) ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو اسلامک اسٹڈیز کا جواز پیش کرتی ہے، اور اس کو عام اورینٹل اسٹڈیز (Oriental Studies) سے الگ کرتی ہے۔

ارتقاء اسلام کی بحث دین اسلام اور ارتقاء اسلام کے مسائل و مباحث کے معین کرنے اور اسلامیات کے حدود قائم کرنے میں پروفیسر گولڈ سیہر کو بہت کچھ دخل رہا ہے، آپ نے امریکہ میں ۱۹۰۸ء میں اسلام کے موضوع پر چھ لکچرز (خطبے) دیے تھے، جو بعد ازاں ۱۹۱۰ء میں اپنی اصل جرمن زبان میں شائع ہو گئے تھے[1]، اس موقع پر فاضل ممدوح نے اپنے خطبوں کے لیے جو عنوانات قائم

---

[1] Vorlesungen über den Islam. Heidelberg, 1910

کیے تھے۔ اور جن مسائل سے بحث کی تھی وہ اتنے مناسب اور موزوں اور ایسے جامع و مانع تھے کہ نہ صرف آپ کے لیکچرز کا بعد از اں انگریزی اور فرانسیسی میں ترجمہ ہوا، بلکہ بعد کے اکثر مغربی محققین اور مصنفین نے اسلام اور اس کے مذہبی ارتقاء سے بحث کرتے ہوئے ان ہی عنوانوں کو اختیار کیا ہے اور ان ہی مسائل پر گفتگو کی ہے، جن کو پروفیسر گولٹ سیہر زیر بحث لا چکے تھے، اور یہی وہ مسائل ہیں جو بالآخر اسلامیات کا موضوع بحث قرار پائے۔

پروفیسر گولٹ سیہر کے پہلے خطبہ میں رسول کریمؐ کی زندگی اور بدء اسلام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور پھر قرآن مجید کے متعلقہ مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے خطبہ میں اسلامی فقہ کی تاریخ ہے، تیسرے خطبہ میں عقائد اسلام کا بیان ہے، اور اس سلسلہ میں معتزلہ اور اشاعرہ وغیرہم کے خصوصی عقائد کا ذکر آیا ہے۔ چوتھے خطبہ میں اختلاف عقائد کی بنا پر اور خصوصاً خلافت کے مسئلہ پر اسلام میں جو فرقے پیدا ہوئے مثلاً خوارج، شیعہ وغیرہ ان کے حالات اور عقائد کا بیان ہے، چھٹے خطبہ میں عالم اسلام کی موجودہ مذہبی تحریکوں کی تفصیل ہے، مضامین اور مباحث کی یہی وہ تقسیم و ترتیب ہے، جس سے بعد کے محققوں اور مصنفوں نے قدرے کمی بیشی کے ساتھ تقلید کی ہے، پروفیسر گولٹ سیہر کے خطبوں کے چند سال بعد پروفیسر سنوک ہرخرنیہ نے بھی امریکہ والوں کی دعوت پر ان کے ہاں اسلام پر چند لیکچرز دیے تھے، جن کا ذکر پروفیسر موصوف کے حالات میں پیشتر آ چکا ہے، اس موقع پر انھوں نے جو مضامین بحث کے لیے انتخاب کیے، یہ وہی مسائل تھے، جن پر ان سے پہلے گولٹ سیہر گفتگو کر چکے تھے، اسی طرح پروفیسر ٹامس آرنلڈ نے اپنی کتاب The Faith of Islam میں اور پروفیسر ہملٹن گب نے اپنی کتاب محمڈن ازم میں بیشتر ان ہی عنوانوں کو اختیار کیا ہے، اور تقریباً اسی ترتیب سے ان پر اپنے اپنے انداز میں گفتگو کی ہے، البتہ پروفیسر گب نے قرآن مجید، حدیث نبوی اور فقہ اسلامی پر مستقل ابواب باندھے ہیں، اور وسعت اسلام کی وضاحت کے لیے

عالم اسلام پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔

اگر اسلام اور اس کے مذہبی ارتقاء کے مطالعہ میں مندرجہ بالا عنوانوں کو پیش نظر رکھا جائے تو اس موضوع کے متعلق کسی اہم مسئلہ یا بحث کے نظر انداز ہونے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

تاریخ اسلام تاریخ اسلام کا مطالعہ بھی اسلامک اسٹڈیز میں شامل ہے۔ بلکہ اس کا ایک جزو لاینفک ہے۔ تاریخ اسلام کیا ہے؟ یہ امت مسلمہ یا ملت اسلام کی سرگذشت ہے، اور امت مسلمہ وہ سوسائٹی ہے جو مذہبی اور قطعی طور پر اسلامی تعلیم ہی کے اثر سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اور اسلامی اصول و عقائد کی عملی تفسیر و تعبیر پیش کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر تاریخ اسلام اسلام کے عملی کردار کی آئینہ دار ہے۔

Islamic History is Islamic Ideology in action

لہٰذا اسلام کے اثرات اور اسکے ثمرات کو سمجھنے کے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ از بس ضروری ہے، تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ (یعنی پولیٹیکل ہسٹری) اور انکی تمدنی اور ثقافتی تاریخ (کلچرل ہسٹری) دونوں شامل ہیں۔

ملت اسلام یعنی اہل اسلام "شجر اسلام" کا برگ و بار یعنی ثمرہ ہیں، اور "اصول دین" کے ساتھ شجر اسلام کے "برگ و بار" کا مطالعہ بھی لازم ہے، مثلاً جب کوئی سائنسدان کسی درخت کی تحقیق کرتا ہے تو وہ اپنی بحث کو درخت کی جڑوں اور اس کے تنے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس کی شاخوں اور اس کے برگ و بار کو بھی بحث میں لاتا ہے، کیونکہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہی برگ و بار اس درخت کا ماحصل اور لُب لباب ہیں، لہٰذا ہم اسلام کی بحث میں ملت اسلام اور اس کی سرگذشت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ ملت اسلام ہی کی تعلیم کے اثر سے پیدا ہوئی ہے، اور اسلام کے اثرات اور اس کی برکات کا اندازہ لگانے کے لیے مقیاس کا کام دیتی ہے، لہٰذا ملت اسلام اور اس کی سرگذشت بھی اسلامک اسٹڈیز کا ایک لازمی حصہ ہے،

اسلامیات کی مجوزہ اسکیم اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ اسلامیات میں دین اسلام کے علاوہ

ان چیزوں کا مطالعہ بھی داخل ہے، جو اسلام کی تعلیم اور اس کے اثر سے وجود میں آئیں، تو پھر میری ناقص رائے میں اسلامیات کی سکیم آف اسٹڈیز (Scheme of Studies) اور اس کا ریسرچ پروگرام حسب ذیل صورت اختیار کرے گا۔

۱۔ دین اسلام یعنی تعلیم اسلام:-

(الف) اجزائے ایمان (The Creed of Islam)

(ب) ارکان اسلام (Practical Religious Duties)

(ج) اخلاق اسلامی (Ethics of Islam)

(۲) علوم دینیہ اسلامیہ

(الف) قرآن مجید کے متعلق جملہ مباحث، تفسیر القرآن اور طبقات المفسرین

(ب) علم حدیث اور اس کے متعلقات مثلاً اسماء الرجال، تاریخ علم حدیث،

(ج) علم فقہ، اصول فقہ اور تاریخ فقہ، مذاہب فقہ اور ان کے اصول و خصائص۔

۳۔ ملت اسلام کا مذہبی ارتقاء:-

(الف) مذاہب فقہ کا نشو و نما اور ان کا شیوع

(ب) مختلف اسلامی فرقوں کا ظہور اور ان کے خاص عقائد

(خوارج، شیعہ، اہل السنت، معتزلہ وغیرہم اور ان کی شاخیں)

(ج) صوفیہ کے طریقے اور سلسلے، ان کی خصوصیات اور ان کے بانی)

(اس میں تصوف کی پوری بحث شامل ہے)

(د) مذہبی تحریکیں، قدیم اور جدید)

۴۔ ملت اسلام

(الف) ملت اسلام کے عناصر ترکیبی ۔ مسلمان اقوام یعنی عربوں، ایرانیوں، ترکوں، تاتاریوں، افغانوں، ہندوستانیوں، بربروں، سوڈانیوں، زنگیوں، صومالیوں، سواحلیوں کی نسلی اور قومی خصوصیات، تاریخ اسلام میں ان کا کردار اور اسلامی تہذیب وتمدن کی تعمیر میں ان کا حصہ۔

(ب) عالم اسلام (The world of Islam)

عہد حاضر کے اسلامی ملکوں کا مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، علمی اور تعلیمی جائزہ اور ان کے موجودہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی رجحانات۔

۵۔ ملت اسلام کی سرگذشت یعنی تاریخ اسلام :۔

(الف) مسلمان قوموں اور ملکوں کی سیاسی تاریخ

(ب) مسلمانوں کی تمدنی اور ثقافتی تاریخ

(فلسفہ وحکمت اور دیگر جملہ علوم وفنون، نظام تعلیم اور مدارس، زراعت، تجارت صنائع وحرف وغیرہ)

۶۔ تاریخ اشاعت اسلام

(الف) تاریخ اشاعت اسلام کا مطالعہ، اسکی اہمیت اور اسکے فوائد، نتائج واسباق

(ب) عہد حاضر کی تبلیغی مساعی اور تبلیغی مرکز، تبلیغ اسلام کے آداب وآئین۔

۷۔ اسلامی زبانیں اور ان کے آداب :۔

(الف) مسلمان اقوام کی مستعملہ اور مروجہ زبانوں یعنی عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، اردو، بنگالی، جاوی، ملائی اور سواحلی وغیرہ زبانوں کا مطالعہ اس جہت سے کہ ان کے ذخیرہ الفاظ اور اسالیب بیان پر اسلامی اثرات اور تصورات کیسے اور کہاں تک اثر انداز ہوئے ہیں۔

عربی زبان کا لسانی اور ثقافتی اثر دیگر اسلامی زبانوں پر

(ب) مذکورہ بالا زبانوں کے متعلقہ آداب کا مطالعہ اس لحاظ سے کہ ان کے ارتقاء اور فروغ میں اسلامی اثرات کیسے اور کہاں تک کار فرما ہوئے ہیں؟ اور ان متعدد آداب میں اسلامی عناصر یعنی اسلامی دینی علوم کی کمیت اور کیفیت کی تفصیل کیا ہے۔

اسلامی اثرات کی وجہ سے ان متعدد آداب میں جو لسانی، ادبی، تہذیبی اور روحانی قدر مشترک پیدا ہو چکا ہے، اس کی نشاندہی اور اس کی تفصیل و تشریح۔

"دین" اور "اسلامیات" | میں نے روداد میں پڑھا کہ ایک موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ "اسلامیات کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا"۔ مجھے حیرت ہے اور کمال حیرت ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں میں اسلامیات کے دین سے جدا ہونے یا نہ ہونے کا سوال کیسے پیدا ہوا، اگر 'دین' سے مراد ایمان و ایقان یعنی اسلام کی حقانیت کا اعتقاد اور اس کی تصدیق ہے تو پھر معاملہ کی صورت بالکل دگرگوں ہوگی، لیکن اگر دین سے مراد "اسلام بحیثیت ایک موضوع بحث" کے ہے تو اس کے اسلامیات سے جدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسلام ہی تو اسلامیات کا اصلی اور حقیقی موضوع ہے، اور اس کی علت غائی ہے۔

اگر دین سے مراد اسلام ہے تو پھر قضیہ کی صورت یہ ہوگی کہ "کیا اسلامیات کو اسلام سے جدا کیا جا سکتا ہے" اور اس قضیہ کا مہمل اور لایعنی ہونا بین ہے، اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلامیات سے دین (اسلام) جدا ہو سکتا ہے، تو اس صورت میں اسلامیات کی مثال اس جسد کی ہوگی جس سے روح سلب ہو چکی ہے۔ یا اگر ایک عامیانہ مثال دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "اسلامیات بلا دین" اس برات کی مانند ہے جس میں براتی تو زرق برق لباس

پہنے تیار کھڑے ہیں، لیکن خود دولہا غائب ہے، اے ناظرین باتمکین! یہ سارا قصہ دین اسلام ہی کا تو ہے، ورنہ اسلامیات کے کیا معنے ہیں!!

اسلامیات کا مقصد | مغربی علماء کی زبان سے میں نے اسلامک اسٹڈیز کا مقصد یہی سنا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اسلام اور اس کے تمام متعلقہ مسائل کا "فہم" (Understanding) حاصل کرنا ہے، اگر غیر مسلم اسلام کا "فہم" حاصل کرنا چاہیں تو ہم ان کی خواہش کا خیر مقدم کرتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں ہماری یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اس "فہم" سے شاید اقوام عالم کے درمیان باہمی "مفاہمت" کی کوئی صورت نکل آئے، اور اس مفاہمت سے دنیا میں امن قائم کرنے میں مدد ملے، کیونکہ امن عالم فی زماننا نوع انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے،

اس کے بعد یہ سوال ہنوز باقی رہ جاتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کے لیے اس "فہم" کے حاصل کرنے کا آخر کار کیا مقصد اور کیا فائدہ ہے؟

نوع انسان مختلف قوموں اور ملتوں میں منقسم ہے اور ان قوموں کی مختلف جماعتیں اور مختلف طبقات ہیں، ہر جماعت اور ہر طبقہ کا اپنا اپنا جدا مذاق و مسلک ہے، اور اپنے اپنے اغراض و مقاصد ہیں، اس لیے ہم نے جو سوال اٹھایا ہے۔ اس کا جواب بھی لامحالہ مختلف جماعتوں اور طبقوں کی طرف سے مختلف نوعیت کا ہوگا۔

ایک مسلمان اس سوال کا جواب غالباً یہ دے گا کہ چونکہ اسلام اس کا دین و مذہب ہے اس لیے اس کے لیے اپنے مذہب کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرنا اس کے ایمان کی تقویت کا موجب ہے، اسکے لیے اس فہم کی اہمیت کا ایک پہلو اور بھی ہے، اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور اپنے حلقہ بگوشوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ جو روشنی ان کو آفتاب اسلام سے حاصل ہوئی ہے، اس روشنی کے بارے میں وہ (یہودیوں اور برہمنوں کی طرح) بخل نہ کریں۔ بلکہ نوع انسان کے سچے اور مخلص بہی خواہوں کی طرح اس روشنی کو پھیلائیں اور اسکی برکات میں

دوسرے انسانوں کو بھی شریک کریں، لیکن دوسروں کو اپنے اصول اور نصب العین سمجھانے سے پہلے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اصولوں کو پہلے خود بھی اچھی طرح سے سمجھے اور ان کے دلائل و براہین سے واقف ہو،

آجکل مختلف ادیان و مذاہب کے مطالعہ نے ایک خاص علم کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے، جس میں تاریخ الادیان کے علاوہ مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی شامل ہے، جو علماء اس شعبہ میں مصروف تحقیق ہیں، ان کو اسلام میں اس وجہ سے دلچسپی ہے کہ اسلام کا شمار دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں ہوتا ہے، اور ایک اندازہ کے مطابق پیروان اسلام دنیا کی کل آبادی کا ایک خمس ہیں، یہ علماء دیگر مذاہب کی طرح اسلام کا بھی مطالعہ کرتے ہیں، اور اس کی تعلیم کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور اس کے ارتقائی منازل کو معلوم کرنا چاہتے ہیں، اور اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اسلام کو دیگر مذاہب کے ساتھ کیا تعلق اور کیا مناسبت ہے، اس کو دیگر مذاہب کے ساتھ کن باتوں میں مماثلت ہے، اور کن باتوں میں مغایرت ہے، اسلام کی اپنی ذاتی خصوصیات کیا ہیں، اور اس کی عالمگیر اشاعت کے کیا اسباب ہیں وَھلُمَّ جَرّا ۔

ایک مؤرخ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے پر اس لیے مجبور ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ تاریخ عالم کا ایک لازمی حصہ ہے، جب تک ان کی تاریخ کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور اس کو محسوب نہ کیا جائے، تاریخ عالم کا تصور اور اس کا بیان نامکمل رہتا ہے، قرون وسطیٰ میں مسلمان دنیا کی مہذب اقوام کے سرخیل تھے، اس لیے ایک مؤرخ کے لیے ان کی ازمنہ متوسطہ کی تاریخ خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ وہ زمانہ ہے جس میں مسلمانوں نے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز ترقی کی تھی، اور یورپ والے ان کی خوشہ چینی پر مجبور تھے، الغرض اہل اسلام کو تاریخ عالم میں ایک خاص درجہ اور ایک خاص مقام حاصل ہے،

جس کو کوئی دیانتدار مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

یورپ کا ایک مدبّر (States man) اسلام اور عالم اسلام کا مطالعہ اس غرض سے کرتا ہے تاکہ وہ مسلمان اقوام کے مذہبی محرکات اور مسلمان ملکوں کے مذہبی حالات اور ان کے سیاسی رجحانات کو بخوبی سمجھ سکے، تاکہ اس علم اور فہم کی روشنی میں وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی خارجی پالیسی کو متعین کرسکے،

ایک عیسائی مشنری اسلام کا مطالعہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کا رد کرے اور اسلام کی تعلیم پر جرح و قدح کرکے مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف اور برگشتہ کرنے کی کوشش کرے وہ خوب جانتا ہے کہ عیسوی دین کا سب سے بڑا اور قدیمی حریف اسلام ہے، اس کا مقابلہ کرنے بلکہ اس کو مغلوب کرنے کے لیے اپنے حریف کو سمجھنا اور اس کی قوت کا صحیح اندازہ لگانا اس کے مقاصد کی کامیابی کے لیے ازبس ضروری ہے۔

الغرض مختلف ملتوں اور مختلف طبقوں کے ہاں اسلام کی فہم و تفہیم کے مختلف اغراض و مقاصد ہوسکتے ہیں۔

اسلام اور عربی تمدن

بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ

از جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عربی جنتری کے حساب سے سنہ ۱۳۹۰ھ وہ سال ہے جس کی کسی تاریخ کو بانیٔ درس نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی کی ولادت کے تین سو سال پورے ہو جاتے ہیں، اور تازہ محاورے میں موجودہ ہجری سال کو ان کا "۳۰۰ واں یا سہ صد سالہ جشن پیدائش" کہا جا سکتا ہے، تمام تذکرہ نویسوں کے اتفاق کے مطابق ملا نظام الدین محمد اس وقت چودہ سال کے تھے، جب ان کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی کا حادثۂ شہادت سنہ ۱۱۰۳ھ میں قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی میں پیش آیا تھا، اس واقعۂ شہادت کے سال میں سے ملا نظام الدین محمد کی عمر کے چودہ (۱۴) سال گھٹانے سے قریب قریب سنہ ۱۰۸۹ھ برآمد ہوتا ہے،

جب یہ لٹا ہوا کنبہ جس کا مورث اور سرپرست، اشقیاء کی اچانک یلغار میں اپنے گھر کے اندر گھر والوں کی نگاہوں کے سامنے شہید ہو چکا تھا، دار البوار سے مسکن عافیت کی طرف جانے لگا تو اس میں ایک چودہ (۱۴) سالہ یتیم بھی تھا، جو اپنے بڑے بھائی۔ ماں اور چھوٹے بھائی بھتیجوں کیساتھ ایسی سمت جا رہا تھا جس کی منزل خواہ طے پا چکی ہو لیکن اس ہجرت اور ترک وطن کا انجام سخت دھندلکے میں تھا،

اس یتیم کی اس آوارۂ وطن قافلے میں اس سے زیادہ کیا اہمیت ہو سکتی ہوگی کہ ایک مظلوم خاندان کا ایک بچہ جس کا مستقبل بظاہر حالات غیر واضح اور غیر یقینی ہے، یہ لٹا ہوا کنبہ ملا قطب الدین شہید سہالوی کا تھا،

ملا قطب الدین شہید سہالوی | ملا قطب الدین کی شہادت ۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ (مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۹۲ء) کو قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی میں اس وقت ہوئی جب وہ طلوع آفتاب کے بعد اپنی محلسرا کے دیوان خانہ میں جو مدرسہ کہلاتا تھا، درس وتدریس کے لیے بیٹھے تھے، اور طلبا کی محدود تعداد اس وقت تک حاضر ہو پائی تھی،

بر عادت قدیمہ از نماز فجر و وظائف فراغ
اندوختہ در مدرسہ آمدہ بدرس جمعے از فضلاء حاضر
بالخدمت مشغول شدند چوں دو گھڑی روز برآمد
اسد اللہ و باقر و پیر محمد ساکنہ رودھنہ علاقہ پرگنہ سہالی
و نور و غلام محی الدین و بساون و سہاون
ساکنان قصبۂ سہالی و نقیر اللہ متوطن قصبۂ دیوہ
و انور ساکن امتی معمولہ پرگنہ بجنور وغیرہ زمینداراں
گرد و پیش خانۂ مولوی را محاصرہ نمودند و از
چہار طرف دیوار نقبہا زدہ اندرون در آمدند و
مولوی را یک زخم تیر و یک زخم تفنگ و ہفت
ضرب شمشیر رسانیدہ شہید ساختند
و شیخ غلام محمد نبیرۂ زبدۃ الاولیا بندگی شیخ
نظام الدین ساکن امیٹھی و دیگر شیخ عزت اللہ
ساکن سندیلہ کہ بخواندن فاتحۃ الفراغ در خدمت
بودند نیز از دست ظلمۂ مذکورین شہید شدند

روزانہ کے معمول کے مطابق ملا قطب الدین فجر کی
نماز اور وظائف سے فارغ ہوکر اپنے درسے میں آئے،
اور حاضر بخدمت فاضلین کو درس دینے میں
مشغول ہوگئے، جب دو گھڑی دن گزر چکا تھا
کہ اسد اللہ، باقر، پیر محمد (تینوں قصبۂ سہالی کے دیہات
رودھنہ کے رہنے والے) نور، غلام محی الدین، بساون
سہاون (سہالی کے باشندے) نقیر اللہ (دیوا کے رہنے والے)
اور انور (پرگنہ بجنور کے دیہات امتی کا باشندہ) وغیرہ
جو آس پاس کے زمیندار ہیں، آئے اور ملا صاحب کے مکان
کا محاصرہ کرلیا، چاروں طرف سے دیواروں میں
نقب لگاکر گھر کے اندر گھس آئے، ملا صاحب کو تیر کا ایک زخم
گولی کا ایک زخم اور چہرے پر تلوار کے سات زخم پہنچائے
اور ان کو شہید کردیا، زبدۃ الاولیا وبندگی شیخ
نظام الدین ساکن امیٹھی کی اولاد میں شیخ غلام محمد
اور سندیلہ کے رہنے والے شیخ عزت اللہ بھی جو فاتحۃ الفراغ

محمد آصف چودھری پرگنہ سہالی کہ برائے مدد مولوی
رسیدہ با ہمراہیان خود شہید شدند، بندہ محمد سعید
وجمیع از طلبا و شیخ فضل اللہ برادر نائب قاضی
عبد اللہ قاضی پرگنہ سہالی وغیرہ زخمی شدند

پڑھنے کے لیے حاضر خدمت تھے، مذکورہ ظالموں
کے ہاتھوں شہید ہوئے، پرگنہ سہالی کے چودھری،
محمد آصف جو ملا صاحب کی مدد کے لیے ایک جماعت
کے ساتھ آئے تھے، اپنے ہمراہیوں سمیت
شہید ہوئے، فدوی محمد سعید (فرزند دوم
ملا قطب الدین شہید) اور کچھ طلبا، نیز پرگنہ سہالی
کے قاضی کے نائب قاضی عبد اللہ کے بھائی شیخ فضل اللہ
بھی اس ہنگامہ میں زخمی ہوئے۔

ملا قطب الدین کی شہادت کی یہ سب سے قدیم اور مستند تفصیلی روئیداد ہے، یہ اس محضر کا اقتباس ہے، جو ملا قطب شہید کے فرزندوں نے مرتب کیا تھا، اور جوار کے معززین نیز عمال شاہی کے دستخط اس پر لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے سامنے پیش کیا تھا، اس محضر سے جو ہنوز موجود ہے (اور مولانا محمد میاں صاحب فرنگی محلی جانشین مولانا قیام الدین محمد عبد الباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی ملک میں ہے) اس حادثے کی دیگر تفصیلات پر بھی پوری روشنی پڑتی ہے، اس چشم دید بیان کے پیش نظر ان قیاس آرائیوں یا روایتوں کی حاجت نہیں رہتی جو اس حادثے کے سلسلے میں تذکرہ نویسوں نے لکھی ہیں۔

اس سنسنی خیز واقعہ کے اسباب و علل کی توجیہ کے سلسلے میں مؤرخ کو قیاس آرائی سے کام لینے کی گنجائش ضرور ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ظلم اور طغیان بجائے خود ہی ظلم و فساد کا سبب ہوا کرتا ہے، قصبہ سہالی کے خان زادوں اور شیوخ عثمانی اور انصاریوں کے درمیان زمیندارانہ نزاع کو ملا صاحب سے عداوت کا سبب قرار دینا کوئی دور س تحقیق نہیں مانی جاسکتی، اس لیے کہ ایسی نزاع اور رقابت قصبات کی زندگی میں عامۃ الورود رہی ہے، قصبہ سہالی میں بھی یہ نزاع ہو سکتی تھی اور تھی

لیکن ملا قطب شہید کا اس میں موثر فریق کی حیثیت سے رکھنا تو محض تاریخی ثبوت کا محتاج ہے، اس محضر کے ذریعہ ملا قطب کے معمولاتِ زندگی پر جو روشنی پڑتی ہے، اس سے زمیندارانہ نزاعوں میں ان کی عملی شرکت کا عدم امکان ضمنی طور پر واضح ہو جاتا ہے :۔

براعاظم واکابر این دیار روشن و ہویدا است
کہ مولوی مذکور (ملا قطب الدین شہید) موصوف بکمالات
انسانیہ و فضائل علمیہ و عملیہ و حافظ قرآن مجید بودہ
و غیر اشتغال تدریس و تکرار با طلبۂ علوم دینیہ و عبادت
و طاعت کارے نداشتند و در اوقات فراغ
از درس و عبادت بہ تصنیف در علم تفسیر و حدیث
و فقہ و اصول می پرداختند

اس دیار کے تمام چھوٹے بڑے بخوبی جانتے ہیں کہ ملا
قطب الدین شہید کمالات انسانیہ اور علمی اور عملی
فضائل سے متصف اور حافظ قرآن مجید تھے، علوم دینیہ
کے طلبہ کے درس و تدریس اور عبادت خداوندی
کے علاوہ ان کا کوئی اور کام ہی نہ تھا، درس و
عبادت سے فرصت کے اوقات میں تفسیر حدیث
فقہ اور اصول فقہ و حدیث کے ایسے علوم میں
تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے،

"غیر اشتغالِ تدریس و تکرار و عبادت و طاعت کارے نداشتند" کے الفاظ بڑی وضاحت کے ساتھ ملا قطب کے معمولاتِ روز و شب کو پیش کر دیتے ہیں، ان علمی مصروفیتوں اور روحانی مشغولیتوں میں جائداد کے جھگڑوں اور زمیندارانہ نزاع کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی، یہ قیاس کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ شورہ پشتوں کے ظلم و جور کے ارمانوں کے پورا ہونے میں ملا صاحب کی وجاہت اور اصاغر و اکابر میں انکی مقبولیت سد راہ رہی ہو گی، شہنشاہ وقت اورنگزیب عالمگیر تک ملا صاحب کے علم و فضل، زہد و اتقا اور قناعت و گوشہ نشینی کی خصوصیتوں سے کما حقہ واقف تھا، اس نے بارہا ملا قطب سے ملاقات کی درخواست بھی کی تھی، مگر قطب نے اپنی جگہ سے ہلنے سے ہمیشہ انکار کیا

فرحۃ الناظرین (مخطوطہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے الفاظ ہیں۔

ملا قطب الدین شہید سہالوی در علوم معقول و منقول
سبقت از ہمسراں ربودہ، و پائے قناعت در
دامن عزلت چیدہ پیش اغنیا نمی رفتند و پیوستہ
بدرس طلبۂ علوم و کسب علوم معنوی پرداختہ در قصبہ
سہالی کہ از مضافات لکھنؤ است بسر می بردند
بارہا عالمگیر بادشاہ بتصدیعۂ ملاقات ملا گردید
ملتمس او را بدرجۂ اجابت نفرمودہ اکثرے را
از مرتبۂ شاگردی باوج استادی رسانیدند
از جملۂ تلامذۂ ایشاں ملا قطبی شمس آبادی کہ از
فحول علما است و مصنف مسلم الاصول و میزان السلم
از تلامذۂ آں نحریر زماں بودند، توصیفش از احاطۂ
تقریر و تحریر خارج. بالآخر باغوائے بعض مفسدہ
در سنہ چہل و ہفت عالمگیری در قصبۂ مذکور
شہید شدند

ملا قطب الدین شہید سہالوی علوم عقلیہ و نقلیہ
میں اپنے ہم عصر علما، پر فوقیت رکھتے تھے، اور
گوشہ نشینی کے دامن میں پائے قناعت کو لپیٹے
رہتے تھے، امیروں اور دولتمندوں کے پاس وہ
نہیں جاتے تھے، اور برابر طلبائے علم کو پڑھانے نیز
علوم معرفت کے کسب میں رہتے تھے، قصبۂ سہالی میں
جو لکھنؤ کے مضافات میں ہے زندگی گزارتے تھے، عالمگیر
بادشاہ نے بارہا ملا صاحب کو ملاقات کی زحمت
دی مگر ملا صاحب نے اس خواہش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا،
انھوں نے بہت سے لوگوں کو شاگردی کے نچلے درجے
سے اٹھا کر استادی کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچا دیا۔ من جملہ
ان کے شاگردوں کے ملا قطبی شمس آبادی (ملا قطب الدین
شمس آبادی) جو زبردست علما میں تھے، نیز مسلم
الاصول (مسلم الثبوت) اور میزان السلم کے مصنف
(یعنی ملا محب اللہ بہاری) اس علامۂ روزگار کے
شاگرد تھے، ملا قطب شہید کے تمام اوصاف بیان
کرنے اور تقریر و تحریر کے امکان سے خارج ہے۔
بالآخر کچھ شر پسندوں کی سازش سے عالمگیری جلوس کے
۴۷ ویں سال قصبۂ مذکورہ (قصبۂ سہالی) میں ملا قطب الدین شہید ہوئے

فرحۃ الناظرین کا مصنف بارہویں صدی ہجری کے آخر کا ہے، اسی صدی کے آغاز میں واقعۂ شہادت پیش آیا تھا: تیرہویں صدی ہجری کے آغاز کی ایک تصنیف میں جس کے مصنف ملا محمد ولی اللہ انصاری فرنگی محلی ہیں، جو چار واسطوں سے ملا قطب شہید کے پوتے ہیں، ملا قطب شہید کے ساتھ عالمگیر کی عقیدت مندی کا حال اس طرح ملتا ہے:۔

چو آوازۂ علم و فضل مولانا قطب الدین دراں	جب ملا قطب الدین کے علم و فضل کا شہرہ آس پاس
دیار اشتہار تمام تمام پیدا کرد بلکہ بسائر ممالیک	کے علاقوں میں خوب ہو چکا بلکہ تمام ہندستان
ہندستان انتشار یافتہ و خبر جودت فضیلت	میں پھیل گیا، اور ملا صاحب ذہانت اور فضیلت نیز
و تحصیل فراغ بسیاری از مرداں بخدمت	انکی خدمت میں پڑھنے والوں کے جلد از جلد فارغ
ایشاں بسمع اورنگ زیب بادشاہ غازی رسید	التحصیل ہونے کی خبر نیک خصال اورنگ زیب
بادشاہ نیک خصال ہمیشہ رسم نامہ و پیام	بادشاہ غازی کو پہنچی تو اس نے سلسلۂ مراسلت
بخدمت مولانا می داشت و رسوخ کمال	ملا صاحب سے برابر جاری رکھا، اور انتہائی عقیدت
بخدمت ایشاں پیدا ساخت ازیں جہت	اسے ملا صاحب سے ہو گئی یہی وجہ ہے کہ اورنگزیب
اکثر امیران بادشاہی را بخدمت می فرستاد۔	اپنے امرا اور حکام کو ملا قطب الدین شہید کی خدمت
(عمدۃ الوسائل از مولانا محمد ولی اللہ فرنگی محلی)	میں بھیجا کرتا تھا،

اور یہی وجہ ملا قطب الدین کی اشقیا کے ہاتھوں شہادت کی بھی ہوئی، جیسا کہ ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی اس کے آگے لکھتے ہیں:۔

این معنی محل خطر در خواطر اشقیا گشتہ کہ مبادا	عالمگیر کی اتنی عقیدت مندی اور امرائے شاہی کی
این بدنہادیہائے ما بسمع بادشاہ رسد و بقہر	ملا صاحب کی خدمت میں برابر آمد و رفت اشقیا کے
سلطانی ہلاک شدیم باہم مشورت کردند	لیے سبب خوف بن گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان شورہ پشتوں

کہ مولوی را از میان برداریم تا این خطرہ دور شود و خاطرجمعی حاصل گردد

کہ بدمعاشیاں بادشاہ کے علم میں آجائیں اور ان پر قہرِ شاہی نازل ہو جائے، ان اشقیا نے باہم صلاح و سازش کی کہ ملا قطب الدین کو درمیان سے ہٹا دینا چاہیے تاکہ یہ اندیشہ رفع ہو جائے اور پوری طرح سکون

خیال یہی ہوتا ہے کہ ان شودہ پشتوں کو شک ہوا یا واقعہ یوں ہی پیش آیا کہ قصبۂ سہالی میں ان لوگوں نے جو فساد عرصہ سے برپا کر رکھا تھا، اس کی اطلاع ملا صاحب کے ذریعہ بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور قبل اس کے یہ اشقیا قہرِ سلطانی سے ہلاک ہوں، انھوں نے ملا صاحب سے بدلہ لینے کے لیے ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی کے الفاظ میں "بطریق ڈاکہ" ملا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے۔

اس واقعہ سے متعلق چشم دید بیان بادشاہ کو پیش کیے جانے والے محضر کے جملے بھی اس سلسلے میں بیحد اہم ہیں:

ونعش مولوی را جا بجا مدفون می کردند و می برآوردند آخر بعد نہ روز ہر دو دست برید گرفتند و نعش بہ قصبۂ سہالی فرستادند

ملا قطب الدین کی لاش کو ایک جگہ دفن کرتے پھر نکالتے پھر دوسری جگہ دفن کرتے پھر نکالتے رہے بالآخر نو دن کے بعد ملا صاحب کی لاش کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لیے اور لاش قصبۂ سہالی بھجوا دی،

لاش کے دونوں ہاتھ کاٹ لینے کو محض "مثلہ" کی شقاوت تک محدود نہیں رکھا جا سکتا، اس لیے کہ سنگ دلی اور انتقام کی آگ کو ہاتھوں کو لاش سے جدا کر لینے سے ٹھنڈا انہیں کیا کرتے بلکہ یہ وحشیانہ حرکت ضمناً اس پر دلالت کرتی ہے کہ اشقیا کے غیظ و غضب کا جو سبب تھا، اس میں ملا صاحب کے ہاتھوں کا دخل ان اشقیاء کی نظر میں ضرور تھا،

بہر حال سند اور قیاس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملا صاحب کی کسی تحریر سے یا ان امرائے شاہی کی زبانی جو ملا صاحب کی خدمت میں بادشاہ کے بھیجے ہوئے آیا کرتے تھے، قصبہ سہالی کے ان شودہ پشتوں

کا حال بادشاہ کے علم میں آچکا تھا، اسی لیے

وقائع نگار، چوں واقعہ بر بادشاہ کہ دراں
ایام بہ دکن رونق بخش بود نوشت فی الفور
احکام بادشاہی بصوبہ داران آں نواح
رسید ندکہ زود قاتلان مولانا قطب الدین مرحوم
را بسزا بہ رسانند وخانہائے ایشاں
بہ کشند وہرکرا از آنہا یابند بکشند

جب شاہی خبر رسانوں نے ملا قطب کے واقعہ شہادت
کی اطلاع بادشاہ عالمگیر کو جو اس زمانے میں
دکن میں تھا، لکھ بھیجی تو فی الفور شاہی احکام
صوبہ داران علاقہ کو موصول ہوئے کہ ملا قطب الدین
مرحوم کے قاتلوں کو جلد از جلد سزا دی جائے، ان کے
گھروں کو مسمار کر دیا جائے اور قاتلوں میں سے جو بھی
ہاتھ آئے اس کو قتل کر دیا جائے،

یہ ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی کی کتاب عمدۃ الوسائل (قلمی مملوکہ مولانا محمد میاں صاحب فرنگی محلی) کا اقتباس ہے، ملا ولی اللہ اسی صدی کے آخر میں پڑھ لکھ کر فارغ ہو چکے تھے جس صدی کے آغاز میں حادثۂ شہادت پیش آیا تھا، معہذا ملا ولی اللہ فرنگی محلی کی تصریحات زیر غور مسئلہ میں اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ ایک چشم دید بیان ہے، دوسرا ایسا مستند مورخ اور تراجم رجال کا ماہر عالم اور مصنف ہے جس کی ثقاہت غیر نزاعی ہے۔ رسالہ قطبیہ (قلمی مملوکہ مولانا محمد میاں صاحب فرنگی محلی) کے مصنف بھی ملا قطب الدین شہید کے احفاد میں ہیں اور ملا ولی اللہ سے ایک پشت اوپر ہیں لیکن رسالہ قطبیہ کی تصنیف اور ملا ولی اللہ کی اس تصنیف کے درمیان صرف سات سال کا فرق ہے، رسالہ قطبیہ ۱۲۰۲ھ میں تمام ہوا اور ملا ولی اللہ کی کتاب عمدۃ الوسائل ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوئی اور بحیثیت مصنف و مورخ ملا ولی اللہ ثقہ اور اثبت مانے جاتے ہیں،

نسب و وطن | ملا قطب الدین شہید نسباً انصاری مسکناً سہالوی اور اصلاً مدنی تھے، خاندانی شجرے کی نقلوں کے درمیان جزوی اختلافات کے باوجود یہ امر متفقہ ہے کہ ملا قطب الدین، میزبان رسول کریم حضرت ابو ایوب انصاری مدنیؓ کی نسل میں شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل حضرت عبداللہ انصاری ہروی

کے واسطے سے تھے، نسب ناموں میں جزوی اختلاف بہت عام بات ہے، علمائے فرنگی محل نے ان اختلافات کو رفع کرنے میں "تحقیق بسیار و تدقیق بے شمار" سے ہر زمانے میں کام لیا ہے، ان تحقیقات کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، ملا قطب الدین شہید کے والد ماجد کا نام ملا عبد الحلیم تھا، ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض کتابیں آج بھی محفوظ ہیں، جن میں سے ایک مخطوطہ کا ترقیمہ یہ ہے:-

"تمام شد نسخۂ سبعیات[1] بخط احقر الانام عبد الحلیم بن عبد الکریم بن شیخ احمد بن شیخ حافظ انصاری ساکن قصبۂ سہالی سرکار لکھنؤ بتاریخ ۲۵ رمن شہر محرم یوم سہ شنبہ وقت ظہر در مقام لاہور سنہ ۱۰۴۹ھ"

خاتمۂ کتاب پر ملا عبد الحلیم کی مہر ہے جس کی عبارت اس طرح ہے: "خاک راہ اہل حق عبد الحلیم بن عبد الکریم"۔

اسی طرح انکی لکھی ہوئی ایک کتاب کا ترقیمہ ہے: "ھٰذا الکتاب المسمیٰ مقصود القاصدین بخط عبد الحلیم بن شیخ عبد الکریم فی وقت الظہر من یوم السابع عشر من ذی القعدۃ سنۃ ۱۰۵۱ بلدہ لاہور"۔

خاتمۂ کتاب پر مہر بھی ہے جس کی عبارت وہی "خاک راہ اہل حق عبد الحلیم بن عبد الکریم" ہے۔

ملا قطب الدین شہید کے آباء و اجداد میں سے چار مسلسل ناموں کا علم ملا عبد الحلیم کی اس تحریر سے ہوا، یعنی عبد الحلیم (باپ) عبد الکریم (دادا)، شیخ احمد (پردادا) اور شیخ حافظ انصاری (سگڑدادا) یہ آخری بزرگ شیخ حافظ الدین انصاری وہی ہیں جن کو فخر المتاخرین مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی فرنگی محلی نے اپنے تحقیق کردہ نسب نامے میں "حافظ الدین محمد اللاہوری مولداً و منشاءً" لکھا ہے، اور اسی بنیاد پر جامع صغیر کے مقدمہ النافع الکبیر میں تحریر فرمایا ہے "قد انتقل آباءنا من المدینۃ المنورۃ الی ھرات ثم منھا الی دہلی ثم منھا الی لاھور ثم منھا الی سھالی"۔ (یعنی ہمارے آباء و اجداد مدینہ منورہ سے ہرات وہاں سے دہلی وہاں سے لاہور وہاں سے سہالی منتقل ہوئے) النافع الکبیر کے پہلے اڈیشن میں جو مطبع مصطفائی میں طبع ہوا ہے یہی الفاظ ہیں، دوسرے اڈیشن میں جو دبدبۂ احمدی پریس میں چھپا "ثم منھا الی لاہور" کے الفاظ نہیں ہیں اور مولانا عبد الحی کے مسودے میں بھی قلم زدہ ہیں، غالباً یہی ہوا کہ

---

[1] "سبعیات" شیخ ابو نصر محمد بن عبد الرحمٰن الہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جس میں سات کے عدد کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت اور فضیلت کو ثابت کیا گیا ہے، ساری بحث اس طرح ہے کہ سات چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے سات چیزوں سے مزین کیا ہے، پھر ان سات چیزوں کو دوسری سات چیزوں سے مزین کیا، تاکہ عالموں یا عاملوں کو معلوم ہو جائے کہ مالک نفع و نقصان کے نزدیک سات کے عدد کی کیا اہمیت ہے

چونکہ علماے فرنگی محل کے اجداد کا لاہور میں قیام مستند طور پر مسموع نہیں ہوا تھا، اس لیے محقق جلیل مولانا عبدالحیٔ نے اسے لکھنے کے بعد قلم زد کر دیا، بہر حال یہی ملا حافظ وہ ہیں جن کو خاندان فرنگی محل میں "دادا حافظ" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے، ان ہی دادا حافظ کے نام جو بڑے عالم اور مدرس تھے، اور جن کے پاس دور دور سے طلبہ تحصیل علم کے لیے آتے تھے، شہنشاہ اکبر نے بڑے بڑے رقبۂ زمین کی معافی کا ایک فرمان جاری کیا تھا، جو اب تک خراب و خستہ حالت میں مولانا محمد میاں صاحب کے پاس محفوظ ہے، اس اکبری فرمان میں شیخ حافظ انصاری کا نام "شیخ حافظ ولد فضل اللہ" لکھا ہے، اس طرح ملا قطب شہید کے نسب نامہ میں پانچواں نام یعنی شیخ فضل اللہ بھی مستند ذریعے سے شامل ہو گیا،

مولانا محمد ولی اللہ فرنگی محلی نے اغصان اربعہ (مطبوعہ) میں لکھا ہے:-

بباید دانست کہ حضرت مولانا شہید در خاتمۂ
کتاب تلویحات کہ بخط خاص خود ترقیم فرمودہ
است نسب خود را بایں طور نوشتہ "قطب الدین
ابن عبدالحلیم بن عبدالکریم بن احمد بن حافظ بن
فضل اللہ بن بدہ بن نظام الدین بن
علاء الدین الانصاری تا اینجا در نسب
اختلاف نیست، و بہم وے قدس سرہ شیخ
علاء الدین را از احفاد خواجہ عبداللہ الانصاری
کہ "شیخ الطائفہ" و "پیر طریقت" و "حضرت خواجہ"
معروف است شمردہ و مزار وے در شہر
ہرات واقع است زیارت و متبرک بہ دیار قدس سرہ

ملا قطب شہید نے کتاب تلویحات کے خاتمے پر جو خود انکے
ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اپنا نسب نامہ اس طرح لکھا ہے
قطب الدین بن عبدالحلیم بن عبدالکریم بن احمد بن حافظ
بن فضل اللہ بن بدہ بن نظام الدین بن علاء الدین
الانصاری، یہاں تک نسب نامے میں کوئی اختلاف
نہیں ہے۔" اور حضرت ملا صاحب شہید نے شیخ
علاء الدین انصاری کو خواجہ عبداللہ انصاری کی
اولاد سے جن کو "شیخ الطائفہ"، "پیر طریقت" اور
"حضرت خواجہ" کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے گنایا ہے
حضرت خواجہ کا مزار ہرات میں ہے، جو زیارت گاہ
اور متبرک ہے، حضرت خواجہ کو "شیخ الانصار"

شیخ الانصار ہم می گویند ونسب شریفش	بھی کہتے ہیں، ان کا (حضرت خواجہ کا) نسب
را تا بہ ابو ایوب انصاریؓ صاحب رسول اللہ	حضرت ابو ایوب انصاریؓ تک جو آنحضرت صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم رسانیدہ اند	علیہ وسلم کے مدینہ شریف میں میزبان تھے، لوگوں
	نے ملایا ہے،

ملا محمد عبد الباقی الانصاری فرنگی محلی مہاجر مدنی نے اپنے رسالہ قرۃ الابصار فی نسب قطب الانصار (قلمی) میں لکھا ہے:

نیز راقم الحروف بخط ملا قطب الدین شہیدم	میں نے بھی یہی نسب نامہ (جو ملا محمد ولی اللہ
در خاتمۂ شرح حینی کہ بقلم خود تحریر فرمودہ اند	فرنگی محلی نے اغصان اربعہ میں ملا قطب الدین
ہمچو بالا مشاہدہ نمود	شہید کی لکھی ہوئی کتاب تلویحات سے نقل کیا ہے)
	ملا قطب الدین شہیدؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا شرح حینی کے
	آخر میں خود دیکھا ہے، اور یہ شرح حینی ملا
	قطب الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

ملا عبد الباقی فرنگی محلی نے اس رسالے میں استاذ الہند ملا نظام الدین کا ایک محدثانہ جواب بھی اس سلسلے میں نقل کیا ہے،

گفتہ اند کہ نسابۂ از ہرات پیش حضرت ملا	ہرات سے ایک ماہر نسب ملا نظام الدین کے پاس
نظام الدین آمدہ بود گفت کہ عبد اللہ انصاری	آیا اور اس نے کہا شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ
پسرے نداشت آنہا یک بچہ را از سادات	الانصاری کے کوئی صاحبزادے نہیں تھے، انہوں نے
پرورش نمودہ چونکہ شیخ الاسلام مشہور بود	ایک بچہ کو جو سادات میں تھا پرورش فرمایا تھا،
آں بچہ را بوے نسبت نمودند وفی الحقیقت	چونکہ شیخ الاسلام مشہور شخصیت تھے، اس بچے کو

اولاد سادات ہستند ملا فرمودند اگر این درست است روز قیامت او را سود باشد کہ در حدیث است کل نسب وصہر ینقطع یوم القیامۃ الا نسبی وصہری در دنیا گفتہ یک کس کہ صدق وکذب وے ہم مجہول است نسب مشہور را چگونہ بچہ طور تغیر دہم

ان ہی سے منسوب کر دیا تھا، درحقیقت وہ سادات کی اولاد تھا، ملا نظام الدین نے فرمایا کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا نفع روز قیامت میں اٹھایا جائے گا اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب نسب اور سب رشتے سوائے میرے نسب اور رشتے کے ٹوٹ جائیں گے دنیا میں محض ایک شخص کے کہنے سے جس کے صدق وکذب کا حال بھی تحقیق سے معلوم نہیں، میں کیسے مشہور نسب نامہ میں تغیر وتبدل کر دوں؟

ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی (ملا نظام الدین کے بڑے پوتے) نے بھی اس واقعہ کا ذکر رسالہ قطبیہ (قلمی) میں کیا ہے، اور ملا صاحب کا جواب مختصر طور پر اس طرح نقل کیا ہے:۔

مولانا عارف جواب داد کہ خبر مشہور را بخبر واحد نباید گذاشت

مولانائے عارف (یعنی ملا نظام الدین) نے جواب دیا کہ خبر واحد کی بنا پر خبر مشہور کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔

ملا قطب شہید کے اجداد میں ملا نظام الدین بن ملا علاء الدین (ساتویں پشت) سب سے پہلے سہالی (ضلع بارہ بنکی) میں آکر قیام پذیر ہوئے، سہالی ہی میں انکا مزار ہے جو انکی نسبت سے "روضہ" کہلاتا ہے۔

ملا قطب کی ولادت اسی قصبہ سہالی میں ہوئی اور غالباً ۱۰۴۰ھ ان کا سنہ ولادت ہے، تذکرہ نویسوں نے تاریخ ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی نے رسالہ قطبیہ (قلمی) میں ملا قطب شہید کے بارے میں لکھا ہے:

اکثر دعائے شہادت خود می کردند وطلب

ملا قطب شہید اکثر اپنی شہادت کی تمنا کرتے تھے

عمر مسنون می نمودند مستجاب شد — اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی دعا فرمایا
کرتے تھے، دونوں دعائیں قبول ہوئیں۔

ملا قطب کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی۔ اس میں سے ۶۳ سال جو عمر نبوی کے ہیں وضع کرنے سے قریب قریب ۱۰۴۰ھ برآمد ہوتا ہے،

ملا قطب شہید کے والد ملا عبد الحلیم ۱۰۴۹ھ اور ۱۰۵۱ھ میں یقیناً لاہور میں تھے، جیسا کہ انکی مخطوطہ کتب کے ترقیموں سے ظاہر ہے۔ انھوں نے لاہور میں ملا عبد السلام دیوی سے جو لاہور کے مدرسے میں مدرس تھے، پڑھا تھا، اور پھر ان ہی کے مدرسے میں مدرس بھی ہو گئے، مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے تاریخ فرنگی محل (قلمی) میں لکھا ہے :-

"ملا عبد الحلیم نے ملا عبد السلام ساکن قصبۂ دیوا سے تحصیل علوم کیا، اور لاہور کے مدرسے میں مدرس رہے، بلکہ ان کا لکھا ہوا ہدایہ لاہور میں تمام ہوا ہے جس کے آخر میں لکھتے ہیں، ترجمہ عربی عبارت کا یہ ہے:
"تمام ہوا نصف آخر ہدایہ بخط عبد ضعیف محتاج الی رحمۃ ربہ الغنی العظیم محمد عبد الحلیم بن عبد الکریم انصاری ساکن قصبۂ سہالی من مضافات شہر لکھنؤ ساتھ پڑھنے ہدایہ کے خدمت میں استاد علمائے عصر مجمع الفضلاء الفحول فی المعقول و المنقول لاسیما فی الفقہ و الاصول حضرت شیخ عبد السلام الاعظمی بوقت عصر روز چہار شنبہ ۲۰ / ماہ رمضان المبارک ۱۰۵۰ھ بلدۂ دار السلطنت لاہور میں۔" اور اس پر ان کے حواشی بھی ہیں، ان کی فقر و زہد کی طرف بہت توجہ تھی، اس وجہ سے ان کو علمائے ربانیین میں شمار کرتے ہیں، وفات فرمائی انھوں نے سہالی میں اور وہیں دفن ہوئے۔"

ملا قطب شہید بچپن میں اپنے ننھیال قصبۂ گڑھی بھلول (ضلع بارہ بنکی) میں رہے ہیں، غالباً یہ وہی زمانہ ہے جب ان کے والد ماجد وطن سے بہت دور لاہور میں قیام پذیر تھے، یعنی ملا قطب کی عمر کے گیارہویں بارہویں سال تک،

ثقات گفتہ اند کہ مولانا در ایام طفولیت بخانۂ
خانہ خود کہ ملک حمزہ نام داشت رفتہ بود ملک
مذکور بخدمت شاہ حمید ابدال رسوخ و نیاز
تمام داشت بداں جہت مولانا را نیز ہمراہ خود
بخدمت ایشان بردہ شاہ حمید قدس سرہ
چون شکل مولانا از دور دید عنایت شادمانی نزد
خود طلبیدہ در آغوش خود گرفت الطافہا
بہ نسبت ایشان مبذول داشت بسر دست
بر شکم مولانا نہادہ فرمود کہ علم در شکم این طفل
پر ساختہ اند چندانکہ پشت در پشت در خانۂ این
ہمیں عنوان طریقۂ علم خواہد ماند بعد ازاں
پرسیدند شاہ چہ می خوانید مولانا عرض ساخت
کافیۂ شیخ ابن حاجب...... شاہ صاحب موصوف
قدس سرہ بعد ازاں مولانا را چیزے بطریق
تبرک عنایت فرمودہ رخصت نمود و تقید کسب
علوم فرمود (عمدة الوسائل قلمی)

معتبر حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا قطب الدین بچپن
میں اپنے نانا کے گھر جن کا نام حمزہ تھا، (قصبہ گردہی
بھلول ضلع بارہ بنکی) گئے ہوئے تھے، ملک حمزہ کو
شاہ حمید ابدال کی خدمت میں انتہائی عقیدت اور
رسوخ تھا اس لیے جب وہ شاہ حمید قدس سرہ
کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نواسے ملا قطب الدین
کو بھی ہمراہ لیجاتے تھے، شاہ صاحب نے دور ہی سے
مولانا کی شکل دیکھتے ہی (حالانکہ مولانا بالکل بچہ تھا)
انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ پاس بلایا اور اپنی
گود میں لے لیا، بے اندازہ شفقتیں فرمائیں، اس کے
بعد مولانا قطب کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اس بچے
کے پیٹ کو علم سے بھرپور کر دیا گیا ہے، پشت در پشت
اس کے گھرانے میں اسی طرح سے علم کا چلن رہے گا،
اس کے بعد شاہ صاحب نے مولانا سے دریافت فرمایا
کہ تم کیا پڑھتے ہو، مولانا نے جواب میں عرض کیا
"شیخ ابن حاجب کی کافیہ"...... اس کے بعد
شاہ حمید ابدال قدس سرہ نے بطور تبرک کے کوئی
چیز مرحمت فرماکر مولانا کو جانے کی اجازت دی اور
تحصیل علم کی سخت تاکید فرمائی ۔

ملا قطب شہید جو کافیۂ شیخ احمد بن حاجب تک پڑھ چکے تھے، اس کے بعد اپنے والد ماجد کے پاس بغرض تکمیل تعلیم لاہور چلے گئے،

آمدنے ہمراہ والد خود در لاہور ماند و دراں	ایک مدت تک اپنے والد کے ہمراہ لاہور میں
ملک تحصیل نمود و بتدریس اکثر علوم در مدرسۂ	تحصیل علم کرتے رہے، اکثر علوم کی تعلیم ملا عبد السلام
ملا عبد السلام دیوی کہ دراں ایام مدرس	دیوی (دیوہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے) کے
آنجا بود تکمیل نمود عرض در ہر فن از اصول	مدرسہ میں کی (ملا عبد الحلیم اس زمانے میں وہاں
و فقہ و معانی و منطق و طبیعی و الٰہی و ریاضی	مدرس تھے، اور فراغت حاصل کی، بہرحال تمام فنون
و دیگر فنون غریبہ و حدیث کامل شدہ	اصول، فقہ، معانی، منطق، طبیعی، الٰہی، ریاضی
(عمدۃ الوسائل قلمی)	نیز دوسرے نادر فنون (یا عربی علوم) اور حدیث میں کمال حاصل کیا۔

اساتذہ | ملا قطب کے اساتذہ میں ان کے والد ماجد ملا عبد الحلیم کے علاوہ ملا دانیال چوراسی کا اور بعض تذکروں میں ملا عبد السلام دیوی کا بھی ذکر ہے، ملا عبد السلام دیوی کو استاد ملا قطب شہید کے ضمن میں مصنف رسالہ قطبیہ نے دو خاص باتیں ملا عبد السلام دیوی کے بارے میں لکھی ہیں:

(۱) مروج علم اصول در ہند بود	ہندوستان میں علم اصول فقہ کو انھوں نے رواج دیا
(۲) خلاف روایات فتاوی فتوی می دادند	فتاوی کی کتابوں میں درج فتووں کے خلاف
چہ اکثر بر اصول منطبق نمی یافتند	فتوی دیتے تھے، اس لیے کہ کتابوں میں درج
	فتوی اصول فقہ پر منطبق نہیں ہوتے تھے،

بہرحال ملا قطب الدین شہید کا سلسلۂ تلمذ اس طرح ہے: ملا عبد الحلیم و ملا دانیال چوراسی، دونوں نے ملا عبد السلام دیوی سے، انھوں نے ملا عبد السلام لاہوری سے، انھوں نے میر فتح اللہ شیرازی سے، انھوں نے خواجہ جمال الدین محمود شیرازی سے، انھوں نے علامہ جلال الدین دوانی سے

انھوں نے علامہ محی الدین کوشکناری اور خواجہ حسن شاہ بقال سے انھوں نے میر سید شریف جرجانی سے انھوں نے مبارک شاہ سے اور انھوں نے علامہ قطب الدین رازی سے پڑھا۔

ملا قطب شہید، تذکرہ نویسوں کی صراحت کے مطابق تیس سال کی عمر میں جملہ علوم وفنون ظاہری میں فارغ ہوکر اپنے والد ماجد کے ہمراہ لاہور سے وطن واپس آکر قصبۂ سہالی میں مسند درس پر بیٹھے اور چالیس سال کی عمر میں حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی چشتی وجودی کے خلیفہ اور جانشین قاضی گھاسی الہ آبادی سے علوم باطنی حاصل کیے اور سلسلۂ چشتیہ میں ان کے مرید اور خلیفہ مجاز ہوئے۔ تخمینی حساب سے یہ سنہ ہوگا۔ قاضی گھاسی کا پورا نام قاضی صدر الدین تھا۔ درس وتدریس اور رشد وہدایت کا سلسلہ ملا قطب شہید سے اس قدر وسیع ہوا کہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق

امام اساتذہ ومقتدائے جہابذہ معدن عقلیات	اساتذہ کے امام، دانشوروں کے پیشوا، معقولات
ومخزن نقلیات ملا قطب الدین عمرہا انجمن درس	کی کان اور منقولات کے خزانے ملا قطب الدین نے
آراست وجہاں جہاں ارباب تحصیل را بہ پایۂ	ایک عرصے تک مسند درس کو رونق بخشی اور جگہ جگہ
تکمیل رسانید و امروز سلسلۂ استفادۂ اکثر	کے طلبۂ علم کو درجۂ کمال تک پہنچایا، آج مملکت
علمائے کشور ہندوستان بہ او منتہی می شود	ہندوستان کے بیشتر علماء کا سلسلۂ تلمذ ملا
(مآثر الکرام)	قطب الدین تک پہنچتا ہے۔

علامہ آزاد بلگرامی نے ملا قطب کے سال شہادت کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

شخصے مصراع تاریخی در بحر خفیف یافتہ کہ	ایک شخص نے بحر خفیف میں مصرعۂ تاریخ وفات
در آن ترکیب توصیفی قطع می شد لہذا فقیر	دریافت کیا تھا جس میں ترکیب توصیفی منقطع ہوگئی تھی،
مصراع را در وزن رباعی بردہ سہ مصرع	اسلیے فقیر (علامہ آزاد بلگرامی) نے اس مصرع کو رباعی
دیگر ضم ساخت:۔	کے وزن میں منتقل کرکے تین مصرعے اس میں اضافہ کردیے:

علامۂ بحر زاخر تفضل و ہنر — در دامنِ ارباب طلب ریخت گہر

دل خون شدہ تاریخ وفاتش فرمود — قطب عالم شدہ شہید اکبر ۱۱۰۳ھ

(فضل و ہنر کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، علامۂ روزگار جس نے ارباب علم کے دامنوں کو موتیوں سے بھر دیا

دل نے خون ہو کر ان کے وفات کی تاریخ پڑھی، قطب عالم شدہ شہید اکبر۔ ۱۱۰۳ھ

ملا قطب شہید کی ایک خصوصیت کا تقریباً سب تذکرہ نویس مشترک الفاظ میں ذکر کرتے ہیں، یعنی "ارباب تحصیل را بہ پایۂ کمال رسانید" (غلام علی آزاد بلگرامی)، "اکثرے را از مرتبۂ شاگردی بادج استادی رسانیدند" (فرحۃ الناظرین)، "تحصیل فراغ بسیاری از مردمان بخدمت ایشان" (عمدۃ الوسائل)، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملا صاحب کا اپنے عہد میں اعلیٰ امتیاز خوبی درس تھا، اور درس کی خوبی "تحصیل فراغ بسیاری" یعنی جلد فارغ التحصیل کرا دینا تھی، "تحصیل فراغ بسیاری از مردماں بخدمت ایشاں" کا یہ مطلب میں نے سمجھا ہے، دوسرا مطلب "بسیارے از مردماں" بھی ہو سکتا ہے، یعنی بڑی تعداد میں لوگ ملا صاحب کی خدمت میں پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے اس مطلب سے بھی خوبی درس پر ہی روشنی پڑتی ہے۔

تلامذہ | اس کے علاوہ ملا صاحب کے درس کی خوبی، متانت اور اتقان کو ان اجلۂ علماء کے کارناموں سے بھی جانچا جا سکتا ہے، جو ملا صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کر کے استادی کے درجہ تک پہنچے، ان میں سے چند نام تاریخ نے محفوظ کر لیے ہیں:-

(۱) قطب الدین شمس آبادی مسکناً و امیٹھوی موطناً (۲) حافظ امان اللہ بنارسی (۳) قاضی محب اللہ بہاری (۴) قاضی شہاب الدین گوپاموی (۵) حاجی صبغۃ اللہ خیرآبادی (۶) زین العابدین سندیلوی (۷) قاضی دولت سہالوی (۸) ملک بہاء الدین بلگرامی (۹) میر عبد الہادی بن میر عبد الواحد بلگرامی (۱۰) ملا محمد غوث کاکوروی (۱۱) مولوی اسمٰعیل اورنگ آبادی (۱۲) ملا محمد اسعد فرزند اکبر ملا قطب الدین شہید

ملا محمد سعید (فرزند دوم ملا قطب شہید) اور (۱۳) ملا علی قلی جائسی ۔

یہ تمام تلامذہ اپنے علمی اور تدریسی کارناموں کی بنا پر علٰحدہ علٰحدہ عنوانِ گفتگو بننے کے مستحق ہیں، ملا قطب کے ایک شاگرد کا جو دوسرے پہلو سے تاریخ میں محفوظ رہ گئے، ان علمی شخصیتوں کے ساتھ تذکرہ نگاروں نے نام نہیں لیا ہے، یہ ہیں غلام مصطفےٰ متخلص بہ انساؔن کبنوہ مرادآبادی "سروِ آزاد" میں علامہ بلگرامی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے ان کی زبانی ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے :

شیخ غلام مصطفےٰ انساؔن کامل بود در احاطۂ علوم عقلی و نقلی ممتاز، ما حصل تحصیل معقولات بیشتر از ملا قطب الدین سہالوی نمود، چندے در خدمت شیخ غلام نقش بند لکھنوی تلمذ کرد

شیخ غلام مصطفےٰ انساؔن علوم عقلیہ و نقلیہ پر حاوی ہونے میں درجۂ کمال رکھتے تھے، اور ہم عصروں میں ممتاز مانے جاتے تھے، اکثر علوم عقلیہ کی تحصیل ملا قطب الدین سہالوی کی خدمت میں کی اور بہت تھوڑا شیخ غلام نقش بند لکھنوی کی خدمت میں پڑھا،

اس کے بعد لکھتے ہیں :

فرمود، در ایام طالب علمی با جوانے تعلق خاطر پیدا شد، جوانے در قصبۂ از قصبات سکونت داشت خود را بمسکن محبوب کشیدم و دست از تحصیل باز کشیدم قضارا جوانے فوت شد و من بصحرا دادم وقتے ملا قطب الدین را گزرے بران قصبہ افتاد و از مردم استفسار حال بندہ نمود صورت واقعہ بعرض رسانیدند، فرمود کسے بہ او برود او را بیارد، مردم گفتند او

شیخ غلام مصطفےٰ نے خود بیان کیا کہ طالب علمی کے زمانے میں ایک نوجوان سے مجھے عشق ہو گیا تھا، یہ جوان ایک قصبہ کا رہنے والا تھا، میں خود کو اپنے محبوب کے وطن میں کھینچ لایا اور پڑھنے پڑھانے سے دست کش ہو گیا، بدقسمتی سے وہ جوان فوت ہو گیا اور میں جنگل کی خاک چھاننے لگا، ایک دفعہ ملا قطب الدین اسی قصبے میں تشریف لائے اور لوگوں سے میرا حال دریافت کیا، جو معاملہ تھا لوگوں نے عرض کر دیا،

بآبادی زنہار نمی آید، حضرت ملا قلم گرفتہ
بر شقہ نوشت "اطوق کراء اطوق
کراء ان النعامۃ فی القوی" این کلام
افسون عرب است کہ آں جانوران وحشی
را صید کنند استعمال این کلام دریں مقام
نظر بحال شیخ و حضرت ملا کہ استاد بود
بسیار بموقعہ واقع شد،
بمجرد دیدن شقہ سمعاً و طاعۃً بخدمت
ملا شتافتم و سعادت ملازمت دریافتم

ملا صاحب نے فرمایا کہ کوئی جا کر اسکو یہاں لے آتا
لوگوں نے کہا وہ بستی میں کبھی نہیں آتے حضرت ملا صاحب نے
قلم اٹھایا اور ایک پرزے پر حسب ذیل الفاظ تحریر
فرمائے "اطوق کراء اطوق کراء ان النعامۃ
فی القوی" یہ الفاظ ایک منتر ہیں جن کے ذریعہ
اہل عرب جنگلی جانوروں کو قابو میں کیا کرتے ہیں،
اس جگہ اس منتر کا استعمال، شیخ غلام مصطفی اور
حضرت ملا صاحب کے حال کو دیکھئے کہ وہ انکے استاد
تھے، انتہائی برمحل تھا، یہ پرزہ دیکھتے ہی میں دوڑتا ہوا
ملا صاحب کی خدمت میں بسر و چشم حاضر ہوا اور
سعادت زیارت حاصل کی۔

شیخ غلام مصطفیٰ انسآن کی وفات علامہ بلگرامی کی صراحت کے مطابق ۱۱۴۲ھ میں ہوئی ان کی قبر ایلچپور میں ہے،

تصانیف | ملا قطب الدین شہید کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیا محروم رہی، صرف انکے نام باقی رہ گئے

علامہ آزاد بلگرامی کا کہنا ہے :-

ملا بشرح عقائد علامہ دوانی حاشیہ دقیقے
تعلیق کردہ بود، فتنہ جویان وقت شبخون
خانہ ملا را آتش زدن حاشیہ مذکور و ضمن
اثاث البیت طعمۂ آتش بیداد گردید
(مآثر الکرام)

ملا قطب الدین نے شرح عقائد علامہ دوانی پر بڑی دقت نظر
سے ایک حاشیہ لکھا تھا، فتنہ پردازوں نے جب ملا صاحب
کے گھر پر شبخون مارا تو گھر کے سامان کے ساتھ یہ حاشیہ
بھی بے رحم آگ کا لقمہ بن گیا۔

ملا ولی اللہ فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ

در ہر فن رسالۂ مضبوط وکتاب مستحکم تالیف
فرمودہ اشہر آں حاشیۂ تلویح وشرح عقائد
نسفیہ وتعلیقات بزدوی وحاشیۂ مطول
ورسالۂ تحقیق دار الحرب وغیرہ کتب کثیر
الحجم کہ از دست ظلمۂ فسقہ برباد شدند
ومسودات بدون نقل سوختند
(عمدۃ الوسائل قلمی)

ہر فن میں ایک مضبوط تصنیف اور مستحکم کتاب
انھوں نے تحریر فرمائی تھی، انکی مشہور تصانیف
میں حاشیہ تلویح، حاشیہ شرح عقائد نسفی، تعلیقات
بزدوی کی شرح حاشیہ مطول اور دار الحرب کی
تحقیق میں ایک رسالہ ہے، یہ سب بڑی ضخامت والی
تصانیف ظالم بدمعاشوں کے ہاتھوں برباد ہو گئیں،
ملا صاحب کی تصانیف کے مسودے جو بغیر نقل
کے تھے، ان بدمعاشوں نے جلا دیے۔

مصنف رسالہ قطبیہ ملا عبد الاعلیٰ نے لکھا ہے:۔

تصانیفش بسیار بود وہمہ مفقود شدند حاشیۂ
شرح حکمۃ العین کہ در کتب خانۂ مولانا کامل
موجود است وچند اجزائے مسودہ رسالۂ
امور عامہ نیز الحال یافتہ شدند وحاشیہ تلویح
تا وقت مولانائے عارف موجود الحال مفقود است

ملا قطب الدین کی بہت سی تصانیف تھیں، سب
مفقود ہو گئی ہیں، شرح حکمت العین کا حاشیہ ملا
بحر العلوم کی کتابوں میں موجود ہے اور امور عامہ
کے متعلق ایک رسالے کے چند اجزا ابھی پائے جاتے
ہیں، حاشیہ تلویح ملا نظام الدین کے زمانے تک
موجود تھا، اب وہ بھی لاپتہ ہو گیا ہے۔

یہ صورت حال بارھویں صدی کے آخر کی ہے، جو مصنف رسالہ قطبیہ نے لکھی ہے، محضر میں جو ملا قطب شہید
کے فرزندوں کی طرف سے بادشاہ عالمگیر کو پیش کیا گیا تھا، تحریر ہے:۔

کتب مولوی را کہ قریب نہ صد جلد مجتمع بود

ظالموں نے ملا صاحب کے کتب خانہ کو جس میں نو سو کے

اکثرے ازاں آتش دادہ سوختند وازاں میان
مصحف مجید چہار جلد و مشکوٰۃ وغیرہ از کتب
حدیث و مصنفات مولوی حاشیہ تلویح و شرح
عقائد نسفیہ و تفریعات بزدوی و حاشیۂ مطول
وغیرہ کتب کثیر الحجم مشتمل بر فوائد جمیلہ بودند
ہمہ سوختہ شدہ وہمہ را بر داشتہ بردند

قریب کتابیں تھیں، ان میں اکثر کو آگ لگا کر جلا ڈالا
جن میں قرآن شریف کے چار نسخے، مشکوٰۃ اور حدیث
کی دوسری کتابیں اور ملا قطب شہید کی تصانیف
حاشیۂ تلویح، شرح عقائد نسفیہ، شرح تفریعات بزدوی
اور حاشیۂ مطول وغیرہ شامل تھیں اور جو بڑی ضخیم
اور بہترین مباحث پر مشتمل تھیں سب جل گئیں اور
حملہ آور سب اٹھا لے گئے۔

بہر حال اس وقت ملا قطب شہید کی کوئی تصنیف نہیں پائی جاتی ہے، ان کی افسوسناک بربادی کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے، اس سے علمی دنیا ایک ایسے مصنف اور مدرس کے نقطۂ نظر سے محروم ہو گئی جو تدریسی پہلو سے بلا شبہہ عہد آخریں تھا، ملا قطب کے علمی عہد کا آغاز ایسے وقت ہوا جب ہندوستان کے بڑے مصنفین زندہ موجود تھے جن میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، میرزاہد ہروی، اور حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قابل ذکر ہیں، ان حضرات کا رجحان تصنیف جداگانہ تھا، اگر ملا قطب الدین شہید سہالوی کی تصانیف موجود ہوتیں تو علمی حلقوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل نہ ہوتا کہ طریقۂ تدریس میں انقلاب لانے والی اس مقدس ہستی کا رجحان تصنیف کیا تھا،

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مضمون "فرنگی محل یا نظامیہ بغداد یا ہندوستان کا کیمبرج" میں ملا قطب الدین شہید کو اس طرح نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے :-

"تمام ہندوستان بلکہ انصاف یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں یہ بات صرف اس مقدس ذات کو حاصل ہے کہ پورے دو سو برس تک متواتر اور مسلسل بلا فصل ان کی نسل سے علماء ہوتے چلے آئے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔"

ملا قطب شہید کا دادھیال سہالی ضلع بارہ بنکی میں اور نانیہال گزاہی بھلول ضلع بارہ بنکی میں تھا، ان کے نانا ملک حمزہ شہید عباس گڑھی بھلول کے چودھری تھے، ملا صاحب کی شادی قصبہ سیہہ ضلع بارہ بنکی میں احرار خاندان میں ہوئی تھی، علامہ شبلی نعمانی نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ "ملا صاحب کی شادی چودھری محمد آصف سہالوی کی لڑکی سے ہوئی تھی"۔ یہ صحیح نہیں ہے، چودھری آصف کی بیٹی سے ملا صاحب کے سنجھلے بیٹے کا عقد ہوا تھا،

اولاد | ملا قطب شہید کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں بیٹیوں کی شادیاں گڑھی بھلول اور گکس کر میں ہوئی تھیں،

بڑے بیٹے ملا اسعد، منجھلے ملا محمد سعید، سنجھلے ملا نظام الدین اور چھوٹے ملا محمد رضا تھے، ملا اسعد اور ملا سعید نے اپنے والد ماجد ہی سے تحصیل علم کی تھی، بڑے بیٹے ملا اسعد اپنے والد کی حیات ہی میں اورنگزیب کے پاس چلے گئے تھے، اور اپنی بیوی اور خورد سال بیٹے غلام مصطفےٰ کو اپنے والد کے پاس چھوڑ دیا تھا، وہ عالمگیر کے پاس تھے کہ والد ماجد کی شہادت کی خبر موصول ہوئی، مگر ملا اسعد پھر وطن واپس نہیں آئے، ان کا سال وفات اور مرقد تک معلوم نہیں ہے، ان کا علمی کارنامہ علامۂ دوانی کے حاشیۂ قدیمہ پر حاشیہ، آج بھی موجود ہے، جو ان کی علمی قابلیت کی قاطع دلیل ہے، یہ حاشیہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مولانا عبد الحئ فرنگی محلی کلکشن میں ہے،

منجھلے صاحبزادے ملا محمد سعید ملا قطب کی شہادت کے وقت موجود تھے، اور اس معرکے میں زخمی بھی ہوئے تھے، واقعۂ شہادت کے بعد یہی بیٹے محضر لے کر عالمگیر کے پاس گئے تھے؛ جو اس وقت دکن میں تھا، عالمگیر نے جو صورت واقعہ سے پہلے ہی مطلع ہو چکا تھا، ملا قطب شہید کے کنبے کی اس خواہش کو کہ وہ اب سہالی میں رہنا نہیں چاہتا معلوم کر کے ان ہی ملا محمد سعید کے ذریعہ کروری بلدۂ لکھنؤ کو فرمان بھیجا کہ

ہر سہ کانیکہ ملا محمد سعید فرزند ارجمند مولانا قطب الدین شہید برائے سکونت خود و دیگر فرزندانِ شہید مذکور در بلدۂ لکھنؤ تجویز نمایند آں را سپرد کردہ بقبضۂ او در آوردہ،

ملا قطب الدین شہید کے فرزند ارجمند ملا محمد سعید اپنے اور ملائے شہید کے دوسرے بیٹوں کے رہنے کے لیے لکھنؤ میں پسند کریں، وہ ان کے سپرد کرکے ان پر ان کا قبضہ دلایا جائے۔

(اغصانِ اربعہ مطبوعہ از مولانا محمد ولی اللہ فرنگی محلی)

کروریِ بلدۂ لکھنؤ اس زمانے میں شیخ حسام الدین تھے جو ملا قطب الدین شہید کے چچیرے بھائی تھے، وہ خود اگرچہ لکھنؤ میں تھے لیکن ان کا گھربار سہالی میں تھا، ان کا گھر بھی ملا قطب شہید کے قاتلین کے ہاتھوں تاراج ہوا،

ملا محمد سعید عالمگیر کا فرمان لیکر کروریِ بلدۂ لکھنؤ کے پاس آئے اور اپنے اور اپنے کنبے کے لیے فرانسیسی تاجر کی اس کوٹھی پر ان کی نظر انتخاب پڑی جو اجارے کی مدت ختم ہو جانے کے بعد سرکاری ملک میں آگئی تھی، اس کوٹھی میں جو "حویلی فرنگی" کہلاتی تھی، اپنے گھر والوں کو بسا کر ملا محمد سعید خاص اس حویلی کا فرمان حاصل کرنے کے لیے دوبارہ بادشاہ کے پاس دکن گئے اور جدید فرمان لیکر جس میں "یک قطعۂ حویلی فرنگی" کے الفاظ ہیں اور جو اب تک محفوظ ہے واپس وطن آئے،

ملا محمد سعید کچھ عرصہ وطن میں قیام کرکے پھر عالمگیر کے پاس چلے گئے اور وہیں انتقال فرمایا، سال وفات اور مرقد کے سلسلے میں وہ بھی اپنے بڑے بھائی کے ہم قسمت ثابت ہوئے،

اب ملا قطب شہید کے کنبے کی سربراہی ملا قطب کے سنجھلے فرزند کے ذمہ آگئی جو والد ماجد کی شہادت کے وقت صرف ۱۴ سال کے تھے، ان کی تعلیم بھی متوسطات سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی، اور یہی چودہ سالہ یتیم تھا جو آوارۂ وطن قافلۂ اولاد ملا قطب شہید کو لے کر سہالی سے لکھنؤ مشکوک اور غیر یقینی مستقبل کے دھندلکے میں روانہ ہوا تھا، اس طرح اپنے عارف اور خدارسیدہ باپ کی ایک پیشین گوئی پوری کر رہا تھا،

لکھنؤ | تاریخی تحقیقات کا معاملہ بھی عجیب ہوتا ہے، کسی تاریخی مقام یا لفظ کی تحقیق میں برسوں صرف کر دینے والے مورخ کے نتیجے کو، بارہا ایسا ہوا کہ کسی نئی شہادت کی اچانک دستیابی نے باطل ٹھہرا دیا، 'لکھنؤ' کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے،

اس سوال پر ہمیشہ غور و خوض ہوتا رہا ہے کہ "لکھنؤ" کا مطلب اور اسکی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اور اصل میں یہ لفظ کیا تھا اور کس لسانی ارتقاء سے گزر کر یہاں تک پہنچا؟ اور موجودہ لفظ "لکھنؤ" تاریخ کی کتابوں میں سب سے پہلے کب آیا ہے؟

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی تصنیف "حیات شبلی" میں لکھا ہے:

"تاریخوں میں سب سے پہلے اسکا نام میری تلاش میں تیمور کے حملے کے بعد ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۸ء میں ملتا ہے، تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا اور مظفر خاں نے گجرات میں، خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج، اودھ، کڑہ اور جونپور میں اور خضر خاں نے لاہور دیبالپور و ملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں تو ملو اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی، مبارک شاہ نے پورب میں اسکے پاؤں جمنے نہ دیے، اس سلسلے میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے، فرشتہ میں ہے "ملو اقبال خاں بہ قنوج رفتہ خواست کہ بجونپور و لکھنؤ در آید"۔ (ص ۱۴)

تاریخ فرشتہ متاخر تصنیف ہے، اس میں 'لکھنؤ' کا نام درج ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نویں صدی ہجری کے آغاز میں یعنی تیمور کے حملے کے بعد پھیلی ہوئی طوائف الملوکی کے زمانے میں بھی لکھنؤ کو لکھنؤ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، فرشتہ کے بیان سے اسی قدر اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسکے زمانے میں جو بہت بعد کا ہے، لکھنؤ کے نام سے اس بستی کو یاد کرنے لگے تھے،

محض اتفاق سے ایک سراغ ایسا مل گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کا نام تاریخ میں آٹھویں صدی ہجری کے اول نصف میں آچکا تھا، یعنی ملو اقبال خاں کی سرگرمیوں سے بھی تقریباً سو سال قبل۔

کتاب "رحلۃ ابن بطوطہ" (عربی مطبوعہ) کے مطالعے کے دوران میں دوسری جلد کے ٹائٹل پر بائیں گوشے کے اوپر قلم سے "ذکر لکھنؤ ص ۴۴" لکھا ہوا ملا، یہ کتاب مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی خرید کردہ تھی اور ان کے مطالعے میں رہ چکی تھی، یہ ان ہی کی تحریر تھی، جس نے بتایا کہ لکھنؤ کا ذکر ابن بطوطہ کے سفرنامے (عربی مطبوعہ) کے صفحہ ۴۴ پر آیا ہے، ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں ہندوستان آیا تھا، اور اس ملک کے طول و عرض میں دس سال کے قریب اس نے سلطان محمد بن تغلق کے قرب میں بسر کیے، سلطان کے ایک گورنر عین الملک کی بغاوت کے سلسلے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

"وامیرھا عین الملک بن ماھر ومنھا مدینۃ عوض و مدینۃ ظفرآباد و مدینۃ اللکھنو وغیرھا ۔" (ص ۴۴ مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۷ھ)

ابن بطوطہ کے سفرنامے کی پوری عبارت کا اردو میں مفہوم یہ ہے :۔

"جب ملک میں قحط پھیل گیا تو بادشاہ (سلطان محمد تغلق) دریائے گنگا کے کنارے جس کو ہندو متبرک خیال کرتے ہیں اور ہر سال حج کے طور پر وہاں جاتے ہیں، چلا گیا یہ دلی سے دس منزل پر تھا...... میں بھی بادشاہ کے کیمپ میں ان ہی دنوں پہنچا تھا، دریائے گنگا کے مغرب میں جو شہر تھے اور جہاں سلطان مقیم تھا، سخت قحط زدہ تھے، اور مشرق میں جو شہر تھے، ان میں ارزانی تھی اس علاقہ کا حاکم امیر عین الملک بن ماہر تھا۔ اسی علاقے میں اودھ کا شہر ظفرآباد کا شہر اور لکھنؤ کا شہر ہے۔"

دوسری تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قحط محمد بن تغلق کے دولت آباد سے ۷۴۲ھ میں واپسی کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں پڑا تھا، مگر پورب کا علاقہ اس مصیبت سے محفوظ تھا، اس لیے سلطان نے اجازت دیدی تھی کہ جس کا جی چاہے پورب کے علاقے میں جا کر مصیبت کے یہ دن کاٹے، اور خود سلطان دہلی اپنے لشکر کے ساتھ شمس آباد (ضلع فرخ آباد) کے قریب ایک مقام سرگ دوار چلا گیا (تاریخ بدایونی)

مشہور ہے کہ لکھنؤ، رام چندر جی کے بھائی لچھمن کی جاگیر تھا۔ اور اس خطہ کا نام پہلے "لچھمن پور" یا "لچھمن پوری" تھا، مگر یہ ماقبل تاریخ کی باتیں ہیں، پھر بھی ایک روایت ملتی ہے جس سے لکھنؤ کے لچھمن جی سے تعلق کی بات بے اصل نہیں رہتی،

یہ روایت "کرامات رزاقیہ" کی ہے، جو حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء) کے ملفوظ اور کرامات پر مشتمل ہے، کتاب کے مصنف محمد خاں صاحب رزاقی شاہجہانپوری نے صاحب ملفوظ کے بڑے بیٹے کے صاحبزادے شاہ غلام علی رزاقی (متوفی ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء) سے انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ غلام دوست محمدؒ (متوفی ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء) سے انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر بعینہٖ ان ہی الفاظ میں جو حضرت سید بانسویؒ کے زبان مبارک سے ادا ہوئے، ملفوظ کو مرتب کیا ہے، اسی لیے کتاب "کرامات رزاقیہ" اگرچہ ڈیڑھ پونے دوسو برس قدیم تصنیف ہے لیکن اس کی زبان ڈھائی تین سو برس پرانی ہے، کیونکہ مصنف نے "بے کم و کاست" ان ہی الفاظ کے قلم بند کرنے کا التزام رکھا تھا، جو حضرت سید صاحب بانسویؒ کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوئے تھے، اور بعینہٖ نقل ہوئے تھے، بہرحال کتاب "کرامات رزاقیہ" میں شاہ غلام علیؒ کی زبانی نقل ہے:۔

ایک دفعہ حضرت (سید صاحب بانسویؒ) دکن میں تھے، ایک روز اپنے مکان کو تشریف لے چلے، وہاں دو راہیں تھیں، ایک آبادی کی، ایک جنگل کی، کہیں یہ (سید صاحب بانسویؒ) تشریف لے جانے میں آبادی کی راہ چھوڑ کر جنگل کی راہ چلے گئے، اس جنگل میں ایک تالاب دیکھا، اترے وضو کیا تو (پھر) ایک شخص آیا حضرت سے پوچھا "کہاں رہتے ہو؟" حضرت نے فرمایا "لکھنؤ شہر میں" ان نے (اس شخص نے) کہا کہ "ہمارا لچھنؤ؟" تو (تو) فرمایا کہ "ہمارا تمھارا تو میں نہیں جانتا ہوں، ایک شہر ہندوستان میں ہے، وہاں رہتا ہوں"۔ تو (تو) اُن (اس شخص نے) کہا کہ آج یہاں تم

ہمارے تم مہمان ہو" یہ کہہ کے وہ شخص چلا گیا، ریچھ اور باگھ (شیر) آکر بیٹھے، ان کے (حضرت سید صاحب کے) جی میں خطرہ آیا، بعد ایک لمحے کے وہ شخص آئے حلوا لے کے، یہ بات کہی کہ "اس کو کھاؤ" اور حلوہ سو ہن بھوک اس قدر تھا کہ آپ نے کھایا اور گھوڑے کو کھلایا اور کہا کہ "یہ ریچھ اور یہ باگھ جو بیٹھے ہیں سو تمھاری چوکی کے واسطے بیٹھے ہیں، تم اپنے جی میں خطرہ نہ کرو اور رام بھجن کرتے ہو تو ہمیں ہیں صبح کو راہ بتا دیں گے"........ صبح کو حضرت (سید صاحب بانسویؒ) نماز پڑھ کے سوار ہوئے، راستے میں دو لڑکے پانچ چار بھینسیں اور پانچ چار گائیں چراتے تھے تب (تو) اُن (انھوں نے) کہا "یہ جنگل کی راہ ہے یہ آبادی کی" ایک کوس چلے تب یہ بات یاد آئی کہ رات کو انھوں نے راہ بتانے کو کہی تھی تب (تو) حضرت (سید صاحب بانسویؒ) پھر آئے اسی جگہ پر کہ جہاں لڑکے اور بھینسیں تھیں، وہاں دیکھا تو کوئی نہیں ہے، نہ لڑکے ہیں نہ گائے نہ بھینسیں ہیں، پھر آبادی کی راہ تشریف لے گئے۔ (طبع دوم ص ۱۸)

بے شک اس واقعہ کو تاریخ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، اور یہ صحیح ہے کہ اس کی حیثیت مکاشفے کی ہے جس کا تعلق عالم اجساد سے نہیں ہے عالم امثال سے ہے، پھر بھی لکھنؤ کے موجودہ لفظ کے ایک ابتدائی مرحلے پر ضمنی روشنی ضرور پڑتی ہے اور "لچھنو" سے لکھنؤ ہونے کے قیاس کو فی الجملہ مدد پہنچتی ہے۔

بہرحال لکھنؤ کی تاریخ کچھ رہی ہو، ملا قطب الدین سہالوی کا لٹا ہوا کنبہ اسی لکھنؤ کی طرف نقل سکونت کر رہا ہے، اس طرح ملا قطب کی ایک پیشین گوئی بھی پوری ہو رہی تھی جو اپنے اسی سنجھلے بیٹے کے سلسلے میں جو لٹے ہوئے کنبے میں چودہ سالہ یتیم کی حیثیت سے شامل تھا، انھوں نے کی تھی،

اس سنجھلے بیٹے کے بارے میں روایت ہے کہ:

در سن صغر سالگی بغایت بیمار شد بحدیکہ
مردان امید از زیست وے بر داشتند
و زنان و مردان خانہ گریہ آغاز کردند
آواز گریہ و زاری چوں بسمع مولانا رسید
بخانہ تشریف آوردند و تفحص حال فرزند ارجمند
خود ساختند بدریافت شدت مرض و
روئیۃ حال و ملاحظہ اضطراب اختلال
مردماں ملائے بخاطر مبارک راہ یافتہ اند بیکے
سر بجیب تفکر نہادند بعد ازاں بوالدۂ خود
گفتند کہ ہیچ جائے وسواس نیست انشاء
اللہ تعالیٰ ازیں مرض صحت خواہد یافت
و بہ لکھنؤ استقامت خواہد دارند

بچپن میں انتہائی شدید بیمار ہوئے کہ لوگوں کو امید
زیست باقی نہ رہی، گھر کی عورتوں اور مردوں نے
رونا دھونا شروع کر دیا، ان کی گریہ وزاری جب
ملا قطب شہید کی سماعت میں آئی تو مکان کے اندر
تشریف لائے اور فرزند ارجمند کے مزاج کا حال پوچھا، مرض
کی شدت اور حالت کے بگڑنے کو دیکھا اور گھر والوں
کی گھبراہٹ اور بد حواسی ملاحظہ فرمائی تو قلب مبارک
پر اثر ہوا، تھوڑی دیر سر جھکائے رہے، پھر سر اٹھا کر
اپنی والدہ ماجدہ سے فرمایا، گھبرانے کی کوئی بات
نہیں ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اس بیماری سے یہ اچھا
ہو جائے گا اور لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار
کرے گا۔

(عمدۃ الوسائل قلمی)

پھر یہ "شدید بیمار بیٹا" صحت یاب بھی ہوا، اپنے والد ماجد سے پڑھا بھی اور جب والد ماجد کی شہادت واقع ہوئی تو ان کا یہ فرزند جو اب چودہ سالہ یتیم تھا۔ اپنے باپ کی لاش کے ساتھ دشمنوں کے قبضے میں کئی روز سہالی سے دور رہا، قرب و جوار کے شرفا جو سہالی سے تین تین چار چار میل پر واقع فتح پور اور دیوا کے زمیندار تھے، خوشامد درآمد کر کے اس چودہ سالہ ستم زدہ کو بمشکل اشقیا سے چھڑا کر لائے، چودہ سال شعور کی عمر ہوتی ہے، اس چودہ سالہ یتیم کے یہ چار پانچ دن کیسے گزرے ہونگے، کہ ایک طرف مقتول عالی مرتبت باپ کے بے گور و کفن لاشے کے ساتھ کشاں کشاں ادھر سے ادھر

لے جایا جارہا ہے، دوسری طرف اپنی آنکھوں سے گھر بار کو لٹتا ، چھینکتا، حقیقی بھائی کو زخمی اور ماں، دادی، بھاوج جس کے تصور سے، روح لرزنے لگتی ہے، صبر دینے والا ہی ایسے سانحات پر توفیق صبر نہ دے تو دنیا کی بڑی آبادی غموں ہی سے ہلاک ہو جائے،

قضا و قدر کے فیصلے بھی بظاہر عجیب ہوتے ہیں، کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ دو بڑے بھائی جن کی رسائی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار تک تھی، جن کی تعلیم والد ماجد کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی، جو بال بچوں والے ہو کر باپ کے معاملات میں رفیق اور سہیم کی حیثیت کے مالک تھے، وہ تو بادشاہ تک رسائی حاصل کر کے تاریخ میں ایسے گمنام ہو جائیں، اور یہ چودہ سالہ یتیم جو ہر طرح بے دست و پا ہو، اس طرح باپ کا جانشین اور ان کے نام کو روشن کرنے والا ثابت ہو کہ باپ ہی کا نہیں، بھائیوں کا، ان کی اولاد کا اور پورے کنبے کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت کر جائے، اور وہ نہ صرف اپنے کنبے کا نام اونچا کرے بلکہ علمی دنیا کو ایسی راہ دکھا جائے کہ تین سو سال گزر جانے اور علمی دنیا میں سینکڑوں انقلابات آنے کے باوجود، بار بار نہیں تو گاہ گاہ علم کے طلبگاروں کی نگاہیں اس راہ کو تکتی نظر آئیں۔

ملا قطب شہید کا یہی چودہ سالہ یتیم ہے جسے آج دنیا بانی درس نظامی، استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی کے نام کے ساتھ عقیدت و احترام سے یاد کرتی ہے۔

سائنس اور اسلام

از جناب محمد شہاب الدین صاحب ندوی بنگلوری

نوٹ:۔ یہ مقالہ ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء میں دی اسلامک سوسائٹی آف انڈیا مدراس کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں "اسلام موجودہ سائنس کی ترقی کی روشنی میں" کے عنوان سے پڑھا گیا۔

مضطرب باغ کے ہر غنچہ میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

اسلام کی آفاقیت اسلام دوسرے مذاہب کی طرح کوئی مردہ مذہب نہیں اور یہودیت وعیسائیت کی طرح کوئی موقت اور عارضی دین نہیں بلکہ قیامت تک باقی و برقرار رہنے والا ایک زندہ اور لازوال مذہب ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے کسی بھی مذہب نے نفیاً یا اثباتاً اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا پیغام پوری نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی وشافی، جامع ومکمل، عالمگیر و آفاقی، اور دائمی اور ابدی ہے۔ اسلام صاف اور کھلے ہوئے الفاظ میں یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں وہی ایک سچا، برحق اور ہمیشہ باقی رہنے والا مذہب ہے، جو دلیل وحجت کے ذریعہ نہ صرف تمام ادیانِ عالم پر غالب رہے گا بلکہ قیامت تک ہر زمانے کی عقلیت اور اس کے علمی تصورات ونظریات پر بھی بھاری رہے گا، خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ، حکمت و دانش ہو یا کسی قسم کا خود ساختہ "ازم" (ism)۔

اسلام کے دعوے آگے بڑھنے سے پہلے اسلام کے بارے میں چند بنیادی تصورات کو سمجھ لیا جائے۔

جو اس نے اپنے بارے میں کیے ہیں :۔

۱۔ وہ اپنے آپ کو پوری نوع انسانی کا ہادی و رہبر قرار دیتا ہے :

ھدًی للنّاس وبیّنٰت من الھدٰی	(یہ قرآن) نوع انسانی کے لیے ہدایت نامہ ہے
والفرقان	اور (اس میں) ہدایت اور حق و باطل میں تمیز کے
(بقرہ : ۱۸۵)	دلائل موجود ہیں ،

دوسری جگہ ہے :

ان ھو الا ذکر للعٰلمین (ص۔ ۸۷)	یہ تو سارے جہاں کے لیے ایک درس ہے

۲۔ وہ ایک مکمل دین و مذہب ہے :۔

الیوم اکملتُ لکم دینکم واتممت	آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا
علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلامَ	اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے
دیناً　(مائدہ : ۳)	اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پسند کیا ۔

۳۔ اس کا سرکاری صحیفہ (قرآن) نوع انسانی کے لیے ایک جامع اور کافی وشافی صحیفہ ہے :

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتٰب	کیا ان لوگوں کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے
یتلیٰ علیھم ان فی ذٰلک رحمۃ	تم پر ایسی کتاب اتار دی ہے جو انھیں پڑھ کر
وذکریٰ لقوم یؤمنون	سنائی جاتی ہے ؛ یقیناً اس میں ایمان لانے والوں
(عنکبوت : ۵۱)	کے لیے رحمت و بصیرت موجود ہے ۔

۴۔ صرف وہی دائمی مذہب ہے ، اس کے علاوہ دوسرے تمام ادیان اپنے اپنے زمانے کے لیے تھے ، جن کی ضرورت اسلام کے بعد باقی نہیں رہی :

ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً	اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہیگا

فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ تو وہ غیر مقبول ہوگا اور وہ آخرت میں
من الخٰسرین (آل عمران ۔ ۸۵) ناکام رہے گا ۔

۵ ۔ دلیل و حجت کے ذریعہ تمام ادیان پر غالب رہے گا اور کوئی مذہب علمی و عقلی حیثیت سے اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا :

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق
ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ دے کر بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے
ولو کرہ المشرکون (صف ۔ ۹) اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں

اسلام کی خود کفیلی | یہ اسلام کے وہ بنیادی تصورات ہیں جن کا دعوی دنیا میں اسلام کے سوا آج تک کسی مذہب نے نہیں کیا ، اس کی ساری تعلیمات ان ہی بنیادوں پر مبنی ہیں ، یہ تعلیمات خواہ عقائد سے متعلق ہوں یا عبادات سے ، تہذیب نفس سے تعلق رکھتی ہوں یا معاشرت و سیاست سے ، وسیع آفاقی بنیادوں پر استوار کی گئی ہیں ، جو اس کے عالمگیر اور بین الاقوامی مذہب ہونے کی دلیل ناطق ہے ۔

اسلام ہر لحاظ سے ایک مکمل اور خود کفیل (Self - sufficient) مذہب ہے وہ اپنی کسی چیز میں کسی دوسرے نظام کا محتاج نہیں ، جس پر مسلمانوں کا ۱۴ سو سالہ دور حکومت شاہد ہے ، چنانچہ ان کو اپنے کسی معاشرتی ، ملکی ، سیاسی اور تمدنی معاملہ میں دوسری اقوام سے قوانین مستعار لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی ، جس طرح عیسائیوں کو اپنے دور حکومت میں ، اپنے مذہب کی تنگ دامانی کی بنا پر رومیوں کے قوانین (Roman law) سے استفادہ کرنا پڑا ، اس سے ایک امّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین متین کے حیرت انگیز اعجاز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

اسلام کا انقلابی نظریہ اسلام کا بنیادی مقصد روح کا تزکیہ و تطہیر، انسانی افکار و تصورات کی تہذیب، غلط نظریات و مفروضات کی تنقیح، خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق کی استواری، حقوق العباد کا تحفظ، اخلاقی خصائل کا احیاء، جبر و استبداد کا استیصال، کائنات میں پھیلی ہوئی گمراہیوں کا خاتمہ، عالمگیر اور بین الاقوامی امن و امان، ایک صالح، پاکیزہ اور مثالی معاشرۂ انسانی (Human Society) کا قیام تھا، جس میں تمام افراد انسانی کے یکساں حقوق و فرائض ہوں، اور ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق مٹ جائے اور سب کے سب صحیح معنی میں خدا کے بندے بنکر ایک دوسرے کے دوش بدوش مصروف عمل ہو جائیں۔

مگر یہ ہمہ گیر معاشرتی و تہذیبی انقلاب اس وقت تک برپا نہیں ہو سکتا تھا جب تک فکری و نظریاتی انقلاب برپا نہ کیا جائے، اس کے لیے اس نے عالم انسانی کی ذہنی دھلائی (Brain washing) کی اور اس کے دل و دماغ میں چند بنیادی تصورات و اعتقادات کو راسخ کر کے خود ساختہ تخیلات و مفروضات کی تاریکی سے باہر نکالا اور اس کے دل و دماغ میں خدا پرستی کا صحیح تصور قائم کیا، اس کے یہ بنیادی عقائد حسب ذیل ہیں :-

اسلام کے بنیادی عقائد (۱) انسان اس دنیا میں ایک آزاد و بے مہار ہستی یا ڈاروِن (Darwin) کے نظریۂ ارتقاء (Evolution) کے مطابق کوئی "بڑھیا جانور" نہیں ہے، کہ جو جی میں آئے کر ڈالے، بلکہ ایک ذمہ دار اور جوابدہ ہستی ہے، قرآن نے اس ذمہ داری اور جوابدہی کی تعبیر "خلافت" کے لفظ سے کی ہے :

هو الذی جعلکم خلٰئف فی الارض	وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا
فمن کفر فعلیه کفره	پس (اب) جو کوئی (اس خلافت الٰہی سے)
(فاطر - ۳۹)	انکار کریگا تو اسکے انکار کا وبال اسی پر ہوگا۔

(۲) یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آگئی، بلکہ ایک زبردست قدرت والی علیم وخبیر ہستی نے ایک اسکیم اور منصوبہ بندی کے تحت اس کی تخلیق کی ہے۔

خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق	اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حکمت کے ساتھ
ان فی ذلک لاٰیۃ للمؤمنین	پیدا کیا ہے، یقیناً اس میں اہل ایمان
(عنکبوت۔ ۴۴)	کے لیے ایک نشانی ہے۔

(۳) یہی خلاق ہستی اس کائنات کی ناظم، مدبر، مالک اور حاکم ہے اور تمام مظاہر فطرت اس کے قبضہ وتصرف میں ہیں، اسی کو مذہب کی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں، قرآن مجید میں اس ناظم و مدبر ہستی کو رب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کا ناقص مفہوم اردو زبان میں مربّی اور انگریزی میں Lord کے لفظ سے ادا ہو سکتا ہے۔

(۴) اس نے یہ پورا کارخانۂ عالم کامل نظم وضبط اور حکمت ومصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے جو ایک دن اجڑ جائیگا، اور تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرکے ان کے اعمال کا محاسبہ کیا جائیگا، اور ہر ایک کو اس کے اچھے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا، اسلامی اصطلاح میں اس عظیم دن کو قیامت کہتے ہیں۔

(۵) چونکہ انسان کو اس دنیا میں مکلف اور ذمہ دار (Responsible) قرار دیا گیا ہے، اس لیے اس کی ہدایت ورہبری کے لیے نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری کیا گیا، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام ومرضیات اس کے بندوں تک پہنچائے جائیں۔

(۶) اسلام ـــ بلکہ بنیادی طور پر تمام انبیائے کرام کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وسیع وعریض کائنات میں صرف ایک ہی رب (مربی یا Lord) ہے جو ساری مخلوقات کی ضروریات کا کفیل اور ان کے اعمال وافعال کا نگراں ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی

اس کی ربوبیت میں شریک وسہیم نہیں، اس لیے اسلام کا یہ مطالبہ بالکل فطری اور منطقی ہے کہ جب سارے جہاں کا رب ایک ہے تو سارے جہان کا الٰہ (معبود ومسجود) بھی ایک ہی ہونا چاہیے، جب ربوبیت میں کوئی اس کا شریک وساجھی نہیں ہے تو پھر الوہیت میں بھی اس کا کوئی حصہ دار نہ ہونا چاہیے، قرآن کی ساری تعلیمات کی بنیادی روح یہی ہے،

اسلام کے ان بنیادی تصورات کو مختصر طور پر توحید، رسالت اور معاد (یوم جزا) کے تصورات کہہ سکتے ہیں، یہ دین متین کے تین بنیادی ستون ہیں جن پر اسکی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلام کا کارنامہ ان بنیادی اور اہم ترین عقائد کو تسلیم کیے بغیر نہ عالم انسانی کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو سکتا ہے، اس لیے اسلام نے سب سے پہلے ان ہی عقائد کی تنقیح کی ہے، مگر وہ دوسرے مذاہب کی طرح اپنے عقائد کو جبر وتحکم سے نہیں منواتا بلکہ اس کی حکیمانہ تشریح کرتا اور ان کو علمی وعقلی اور آفاقی وانفسی دلائل وبینات کی روشنی میں سمجھاتا ہے اور کسی الجھن، تشکیک، فکری انتشار اور لاادریت (Agnosticism) کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا، اسلام کے یہ دلائل حد درجہ علمی، سائنٹفک اور ہر زمانے کی ذہنیت کے مطابق قطعی مسکت اور فیصلہ کن ہیں، جس کا کوئی ادنیٰ تصور بھی ہمیں موجودہ توراتؔ (Old Testament) یا موجودہ انجیل (New Testament) میں نہیں ملتا۔ ان صحیفوں میں علمی وعقلی دلائل اور آفاقی وانفسی (Scientific) شواہد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، دلائل وشواہد تو بعد کی چیز ہیں، ان میں بنیادی عقائد ہی کا کوئی جامع وواضح تصور نہیں ملتا، اس لیے یہ صحیفے آوٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں اور ان میں موجودہ حالات کے مقابلہ اور عصر حاضر کی ذہنیت کے مطابق انسان کی فکری وعملی اصلاح اور ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے،

ان کے مقابلہ میں اسلام ایک دائمی اور بین الاقوامی مذہب ہے، اس لیے اسکے صحیفے

میں قیامت تک ہر زمانے کی ذہنیت اور اس کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ وہ قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کرسکے، اور خدا پرستی اور انسانیت کی اقدار (Human values) کا احیا، اور باطل وظلم وعدوان کا ابطال کرتا رہے، اور پورا عالم انسانی ایک معاشرہ (Society) اور ایک خاندان بن جائے جس میں اولادِ آدم امن وامان اور سکون وطمانیت کی زندگی بسر کرسکے۔

کائنات اور اسلام | اس زندہ مذہب کی زندہ کتاب میں کائنات (Universe) کے حقائق (متعلقاتِ سائنس) سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ پہلا اور آخری مذہب اور آسمانی صحیفوں میں قرآن ہی وہ واحد صحیفہ ہے جو انسان کو کائنات اور اس کے نظام (System) میں غور وفکر کے ذریعہ عبرت وبصیرت حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے، اور اپنے پیش کردہ عقائد وتعلیمات کی حقانیت کے اثبات کے لیے کائنات اور اس کے نظام کو بطور دلیل پیش کرتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پوری کائنات ایک عظیم حکمت ومصلحت اور کامل منصوبہ کے تحت پیدا کی گئی ہے، محض بخت واتفاق کے طور پر (by chance) ظہور پذیر نہیں ہوگئی، اور آج سے چودہ سو سال پہلے اس منصوبہ بندی کے تمام بنیادی اصولوں کو قرآن مجید میں لکھا جاچکا ہے، جب ان نظریات وتصورات کا دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا، اور آج بیسویں صدی میں یہ منصوبہ قرآن کی صداقت کو جانچنے کا نہایت آسان طریقہ ہے،[1] اس لیے اس کی تفصیل پیش کیجاتی ہے۔

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سائنس ہر چیز کی صحت وصداقت جانچنے کا معیار ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسلامی عقائد اس قدر فطری اور مطابق واقعہ ہیں کہ ان کی تصدیق قانونِ فطرت میں بھی موجود ہے، اور جیسے جیسے سائنسی تحقیقات آگے بڑھتی جائیں گی، عقائد اسلامی کی حقانیت بھی واضح ہوتی چلی جائے گی۔

کائنات اور دیگر مذاہب اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ آتا ہے کہ اس خارجی دنیا اور اس وسیع و عریض کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ مختلف مذاہب اور دانشوروں نے اس سوال کے مختلف جوابات دیئے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ یہ کائنات دیوتاؤں کی رزم آرائیوں کا نتیجہ ہے، کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں خیر و شر کی الگ الگ حکومتیں قائم ہیں اور ہر طرف دوئی ہی دوئی ثنویت یا (Dualism) نظر آتی ہے، کسی کا خیال ہے کہ یہ کائنات محض بخت و اتفاق سے وجود میں آگئی ہے، اس کا کوئی خالق و ناظم نہ پہلے تھا، نہ اب ہے، کسی کا دعویٰ ہے کہ جدید سائنٹفک حقائق نے دین و مذہب کی چولیں ہلا دیں اور موجودہ دنیا میں خدا اور مذہب کی کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔

اس قسم کے لادینی نظریات زیادہ تر عیسائی علماء کی کوتاہ بینی کا نتیجہ ہیں۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا (Church) والوں نے ارسطو اور بطلیموس وغیرہ یونانی حکماء کے بعض نظریات و مفروضات کو عیسائیت اور بائبل کے مسلّمہ عقائد (سرکاری معتقدات) قرار دیدیا، اور کائنات کے نئے انکشافات کا انکار اور تجربہ و مشاہدہ کی تکذیب کی جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، اہل کلیسا کے اسی غلط روش کا ردعمل مادیت (Materialism) یا فطرت پرستی (Naturalism) کی شکل میں ظاہر ہوا جس کے سنگین نتائج سے آج پورا عالم انسانی دوچار ہے۔

سائنس اور قرآن لیکن اسلام کے نزدیک یہ پوری کائنات ایک ہمہ گیر اسکیم اور منصوبہ بند نظام کا نتیجہ ہے، اور اس کے ذرہ ذرہ میں ارباب بصیرت کے لیے خدا کے وجود، اسکی وحدت و یکتائی قدرت و ربوبیت اور حکمت و مصلحت کے ناقابل انکار دلائل اور نشانیاں ہیں۔

ان فی خلق السمٰوٰت والارض زمین و آسمانوں کی تخلیق میں، دن رات

واختلاف الّیل والنھار
والفلک التی تجری فی البحر
بما ینفع الناس وما انزل اللہ
من السماء من ماء فاحیا بہ
الارض بعد موتھا وبث فیھا
من کل دابۃ وتصریف الریاح
والسحاب المسخر بین السماء
والارض لآیٰت لقوم یعقلون
(بقرہ - ۱۶۴)

کے ہیر پھیر میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے
مفاد کی خاطر سمندر میں چلتی ہیں، اس پانی میں
جس کو اللہ (سمندروں سے بخارات کی شکل
میں نکال کر ایک خاص) بلندی سے برسا دیتا
ہے، پھر اس پانی کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ
کر دیتا ہے (جس کے باعث وہ لہلہاتے ہوئے
سبزہ زاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے) ان تمام
جانداروں میں جن کو اس نے اس (دھرتی کے سینے)
پر پھیلایا ہے، ہواؤں کے (نظام) اور بادلوں میں
اور اس بادل میں (جو بغیر کسی سہارے کے ایک خاص
بلندی پر) زمین و آسمان کے درمیان ٹھہرایا ہوا ہے
(غرض ان تمام مظاہر فطرت میں) عقل و دانش
والوں کے لیے (اللہ کی توحید اور اسکی قدرت و ربوبیت
کے بے شمار) نشانات و دلائل موجود ہیں۔

اس قسم کی آیتیں قرآن حکیم میں بکثرت ہیں جن میں اسلوب بدل بدل کر انسان کو نظام کائنات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام سائنسی تحقیقات کو دین و مذہب کے خلاف تصور نہیں کرتا، ورنہ اس قسم کی ہدایات کبھی نہ دیتا۔ اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ قرآن حکیم کی کل آیات ۶۶۱۶ ہیں جن میں احکام سے متعلق پانچ سو آیات ہیں، (الاتقان فی علوم القرآن)، اور نظام کائنات یا متعلقات سائنس پر ساڑھے سات سو آیات ہیں

(الفوز الکبیر)۔ امام الائمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآنی علوم کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے (۱) علم احکام (۲) علم مناظرہ (۳) علم آلاء اللہ (۴) علم ایام اللہ (۵) اور علم آخرت (الفوز الکبیر)۔ یہ ایک اصولی اور فلسفیانہ تقسیم ہے۔ ہم علم آلاء اللہ کو موجودہ زبان میں علم کائنات یا علم سائنس کہہ سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک علوم کائنات کی کتنی اہمیت ہے۔

سائنس اور مسلمان | یہ ان ہی آیات کا نتیجہ تھا کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے کائنات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کی طرف توجہ کی جس کی بدولت موجودہ سائنس کی بنیاد پڑی اور مسلمان سائنسدانوں نے جغرافیہ، ریاضی، فزکس، کیمسٹری، فلکیات (Astronomy) بیالوجی اور طب وغیرہ میں شاندار کارنامے انجام دیے اور دنیا کو نئے نئے علوم و فنون سے آشنا کیا۔ اس دور کے مشہور سائنسدانوں میں جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن ہیثم، بوعلی سینا، ابوریحان البیرونی، ابن نفیس اور ابوالقاسم الزہراوی وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن کی بلند پایہ تحقیقات اور شہرۂ آفاق تصنیفات پر جدید سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

بہرحال قرون وسطیٰ میں جب نئے نئے علوم و فنون کی اشاعت ہوئی تو اس سے نئے نئے علمی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جنھیں سلجھانے اور علمی دنیا کی رہنمائی کرنے کے لیے علماء کا ایک طبقہ میدان میں آیا، ان میں سب سے مشہور امام غزالی، امام رازی، اور امام ابن تیمیہ وغیرہ ہیں۔ ان علماء اور مفکرین نے اپنے دور کے "علوم جدیدہ" میں غور و خوض کرکے اپنے دور کی ذہنیت کے مطابق علمی و سائنٹفک دلائل کی تدوین کی، جن کو قرآن کی اصطلاح کے مطابق "آیات اللہ" (خدائی نشانات و دلائل) کہا جا سکتا ہے، اس کی ایک واضح اور شاندار مثال تفسیر کبیر ہے۔

اس طرح مسلمانوں میں شروع ہی سے دو گروہ رہے ہیں: ایک کائنات اور علوم کائنات کی چھان بین میں لگا رہا اور دوسرا "آیات اللہ" کی تحقیق و تفتیش میں، اس بارہ میں مسلمانوں کا فکر و نظر ہمیشہ صاف، سیدھا اور متوازن رہا، اور فلاسفہ کے برعکس کسی مسلمان فرقے نے سائنس یا علوم کائنات کو کبھی مذہب کے خلاف نہیں سمجھا، بلکہ اس دور میں سائنس ہمیشہ مذہب کی تابع رہی اور ایک دوسرے کے تعارض و تضاد کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو سکا، جو اسلام کی صحیح رہنمائی کا نتیجہ تھا،

مادیت اور اسلام مگر یہ دنیا کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ جب علم و فن کی باگ مسلم حکومتوں کے زوال کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن گئی، اور پندرہویں صدی کے بعد علم و دانش کی شمع مغربی ممالک میں روشن ہوئی تو اہل کلیسا کی نااہلی کی بنا پر سائنس اور مذہب میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا، اگرچہ یہ ٹکراؤ مصنوعی اور غیر حقیقی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان ہی غلط نظریات و تخیلات نے آج ایک عالمگیر تصادم کی شکل اختیار کر لی، اور آج دنیا میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے، جو ان غلط نظریات و اوہام کی تردید کر کے علمی و عقلی اور سائنٹفک انداز میں مادیت و نیچریت اور الحاد و دہریت کا مقابلہ کر سکے،

خود ساختہ عقائد کی مذمت جیسا کہ اوپر گذر چکا، اسلام پوری کائنات کو اپنے دعووں کی دلیل اور اپنے عقائد و تعلیمات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے، اس سے اس کے دعووں کی صحت و صداقت عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ تک پہنچا تی ہے، اس لیے وہ علوم کائنات کی ترقی کا اولین داعی اور نقیب ہے، اور ان لوگوں کو جو صحیح عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کر کے پرانی روایات و رسوم پر عمل کرتے ہیں چوپایوں سے تشبیہ دیتا ہے،

اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت   کیا انھوں نے زمین و آسمانوں کی بادشاہت

والارض وما خلق الله من شيء
وعسىٰ ان يكون قد اقترب
اجلهم فبأي حديث بعده
يؤمنون
(الاعراف - ۱۸۵)

اور مخلوقات الٰہی کو بغور نہیں دیکھا؟ بہت ممکن
ہے کہ زندگی اس بے حسی وبے بصری کی بنا پر)
ان کا وقت قریب آگیا ہو تو اب اس (واضح
اور سائنٹفک طریقے کے بعد) آخر وہ کس چیز پر
(اور کس طرح) ایمان لائیں گے۔

ولقد ذرأنا لجهنم كثيراً من
الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون
بها ولهم اعين لا يبصرون بها
ولهم آذان لا يسمعون بها اولٰئك
كالانعام بل هم اضل (اعراف: ۱۷۹)

اور ہم نے جہنم کو بھرنے کے لیے بہت سے ایسے جن
اور انسانوں کو پیدا کیا ہے جو دل رکھنے کے باوجود
سمجھتے نہیں، آنکھیں ہونے کے باوجود دیکھتے نہیں اور
کان ہونے کے باوجود سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں
جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔

وجود باری | ان وضاحتوں کے بعد اسلام کے بعض بنیادی عقائد وتصورات پر جدید سائنس کی روشنی میں نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلے اثبات باری تعالیٰ کے مسئلہ کو لیجئے، قرآن کہتا ہے:

ومن آيٰته خلق السمٰوٰت والارض
وما بث فيهما من كل دابة
(شوریٰ: ۲۹)

اور اس کے نشانات (وجود وقدرت) میں سے
یہ بات کہ اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ان
دونوں میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیے۔

اس آیت میں "دابۃ" (جاندار ہستی) کے وجود کو خدا کے وجود کی دلیل قرار دیا گیا ہے، جدید سائنس بھی طویل تحقیق و تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہو کہ تمام حیوانات و نباتات کی تخلیق نخزمایہ (Protoplasm) سے ہوئی ہے، جس کے کیمیائی (Chemical) اجزاء آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن اور نائٹروجن وغیرہ بھی دریافت کر لیے گئے ہیں مگر

انتہائی کوشش کے باوجود پوری دنیا کے سائنس کو ان کیمیائی اجزاء وعناصر (Elements) کو باہم ملاکر پروٹوپلازم بنا لینے میں کامیابی نہ ہوسکی، وہ ان اجزاء وعناصر کو لاکھ طرح سے ملاتی ہے مگر پروٹوپلازم نہیں بنتا جو "زندگی" کی اکائی (Unit) یا بنیادی اینٹ ہے۔ ایک سائنسدان نے پورے پندرہ سال تک ان عناصر کو ہر ہر طرح ترکیب دینے کی کوشش کی، مگر اس میں "زندگی" کی کوئی رمق بھی نمودار نہ ہوئی، اس سے مادیت ودہریت کا یہ دعوی باطل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا ظہور بغیر کسی خالق (Creator) کے خود بخود ہوگیا ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم ہست وبود میں ایک باارادہ واختیار ہستی کی کارفرمائی جاری وساری ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے

فعّال لما یرید یعنی وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

اس سے چارلس ڈارون (Darwin) اور اس کے ہمنواؤں کا نظریۂ ارتقاء (Evolution) بھی مردود قرار پاتا ہے، ظاہر ہے کہ جب بغیر کسی خالق وفاعل کے ایک خلوی (Unicellular) جاندار ہی کا وجود ممکن نہیں تو پھر پیچیدہ انواع (Multicellular Species) کا وجود بغیر کسی خالق کے کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

اثباتِ قیامت | یہ قرآن حکیم کے بے شمار آفاقی دلائل (وہ سائنٹفک شواہد جو اس کارخانۂ فطرت میں انسان کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں) میں سے صرف ایک دلیل ہے، اس سے قرآن کے علمی وسائنٹفک دلائل کی نوعیت واہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اب کائنات کے اختتام یا اثباتِ قیامت پر بھی ایک سائنٹفک دلیل ملاحظہ ہو، قرآن کہتا ہے:

والشمس کوّرت واذا النجوم جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور

انکدرت (تکویر - ۱ - ۲) جب ستارے پراگندہ ہو جائیں گے۔

اس مقام پر سورج کو یوم جزا کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، اور جدید سائنس قرآن عظیم کے اس دعوے کی صداقت پر بھی مہر تصدیق ثبت کر چکی ہے، چنانچہ سائنسداں طویل غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سورج اور دوسرے ستاروں میں جو روشنی اور حرارت پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام اجرام ہائیڈروجن گیس کے بنے ہوئے ہیں، سورج کے بطن میں تقریباً دو کروڑ ڈگری حرارت پائی جاتی ہے، اس زبردست حرارت و تپش میں ہائیڈروجن عمل فیوژن (ایک ایٹمی عمل) کے طور پر جل کر مسلسل ہیلیم گیس میں تبدیل ہوتی جارہی ہے، اور ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب اس کی ساری ہائیڈروجن ختم ہو جائے گی، اور وہ ایک سرد و بیجان جسم کی طرح ایک طرف لڑھک جائے گا، اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف ایک سکنڈ میں سورج کے وزن میں دو ملین ٹن (فی یوم پونے دو کھرب ٹن) کی کمی واقع ہو رہی ہے، اگرچہ سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے، مگر ایک نہ ایک دن اس کا سارا ایٹمی ایندھن (fuel) اور توانائی (energy) ختم ہو لازمی ہے، اس کے لیے امریکی سائنسداں جارج گیمو کی کتاب "سورج کی پیدائش اور موت" (The birth and death of the sun) وغیرہ ملاحظہ ہو۔

غرض سورج کا اختتام کائنات کے اختتام کا دیباچہ ہے، جس کو قرآن ان الفاظ میں بہت پہلے کہہ چکا ہے: اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت۔

اثبات رسالت | ان مثالوں سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ اس عالم رنگ و بو میں ایک علیم و خبیر ہستی کا وجود ہے، اور قرآن کسی انسان کا تراشیدہ کلام نہیں ہے، ورنہ وہ اسقدر

لازوال سچائیوں سے لبریز نہ ہوتا، مغربی علماء و فضلاء ظہور اسلام کے زمانے کو "تاریک دور" (Dark ages) سے تعبیر کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس تاریک دور میں سفیر وحی الٰہی کے اور بغیر ایک ہمہ دان و ہمہ بیں ہستی کی رہنمائی کے رسمی علوم سے ایک ناواقف امی[1] (فداہ ابی و امی) نے اس قدر صحیح، یقینی اور بے خطا طور پر سائنٹفک حقائق اور اسرار کائنات کو ٹھیک ٹھیک نشاندہی کیسے اور کیونکر کر دی؟ کیا اس قسم کی کوئی دوسری مثال پورے انسانی لٹریچر میں موجود ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول تھے، اور اسلام ایک سچا اور برحق مذہب ہے، جس کی صداقت روز بروز عیاں ہوتی جاتی ہے، جیسا کہ کلام مجید کا ارشاد ہے:

سنریهم آیٰتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق اولم یکف بربک انه علی کل شیٔ شهید (حٰم سجدہ : ۵۳)	ہم ان (منکرین حق) کو اپنے نشانات و دلائل دکھا دیں گے۔ ان کے چاروں طرف بھی اور خود ان کی ہستیوں میں بھی تا آنکہ ان پر پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ (کلام) برحق ہے، کیا یہ بات (ان کی تشفی کے لیے) ناکافی ہے کہ تیرا رب (اس عالم آب و خاک کی) ہر چیز سے آگاہ ہے

قرآن اور کائنات کی ہمنوائی

شروع میں عرض کیا گیا ہے کہ تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور ان کا لب لباب توحید، رسالت اور یوم جزا کا عقیدہ ہے، اوپر کے مباحث سے یہ تینوں باتیں ثابت ہو گئیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کائنات منظم و مربوط طور پر تخلیق کی گئی ہے، اس کے طبعی (Physical) کیمیائی (Chemical) اور حیاتیاتی (Biological)

---

[1] آج رسالت محمدی کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے امیت کو ثابت کرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اصول وضوابط میں کسی قسم کا انتشار اور بدنظمی نہیں ہے، جو یقیناً ایک عظیم ہستی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، ان منظم ضوابط کی تعبیر قرآن میں "میزان" کے لفظ سے کی گئی ہے۔

الله الذی انزل الکتٰب بالحق
والمیزان ومایدریك لعل
الساعة قریب (شوریٰ : ١٧)

اللہ ہی نے کتاب اور میزان کو ٹھیک ٹھیک
مطابقت کے ساتھ اتارا ہے اور تجھے کیا خبر کہ
وقت موعود (قیامت) قریب ہی ہو۔

یہاں میزان سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز نپی تلی ہے، اور اس کے تمام قوانین منضبط ہیں، خواہ وہ مادی دنیا سے متعلق ہوں یا روحانی کائنات سے۔

فارجع البصر هل تریٰ من
فطور (ملک)

(کائنات میں) دوبارہ نظر ڈال کر دیکھ لو
کیا تمھیں کوئی بدنظمی نظر آرہی ہے؟

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر ایک زبردست ہستی کے ماتحت اور کنٹرول میں جاری وساری ہیں، اور یہاں کوئی چیز بھی خواہ وہ کسی قسم کا مادہ (Matter) ہو یا توانائی (Energy) اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتی

ولہ من فی السمٰوٰت والارض
کل لہ قانتون (روم۔ ٢٦)

اور زمین و آسمانوں میں جو کوئی (اور جو کچھ) بھی ہے
سب اسی کا ہے، ہر ایک اسکی بارگاہ میں جھکے ہوئے ہیں

ایک شاعر نے بہت خوب کہا ہے ؎

للہ فی کل تحریکة　　وفی کل تسکینة لہ شاھد
وفی کل شیٔ لہ آیة　　تدل علی انہ واحد

یعنی دنیا کی ہر چیز اور اس کا ہر ایک سکون و حرکت خدا کے وجود اور اسکی وحدانیت پر شاہد ہے۔

اسلام کا مطالبہ اس لیے اسلام کا مطالبہ ساری نوع انسانی سے یہ ہے کہ جب ساری کائنات اور اس کے کل مظاہر خدائے قادر و توانا کے آگے جھکے ہوئے اور تکوینی (Natural) حیثیت سے اسی کی اطاعت و بندگی میں لگے ہوئے ہیں تو پھر انسان بھی — جو کہ تکوینی حیثیت سے پہلے ہی سے اس کا مسخر ہے — تشریعی (Moral) حیثیت سے بھی اسی برتر و عظیم ہستی کی الوہیت کو مان کر حیاتِ جاودانی کا مستحق بن جائے، اس سے کائنات میں یکسانی و یکرنگی پیدا ہو جائے گی اور دونوں کا نغمہ و ساز ایک ہو جائے گا،

افغیر دین اللہ یبغون ولہ	کیا یہ منکرین دین الٰہی کے سوا کسی دوسرے دین
اسلم من فی السمٰوٰت والارض	کی تلاش میں ہیں ؟ حالانکہ زمین و آسمان میں جو کوئی
طوعاً و کرھا والیہ یرجعون :	بھی ہے سب خوشی یا ناخوشی اسی کا مطیع و فرمانبردار
(آل عمران - ۸۳)	ہے ، اور سب اسی کے پاس لوٹ کے جا رہے ہیں -

اس آیت میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ جب اس کائنات کی ہر چیز "مسلم" (مطیع و فرمانبردار) ہے تو پھر انسان کو بھی اسی کا مطیع و فرمانبردار بن جانا چاہیے ،

نظام ربوبیت یہاں پر یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ کائنات کا یہ نظم و ضبط اور اس کے ہمہ گیر اصول و ضوابط محض ربوبیت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر جلوہ افروز ہو رہے ہیں ، اگر ان میں بدنظمی و انتشار رہتا تو ربوبیت بھی ثابت نہ ہو سکتی تھی ، کیونکہ ربوبیت کے معنی ہیں کسی چیز کو درجہ بدرجہ نشو و نما دیکر تکمیل تک پہنچانا ، اس لیے ربوبیت میں انسان حیوانات و نباتات وغیرہ جملہ مخلوقات کی ضروریات کی فراہمی اور ان کی نگرانی اور دیکھ بھال وغیرہ سب شامل ہے ، اور ہم کو سلسلۂ علل و معلولات (Cause and effect) کے روپ میں حیوانات و نباتات سے قسم قسم کے غلے ، میوے ، پھل ، ترکاریاں ، مسالے ، گوشت ، مچھلی وغیرہ

مختلف قسم کی نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں، وہ اسی ربوبیت ہی کا ایک جز اور نظام ربوبیت ہی کے ماتحت ہیں

اس لیے اسلام کا مطالبہ ہے کہ جو ہستی اس قدر رحمت و شفقت کا مظاہرہ اور اتنے عجیب و غریب اور حیرت انگیز طریقہ سے انسان کی تمام ضروریات کو پورا کر رہی ہے عقل، منطق، احسان شناسی اور انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی محسن و مشفق اور رحیم و رحمٰن ہستی سے منہ نہ موڑا جائے اور اس کی الوہیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم	لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے
الذی خلقکم والذین من قبلکم	پہلے والوں کو اس لیے پیدا کیا کہ تم اس سے ڈرو
لعلکم تتقون ہ الذی جعل لکم	(تمہارا رب) وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے
الارض فراشاً والسماء بناء وانزل	بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت اور اوپر سے پانی
من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات	برسایا پھر اس پانی کے ذریعہ تمہاری روزی کی خاطر
رزقا لکم فلا تجعلوا للہ اندادا	(قسم قسم کے) میوے اگائے، سو تم جان بوجھ کر
وانتم تعلمون۔ (بقرہ۔ ۲۱-۲۲)	کسی کو اللہ کا مقابل نہ ٹھہراؤ۔

یہاں پر دو باتیں قابل غور ہیں، ایک تو خالقِ کائنات کا تعارف رب کے لفظ سے کرایا گیا ہے جو نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلانے کا فطری اور پیارا بھرا طریقہ ہے، دوسرے آخری فقرہ اس حیثیت سے بڑا اہم اور معنی خیز ہے کہ آج پوری دنیائے سائنس غذائی مسئلہ کو سلجھانے اور مشینی طور پر پروٹینز (Proteins) اور کاربوہائیڈریٹ (Carbohydrate) وغیرہ کو جو غلہ، پھل، میوہ اور ترکاری وغیرہ کے اہم ترین اجزا ہوتے ہیں، مشینی پیمانے پر تیار کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ مگر خدا کی رزق رسانی میں فرق

نہیں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی رب ہے ، اور رہیگا، اس پر دوسرے امورِ ربوبیت کو بھی قیاس کر لیجئے۔

یا ایہا الناس اذکروا نعمۃ اللّٰہ	لوگو اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے
علیکم ھل من خالق غیر اللّٰہ	تم کو نوازا ہے۔ کیا اللہ کے سوا ایسا کوئی دوسرا
یرزقکم من السماء والارض	خالق بھی ہے، جو تم کو زمین و آسمان سے (ان
لا الٰہ الا ھو فانّٰی تؤفکون	دونوں کی قوتوں کو یکجا کرکے) کھلاتا پلاتا ہو؟
(فاطر - ۳)	(حقیقت یہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی دوسرا
	الٰہ (نرالے اور حیرتناک افعال والا) موجود
	نہیں ہے، پس تم بہکے بہکے کدھر جا رہے ہو۔

اسلام کا اصلاحی پروگرام اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے معاشرتی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے سے پہلے ایک فکری و نظریاتی انقلاب پیدا کیا، وہ باہر سے لیپا پوتی [illegible] اور بیرونی تبدیلیاں کرنے سے پہلے اندرونی طور پر دل و دماغ کو دھو کر اندر سے انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے، ظاہر ہے کہ ایک خشک زمین میں بیج داب دینے سے اس میں کلّے نہیں پھوٹ سکتے اور برگ و بار نہیں آسکتے، جب تک کہ اس کو پہلے سے ہل چلا کر، گوڑ کر اور سینچکر روئیدگی کے لیے پوری طرح تیار نہ کر لیا جائے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آغازِ اسلام کے وقت کی زندگی میں سب سے پہلے عقائد کی تنقیح کی گئی، اور جب اسلام قبول کرنے والوں میں عقیدہ و ایمان پختہ اور راسخ ہو گیا تو مدنی زندگی میں معاشرتی و تمدنی احکام نازل ہوئے جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے، اگر شروع ہی میں تمام شرعی احکام نازل کر دیے جاتے تو ان کی قبولیت اور نفاذ میں

بڑی دشواری پیش آتی۔ اس سے اسلام کی حکمت عملی اور بے نظیر دانشمندی کا پتہ چلتا ہے، یہ ہیں اسلام کے بنیادی عقائد وتصورات اس کا مقصد اور نصب العین اور حکیمانہ و بے مثال طریقۂ کار۔ اسلام حقیقتاً سرتاپا عدل اور سراپا دلیل و برہان ہے۔ اس سے بڑھ کر فطری، عقلی اور حقیقت پسندانہ مذہب روئے زمین پر کوئی دوسرا موجود نہیں ہے۔

یاایہا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا۔ (نساء: ۱۷۴)	لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آچکی ہے اور ہم تمہارے پاس نور روشن (قرآن) بھیج چکے ہیں

ان وضاحتوں کے بعد اسلام کا بالکل صحیح، صریح اور غیر مبہم دعویٰ ہے کہ جو کوئی خدا پر ایمان لائے گا اور عمل صالح (شریعت الٰہی) پر عمل پیرا ہو جائے گا وہی اخروی زندگی میں کامیاب و کامران رہے گا، اور جو کوئی ان ابدی و سرمدی سچائیوں کو جھٹلا کر ایمان و عمل صالح سے انکار کر دے گا وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر (سورۂ عصر)	زمانہ (پوری تاریخ انسانی) شاہد ہے کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے نیک کام کیے اور ایک دوسرے کو حق بات اور ثابت قدمی کی تلقین کرتے رہے۔

یہ چھوٹی سی سورت دین اسلام کا جوہری خلاصہ اور اصولی اعتبار سے اس کی تمام تعلیمات کا نچوڑ ہے، اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں: (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تلقین حق (۴) اور تلقین ثبات۔ یہ چار باتیں اس دین حق کے واضح اور مثبت پروگرام کا خاکہ اور بنیادی دستور (Constitution) کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ وہ اصول ہیں جن سے

دنیا کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے، اور آج دنیا کو ان ہی چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ قرآنی فلسفۂ تاریخ کی رو سے آغاز آفرینش سے لیکر آج تک دنیا کی جس قوم نے بھی ان چار چیزوں کو اختیار کیا وہ دنیا کے اسٹیج پر برقرار رہی، اور جس نے اس کو ترک کیا وہ محفل ہستی سے اٹھا دی گئی، تاریخ انسانی کی اس شہادت کو "والعصر" کہہ کے پیش کیا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ چھوٹی سی مگر عظیم سورت دنیا کے پورے اصلاحی لٹریچر پر بھاری ہے، امام شافعیؒ نے بالکل بجا فرمایا کہ اگر انسان کی اصلاح کے لیے پورے قرآن کی بجائے صرف یہی ایک سورت نازل کر دیجاتی تب بھی کافی تھا،

اسلام ایک ضرورت غرض اسلام عیسائیت کی طرح محض ایک بے جان عقیدے کا نام نہیں، بلکہ ایک مکمل دستور العمل ہے، جو انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر واضح ہدایات دیتا ہے، اس کے عقائد جس طرح انتہائی معقول اور سائنٹفک ہیں، اسی طرح اس کی عباداتی اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات بھی نہایت معقول، محکم اور متوازن ہیں، عصر حاضر کے ایک بہت بڑے ادیب جارج برنارڈ شا نے اسلام کی فطری اور سادہ تعلیمات سے متاثر ہو کر یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اسلام ایک نہ ایک دن یقیناً ساری دنیا کا مذہب بن جائے گا، آج دنیا میں مختلف قسم کے مہمل فلسفوں اور ازموں نے سر اٹھا رکھا ہے، مگر روئے زمین پر پھیلی ہوئی خرابیوں اور بے چینیوں کو سوائے اسلام کے دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی "ازم" دور نہیں کر سکتا، خواہ وہ کیمونزم ہو یا سوشلزم، کیپٹل ازم ہو یا نیشنلزم، حقیقت یہ ہے کہ جب تک ان تمام بے جان، غیر فطری اور مہلک ازموں کو ترک کر کے مساوات انسانی اور وحدت بنی آدم کا صور نہ پھونکا جائے گا دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ ناممکن ہے، موجودہ گھٹاٹوپ تاریکیوں میں اسلام ہی روشنی کی کرن دکھا دیتا ہے۔

یاایھاالناس اناخلقنکم من	لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک
ذکروانثیٰ وجعلنا کم	عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف
شعوبا وقبائل لتعارفوا	قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے،
ان اکرمکم عند اللہ اتقکم	تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اب
	تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز
	وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اس کا
(حجرات - ۱۳)	وفادار ہو۔
ان الدین عند اللہ الاسلام	(اللہ کے نزدیک (پسندیدہ) دین صرف اسلام ہے

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری

تاریخ سندھ

خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں اور فرمانروا خاندانوں کے ماتحت رہا، اور ان تمام دوروں میں سندھ میں جو علمی و تمدنی ترقی ہوئی اور رفاہ عام کے جو گوناگوں کام انجام پائے، ان سب کی اس کتاب میں پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، مولفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سنوی

جدید اڈیشن قیمت ۶/-

منیجر

نوائے عصر

نوائے حیات کے بعد جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام، جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے قلم سے پیش لفظ اور جناب مولانا شاہ معین الدین کے قلم سے تعارف ہے۔ قیمت ۳/-

منیجر

ادبیات

بیانِ حقیقت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

انھیں سے ہے زیب عروسِ حیات — وہی جن کو سمجھا ہے تو مشکلات
جہاں میں ہے جو کچھ وہ سب بے ثبات — قدیم اور قائم فقط ایک ذات
تری سرد مہری ترا التفات — یہی موت میری یہی ہے حیات
صنم خانۂ دل کے لات و منات — مری آرزوئیں مری خواہشات
یہ انسان یہ حاصلِ کائنات — فرشتہ طبیعت اہرمن صفات
تری محفلِ وعظ میں کیا ہے اور — فقط اک بہشت و جہنم کی بات
محبت ہی کا نام پروردگار — محبت ہی ہے خالقِ کائنات
دلِ غمزدہ میں شعاعِ امید — اندھیرے میں جس طرح آبِ حیات
طلبگار مے تو بھی اور میں بھی شیخ — زباں پر ہے میری ترے دل کی بات
بلند ہوتا جاتا ہے عزمِ بشر — سمٹتی چلی جاتی ہے کائنات
اجل اور شے ہے فنا اور چیز — سمجھے رموزِ حیات و ممات
دل و دیدہ کر پاک آنسو بہا — ادا کر متاعِ الم کی زکات
کہاں شادمانی اگر غم نہ ہوں — کہاں ماہ و انجم اگر ہو نہ رات
غم و رنج و اندوہ و تاب و تعب — یہی ہے مرے دل کی کل کائنات
بساطِ زمانہ پہ اکثر ولی — پیادوں سے شاہوں نے کھائی ہے مات

غزل

جناب ماہر القادری

شورشِ طوفاں ہے اور منجدھار ہے
پھر بھی وہ چاہیں تو بیڑا پار ہے

وقتِ راحت، وقت ہی آزار ہے
یہ کبھی مرہم، کبھی تلوار ہے

سچ تو یہ ہے رسم و راہِ دوستی
کتنی آساں، کسقدر دشوار ہے

اے نگاہِ ناز! آزردہ نہ ہو
مجھکو اپنے جرم کا اقرار ہے

عشق کے جلووں کا عالم دیکھنا
حسن اب خود آئینہ بردار ہے

گرتے پڑتے چل رہے ہیں راہرو
پاؤں زخمی، راہ ناہموار ہے

آپ کو بھی زحمتِ پرسش نہ دی
آپ کا غم، کس قدر خوددار ہے

بیکسی غربت کی ماہرؔ کیا کہیں
دھوپ بھی اب سایۂ دیوار ہے

غزل

از جناب تسکینؔ قریشی

جب تری رہگذر سے گذرے ہیں
ہم تو کچھ بے خبر سے گذرے ہیں

کیا یونہی مل گیا ہے منصبِ عشق
ان کی اک اک نظر سے گذرے ہیں

مے چھٹی اور میکدہ نہ چھٹا
جب بھی گذرے ادھر سے گذرے ہیں

خود انھیں بھی خبر نہیں جن کی
وہ بھی جلوے نظر سے گذرے ہیں

کتنے چہروں سے اٹھ گئی ہو نقاب
ہم جنوں میں جدھر سے گذرے ہیں

ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں تسکیںؔ
ہم سنبھل کر جدھر سے گذرے ہیں

مطبوعات جدیدہ

بائبل سے قرآن تک جلد اول ۔ ترجمہ مولانا اکبر علی صاحب، شرح و تحقیق مولانا محمد تقی عثمانی
تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۱۲، مجلد قیمت ۱۵ روپے، پتہ: مکتبہ دار العلوم
کراچی ۱۴ پاکستان۔

ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل قبضہ و اقتدار کے کچھ عرصہ بعد جب یہاں عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں اور انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انھوں نے مسلمانوں کو خصوصیت سے اپنا ہدف بنایا تو ان کے مقابلہ کے لیے جو علمائے حق پیش پیش تھے، ان میں جنگ آزادی کے مشہور مجاہد مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی (م ۱۳۰۸ھ) کا نام زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے مسیحی علماء اور پادریوں سے مناظرے بھی کیے، اور رد عیسائیت میں کئی رسالے اور کتابیں بھی لکھیں، ان کی تصنیفات میں "اظہار الحق" سب سے مشہور اور رد عیسائیت پر لکھی جانے والی کتابوں میں زیادہ جامع، مدلل اور بہتر ہے، یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، اور اس کے کئی اڈیشن اور متعدد زبانوں میں ترجمے چھپ چکے ہیں، اب عیسائی مشنریوں کی موجودہ سرگرمیوں کے پیش نظر دار العلوم کراچی کے ایک لائق استاد مولانا اکبر علی صاحب نے "اظہار الحق" کا اردو ترجمہ کیا ہے، زیر نظر کتاب اس کے ربع اول کے ترجمہ پر مشتمل ہے، اس حصہ میں عیسوی مذہب کے اصل دار و مدار یعنی بائبل کی تمام کتابوں کا تعارف اور ان کے اختلافات اور غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کو غیر مستند اور غیر الہامی ثابت کیا گیا ہے، گو "اظہار الحق" موجودہ زمانہ کے لحاظ سے بھی مفید، مدلل اور محققانہ کتاب ہے، اور اس کا ترجمہ بھی سلیس و شگفتہ کیا گیا ہے، لیکن اس سے خاطر خواہ اور مکمل استفادہ کے لیے اس کو اب موجودہ مذاق

کے مطابق ایڈٹ کرنے اور نئی ترتیب و تہذیب کے بعد شائع کرنے کی ضرورت تھی، اس اہم اور ضروری
کام کو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے لائق و فاضل فرزند مولانا محمد تقی عثمانی نے بڑے حسن و خوبی، پوری
ذمہ داری اور نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ انجام دیا ہے، انھوں نے اصل کتاب کا نام بھی تبدیل کر دیا
ہے، ان کے قلم سے شروع میں تقریباً سوا دو سو صفحے کا ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ ہے، جو بجائے خود
نہایت اہم اور رد عیسائیت پر ایک مستقل تصنیف ہے، اس میں مسیحی مذہب کی اصل حقیقت اور صحیح
خد و خال بالکل غیر جانبداری کے ساتھ خود اس مذہب کی کتابوں اور اس کے پیشواؤں کے بیانات
سے واضح کرنے کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ موجودہ عیسائیت کا اصل بانی حضرت مسیحؑ کے بجائے پولس
ہے، مقدمہ کے آخر میں صاحب تصنیف کے حالات وسوانح اور علمی و دینی خدمات کا تذکرہ اور اس
مناظرہ کی جو ان کے اور مشہور پادری اور میزان الحق کے مصنف فانڈر کے درمیان ہوا تھا مفصل رُوداد
تحریر کی گئی ہے، یہ روداد نہایت دلچسپ ہے، مولانا محمد تقی نے متن پر بڑے عالمانہ اور محققانہ حواشی
بھی لکھے ہیں، اس میں بائبل کی قدیم و جدید تحریفات، اس کے نسخوں کے فرق و اختلاف، مذہب عیسوی
کے متعلق جدید تحقیقات و معلومات، اناجیل اور عیسائی مذہب کی کتابوں کے جنکے مصنف نے حوالے
دیے ہیں تخریج، موجودہ زمانہ کی انجیلوں اور کتابوں سے ان کا مقابلہ اور ان کی مکمل تحقیق و تنقید،
ان کتابوں اور اشخاص کا جن کے نام کتاب میں آئے ہیں، تعارف اور سب کے بارہ میں مفصل معلومات،
مذہبی و اصطلاحی الفاظ اور تشریح طلب مقامات کی وضاحت بڑی محنت و عرق ریزی سے
کی گئی ہے، ان محققانہ و معلومات افزا حواشی اور فاضلانہ پُر مغز مقدمہ نے کتاب کی قدر و قیمت
کئی گنا بڑھا دی ہے، اس دینی، علمی اور تحقیقی کارنامہ پر فاضل شارح کی جتنی داد بھی دیجائے کم ہے
امید ہے کہ اس کتاب کے باقی حصوں کا ترجمہ و تشریح بھی جلد منظر عام پر آئے گا۔

تفہیم المسلم جزء اول و دوم ۔ مرتبہ مولانا بلال عثمانی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و

طباعت اچھی، مجموعی صفحات ۱۹۶، قیمت فی جز ، ناشر دارالمعارف دیوبند

صحیح بخاری کے بعد حدیث کی اہم، مستند اور مشہور و مقبول کتاب صحیح مسلم ہے، اردو میں اس کی پہلی شرح مولانا وحید الزماں وقار نواز جنگ نے کی تھی، جو عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔ اب صاحب فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے برادر اکبر مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے نبیرہ اور دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ایک دوسری مفصل شرح اردو میں لکھ رہے ہیں، دارالمعارف نے خریداروں کی سہولت کے لیے اس ضخیم شرح کا ایک ایک جز ہر دوسرے مہینہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، ابھی دو جزء شائع ہوئے ہیں، پہلا جز مقدمہ اور کتاب الایمان کی آٹھ حدیثوں اور دوسرا کتاب الایمان کی مزید اڑتالیس حدیثوں کے ترجمہ و تشریح پر مشتمل ہے، پہلے جزء کے شروع میں حدیث کی بعض اصطلاحات کی تعریف، امام مسلم کا تذکرہ اور صحیح مسلم کی خصوصیات بھی لکھی گئی ہیں، لائق مرتب نے پہلے احادیث کا متن دیا ہے پھر ان کا ترجمہ و تشریح اور فٹ نوٹ میں بعض فنی نکات، رواۃ کے متعلق مختصر معلومات اور غریب الفاظ کی تحقیق کی ہے، اس شرح میں امام نووی اور متقدمین علماء کے شروح کے علاوہ مولانا عثمانی کی شرح اور دارالعلوم کے اکابر شیوخ حدیث کے درسی افادات سے زیادہ مدد لی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ شرح حدیث کے طلبہ کے لیے بڑی کارآمد ہے، مگر اس قسم کی شرحوں سے طلبہ میں سطحیت اور سہولت پسندی پیدا ہو جاتی ہے، غالباً مرتب نے اصلاً اس کو عربی زبان سے ناواقف لوگوں کے لیے لکھا ہے، اس لیے اس میں فنی و علمی تحقیقات اور فقہی و کلامی مباحث سے تعرض کرنے کے بجائے احادیث کا صحیح ترجمہ اور ان کے مطالب کا خلاصہ بیان کر دینا کافی تھا، اور ان شبہات کا ازالہ خاص طور سے ضروری تھا جو منکرین حدیث کی جانب سے کیے جاتے ہیں، پرانے کلامی مباحث پر جو اس وقت بھی بحث و جدال کا موضوع ہیں نئے انداز سے لکھنا چاہیے تھا، اس پہلو سے قطع نظر یہ شرح مفید اور مرتب کی محنت و کاوش لائق تحسین ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات - مرتبہ جناب خلیق احمد صاحب نظامی

ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۴، قیمت ۶ روپے

پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

عرصہ ہوا اس کتاب کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا، اور اس پر معارف میں مفصل تبصرہ بھی ہوا تھا، اب دوسرا اڈیشن مزید اضافے کے بعد شائع کیا گیا ہے، پہلے اڈیشن میں چھبیس ۲۶ مکتوبات اور آٹھ ضمیمے تھے، اور دوسرا اڈیشن بیالیس ۴۲ مکتوبات اور گیارہ ضمیموں پر مشتمل ہے، ایک طویل خط کا عکس بھی دیا گیا ہے، اور ضمیمہ، مقدمہ اور تعلیقات میں بھی اضافے کیے گئے ہیں، ترتیب پہلے اڈیشن کے موافق ہے، یعنی پہلے مکتوبات کا فارسی متن، پھر اس کا سلیس شگفتہ اردو ترجمہ، اس کے بعد تعلیقات اور سب کے آخر میں ضمیمے ہیں، شروع کے مقدمہ میں مکاتیب پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، ان تمام مکتوبات سے شاہ صاحب کی بالغ نظری، ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کے علاوہ اس عہد کی تاریخ سے متعلق بھی مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اور وہ ادبی و دینی حیثیت سے بھی بصیرت افروز ہیں۔

آئینۂ جمال ۔ مرتبہ جناب جمال بھارتی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۵۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ کتبخانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی ۶

جناب جمال بھارتی قوم پرور شاعر ہیں، یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے، جو نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے، مصنف کی قوم پروری او جذبۂ حب الوطنی کی جھلک انکی شاعری کی تمام اصناف میں موجود ہے، اور انکی نظموں میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے، قومی، سیاسی اور رومانی نظموں کے علاوہ انھوں نے مختلف ارباب علم وسیاست کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے، انکی بعض رومانی نظموں پر اختر شیرانی کی نظموں کا دھوکا ہوتا ہے، غزلوں میں حسن وعشق کے واردات اور زندگی کے تجربات ومشاہدات دونوں شامل ہیں، مصنف کو صحافتی اور ہنگامی مشغولیتوں سے زیادہ واسطہ رہا ہے، اس لیے ان کے کلام میں گہرائی وگیرائی اور زبان و بیان میں شان وشکوہ کی کمی ہے، لیکن ان کا تغزل سوز واثر سے خالی نہیں ہے۔

" ض "

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

صحابہ: (حصہ اول) قیمت: [illegible]

صحابہ: (حصہ دوم) " [illegible]

صحابیات: " [illegible]

فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: [illegible]

ے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: [illegible]

ے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: [illegible]

لہند (حصہ اول) " [illegible]

لہند (حصہ دوم) " [illegible]

۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کی ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: [illegible]

۱۰- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت [illegible]

۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے فلسفہ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت [illegible]

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر ریویو لکھے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب اشاعت بھی دارالمصنفین کے [illegible] ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے [illegible] پہلوؤں پر لکھے، صفحات: ۲۴۶ قیمت: عہ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(از ذخیرۂ معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاک کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب شامل ہیں غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دین اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے، قیمت :- [illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۶۔ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات

مسلم یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے مسئلہ میں دو فریق ہو گئے ہیں، اسکے ارباب حل وعقد دسمبر میں جوبلی کرنا چاہتے ہیں، لیکن اولڈ بوائز کا ایک طبقہ ان حالات میں جبکہ یونیورسٹی کا دستور معطل ہے، اس کی آزادی سلب ہو گئی ہے، اس کا نظم ونسق حکومت کے نامزد کردہ ممبروں اور عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ آیندہ جوبلی پیش ہونے والا ہے اسمیں یونیورسٹی کی کیا شکل ہو گی، اور اس کا کردار کہاں تک باقی رہے گا جوبلی منانا بے موقع ہے، ان دونوں کا جذبہ اخلاص اور یونیورسٹی سے تعلق ہی پر مبنی ہے، اسلئے کسی فریق کی نیت پر شبہ کرنا صحیح نہیں ہی، مناسب صورت تو یہی تھی کہ جب تک یونیورسٹی ایکٹ نہ بنجاتا، اور اس کی واضح شکل سامنے نہ آجاتی اس وقت تک کیلئے جوبلی ملتوی کر دیجاتی تاکہ سارے مسلمان دلی مسرت کے ساتھ شریک ہوتے، اس میں کوئی قباحت نہیں تھی، جوبلی سے جو فوائد اس وقت حاصل ہونگے، وہی بعد میں بھی ہوتے، لیکن اب جبکہ جوبلی کے انتظامات شروع ہو گئے ہیں، اس کی مخالفت مناسب نہیں ہے،

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی عزیز متاع، ان کی تقریباً ایک صدی کی محنت کا سرمایہ ان کے دل ودماغ کا سرچشمہ اور ان کی تہذیب وثقافت کا مرکز ہے، اس سے ان کو جذباتی لگاؤ ہے وہ اسکی ادنیٰ ٹھیس پر بیقرار ہو جاتے ہیں اسلئے اسکی یہ حیثیت قائم رہنی چاہئے، جس کا ہم بارہا اظہار کر چکے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے، کہ اب یونیورسٹی کے مصارف جسکی مقدار دو کروڑ سالانہ ہے حکومت برداشت کرتی ہے، اسلئے اگر وہ اسکو اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہے، تو مسلمان کس منہ سے اعتراض کر سکتے ہیں، اگر وہ اس کا نصف حصہ بھی فراہم کر سکتے، یا ان میں اپنے مطالبات منوانے کی طاقت ہوتی، اسوقت البتہ وہ حکومت سے جرأت کے ساتھ بات کر سکتے تھے، لیکن جب یہ دونوں صورتیں

نہیں ہیں تو اب یونیورسٹی کا معاملہ حکومت کے رحم و کرم پر ہے،

اگر یہ معاملہ مسز اندرا گاندھی یا ان کے جیسے سیکولر ذہن کے لوگوں کے اختیار میں ہوتا، تو امید تھی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات [illegible] گے، لیکن قانون بنانا پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے، اس کے ممبروں کی خاص تعداد جن میں کانگریسی ممبر بھی ہیں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو پسند نہیں کرتی، اور فرقہ پرور پارٹیوں کے ممبر تو اس کے کھلے ہوئے دشمن ہیں، حکومت کے باہر بھی مختلف تدبیروں سے یونیورسٹی کے کردار کو ختم کرنے کی کوشش جاری ہے مسلمان وزرا میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں، اس لیے حکومت کی راہ میں بھی دقتیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ مسئلہ اسکی سیکولرزم کا امتحان بھی ہے، اور بیرونی سیاسی مصالح کا تقاضا بھی، اس سے وہ مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہے اس لئے توقع یہی ہے، کہ جو ایکٹ بنے گا، اس میں یونیورسٹی کی آزادی اور مسلمانوں کی اکثریت باقی رہے گی، اور اس کا نظام انہی کے ہاتھوں میں رہے گا، لیکن وہ بہرحال پرانے یونیورسٹی ایکٹ سے مختلف ہوگا، اور اس کی انتظامی مجالس اور کلیدی عہدوں پر حکومت کے نامزد کردہ ممبروں اور ایسے سیکولر مسلمانوں کے آنے کی پوری گنجائش بلکہ سہولت ہوگی جن کو اسلامی کردار سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی بلکہ وہ اس کو سیکولرزم کے خلاف تصور کریں گے، اس لئے جو کچھ خطرہ ہے وہ اسی قسم کے مسلمانوں سے ہے، پہلے بھی انہی سے یونیورسٹی کو نقصان پہنچا ہے، اور آیندہ بھی انہی سے اندیشہ ہے، ان حالات میں یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو قائم رکھنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود اس کے ارباب حل و عقد اور اساتذہ اور طلبہ پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ اس کا نمونہ بن جائیں تو پھر کوئی طاقت اسکو نہیں مٹا سکتی اس کے کردار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسمیں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مگر اس کا نظام ان مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو، اور وہ ان کے حصول جاہ و مال کا ذریعہ بنی رہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ یونیورسٹی کی فضا اسلامی رہے، اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے، اس کے خلاف کوئی بات یونیورسٹی کے حلقہ میں نہ ہونے پائے، اس کو دارالعلوم دیوبند یا ندوہ نہ بنایا جائے، لیکن کارل مارکس اور لینن کی پرستش گاہ بھی نہ بننے پائے کم سے کم یونیورسٹی میں وہ فضا ہونی چاہئے جس کا مظاہرہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی آمد کے موقع پر کیا جاتا ہے،

اسکا اعتراف ہے کہ ایک محدود حلقہ کو چھوڑ کر یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی اکثریت میں اسلامی حمیت اور ایک طبقہ میں خاصی دینداری موجود ہے، اور کسی شخص میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ علانیہ غیر اسلامی

خیالات کا اظہار یا تبلیغ کر سکے، اور نہ اب تو ان اداروں تک کا جن کا سنگ بنیاد بڑی مقدس ہستیوں نے رکھا تھا اور جن کا مقصد قوم پرور لیکن سچے مسلمان پیدا کرنا تھا، یہ حال ہے، کہ اس کے ذمہ دار تک علانیہ اسلام پر نیش زنی کرتے اور مسلمانوں کے لئے دلخراش باتیں لکھتے رہتے ہیں، اسکے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی بہت غنیمت ہے،

مسلمانوں کی غیر سیاسی تنظیمیں بھی ایک طبقہ کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں اور ان پر بے تکلف فرقہ پروری کا الزام لگا دیا جاتا ہے جس سے جمعیۃ العلماء بھی مستثنیٰ نہیں ہے، جماعت اسلامی خاص طور سے اس کا نشانہ ہے، اور جب سے حکومت اور ملک کے سنجیدہ طبقہ نے کھل کر فرقہ پرور جماعتوں کی مخالفت شروع کی ہے، یہ سلسلہ اور تیز ہو گئی ہے، اور ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے ان کے ساتھ جماعت اسلامی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، جماعت اسلامی خالص دینی جماعت ہے اس نے سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا، بلکہ سیاست میں حصہ لینا اسکے اصول کے خلاف ہے، اس نے کسی فرقہ کی مخالفت کی نہ کسی کے خلاف جارحانہ اقدام کیا، نہ کہیں فتنہ و فساد برپا کیا، بلکہ اسکو ہمیشہ فرو کرنے کی کوشش کی، اس کا مقصد اور کام بالکل کھلا ہوا ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کو صحیح معنوں میں دیندار بنانا، اور دوسرے مذاہب والوں کو خدا کے احکام اور ان کے مذہب کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کی دعوت دینا ہے، وہ سارے فرقوں سے کہتی ہے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم، چنانچہ وہ اپنے عام اجتماعوں میں ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دیتی ہے، اور وہ ان میں شریک بھی ہوتے ہیں، اس لئے اس کی دعوت تو دین کی مشترک تعلیمات پر اتحاد کی دعوت ہے نہ کہ اختلاف اور فرقہ پروری کی، اس لئے حکومت کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے کہ جو کام وہ سیکولرزم کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتی، وہ جماعت اسلامی انجام دے رہی ہے، اس کی دعوت بالکل کھلی ہوئی ہے، اس کا لٹریچر چھپا ہوا موجود ہے ان کے مقررین عام مجمعوں میں تقریریں کرتے ہیں، اگر حکومت جماعت اسلامی کو حقیقۃً فرقہ پرست جماعت سمجھتی ہے، تو ان چیزوں سے اس کا ثبوت فراہم کرنا چاہئے ورنہ محض شعر کا وزن برابر کرنے کے لئے جماعت اسلامی کو فرقہ پرور قرار دینا بڑی زیادتی ہے،

مقالات

بانی درس نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

ظاہری حالات پر نظر ڈالیے تو وہ یہ تھے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی کا یہ یتیم جو باپ کی شہادت کے وقت چودہ سال کا تھا، عالمگیری فرمان کے بموجب جو حادثۂ شہادت کے پورے دو سال کے بعد یعنی ۱۱۰۵ھ میں باضابطہ جاری ہوا، "یک منزل حویلی فرنگی با متعلقہ آن واقع بلدۂ لکھنؤ مضافات بصوبۂ اودھ" کی ایسی وسیع عمارت میں اپنی دادی، والدہ، دو بھاوجوں، تین خورد سال بھتیجوں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ رہ رہا ہے، اب خود اس کی عمر سولہ سال کی ہو چکی ہے، حویلی کے فرمان کے ساتھ کچھ مدد معاش بھی بادشاہ وقت کی طرف سے مقرر ہے، ہر طرح فراغت کا دور ہے، عنفوانِ شباب سے دوچار قطبی خاندان کا یہ یتیم دونوں بڑے بھائیوں کی نگرانی اور تربیت کے دباؤ سے بھی آزاد ہے، وہ دونوں اس سے، اور گھر بار سے بہت دور، اورنگ زیب عالمگیر کی سپرد کردہ علمی اور انتظامی خدمتوں پر مامور ہو کر وطن کی خبروں سے، اور اہل وطن ان کی خبروں سے لاعلم ہو چکے ہیں، یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ ان دونوں بڑے بھائیوں کی کب اور کہاں وفات ہوئی، ان حالات کا تقاضا یہی ہے کہ

وہ رئیس زادے کی سی زندگی گزار کر اپنے خاندان کا نام ڈبو دے لیکن جو ہوا وہ ظاہری تقاضوں کے بالکل برعکس ہوا، ماں، دادی اور شفیق چچا وغیرہ کے سایۂ عاطفت کو اس نے خیر باد کہا خاندان کے بڑے ہونے کی ذمہ داری کی پروا نہ کی، گھر میں پڑھائی کا بندوبست ممکن نہ پاکر اس نے ترک وطن کا عزم کر لیا، مگر یہ ترک وطن آبائی وطن سہالی چھوڑنے سے مختلف انداز کا تھا، وہ مجبور ہو کر چھوڑا تھا، یہ پورے اختیار کے ساتھ۔

تذکرہ نویس لکھتے ہیں اور بجا لکھتے ہیں کہ ملا قطب الدین شہید کے کنبے کے لکھنؤ منتقل ہونے اور "حویلی فرنگی" میں اطمینان کے ساتھ آباد ہونے میں کم وبیش دو سال کا عرصہ لگا، اور جب مستقر اور قیام گاہ کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تو نظام الدین محمد بن ملا قطب الدین شہید سولہ سال کی عمر میں بغرض حصول تعلیم گھر سے نکلے، اور کم وبیش دس سال میں تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹے، (مجھے مدت تحصیل تعلیم کی اس تخمین سے اختلاف ہے، وجوہ آگے بیان ہوں گے)

اساتذہ۔ اساتذہ میں سب سے پہلے خود والد ماجد ملا قطب الدین تھے جن کی حیات میں شرح ملا جامی تک ان کی تعلیم ہو چکی تھی، گو پوری قطعیت کے ساتھ، سند اور ثبوت کے بغیر یہ کہنا ممکن نہیں کہ ملا شہید کی حیات میں جس قدر تعلیم ہوئی وہ سب ان ہی سے حاصل کی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ فاضل اور معلم باپ نے ہونہار فرزند کی تعلیم کی طرف بذات خود توجہ کی ہو ـــــ والد ماجد کی شہادت کے بعد دیوہ (ضلع بارہ بنکی) جائس (ضلع رائے بریلی) بنارس اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے کی روایتیں ملتی ہیں، لیکن دیوہ میں پڑھانے والے کا نام کہیں نہیں ملتا، دوسرے اساتذہ کے نام پوری صراحت کے ساتھ، تاریخ نے محفوظ کر لیے ہیں، لکھنؤ سے قریب ہی قصبہ جائس ضلع رائے بریلی میں والد ماجد کے ایک صاحب درس شاگرد ملا علی قلی جائسی کے درس کی شہرت تھی، اس قصبے میں ملا محمد باقر بھی مسند درس بچھائے ہوئے تھے، قطب شہید کا یہ فرزند پہلے ملا باقر ہی کی خدمت میں حاضر ہوا

جنھوں نے اسے ہدایت کی کہ وہ ان کے بعض تلامذہ سے پڑھنا شروع کرے، عام رواج کے لحاظ سے یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی لیکن نظام الدین محمد نے جن کی قسمت میں درس و تدریس کی بادشاہی لکھی تھی، "تو دۂ کلان" ہی سے استفادہ پسند خاطر رکھتے ہوئے اس صورت حال کو قبول نہیں کیا، اور ملا علی قلی جائسی کے پاس حاضری دی اور ان ہی سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں، اس کے بعد بنارس جاکر والد ماجد کے ایک دوسرے صاحب درس اور صاحب تصانیف مفیدہ شاگرد ملا امان اللہ بنارسی سے "شرح مواقف" جو علم کلام کی انتہائی کتاب ہے پڑھی، لکھنؤ واپس آکر ملا غلام نقشبند سے جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے مزار پر (واقع کنارۂ دریائے گومتی) فرائض درس اور فریضۂ رشد و ہدایت انجام دے رہے تھے، اور بیک واسطہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے، فن ہیئت کی آخری کتاب "رسالہ" "توشیحیہ" پڑھی اور فارغ التحصیل ہوکر "ملا نظام الدین محمد بن ملا قطب الدین شہید" ہو گئے، علامہ سید عبد الحیٔ الحسنی جو تراجم کے سلسلے میں صاحب ترجمہ کی حقیقی خصوصیتوں کی نشاندہی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ملا نظام الدین کو الامام العالم الکبیر، العلامۃ الشہیر، صاحب العلوم والفنون غیث الافادۃ الھتون خذ العالم بالربع المسکون، استاذ الاساتذۃ امام الجہابذۃ الذی تفرد بعلومہ دا لواءھا بیدہ لم یکن لہ نظیر فی زمانہ فی الاصول والمنطق والکلام (نزھۃ الخواطر) کے شاندار القاب و فضائل سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

فرنگی محل | "حویلی فرنگی" کہئے یا فرنگی محل، اس کے در و دیوار جو "فرنگی" تاجر کے دوران قیام میں بیوپار کی صداؤں سے مانوس رہ چکے تھے، اب پہلی بار فارغ التحصیل ملا نظام الدین محمد کی مسند درس اپنے حدود میں بھی دیکھتے ہیں، یہ کم و بیش ۱۱۰۶ھ/۱۷۰۴ء ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملا نظام الدین نے اپنی شاندار علمی اور تدریسی خدمتوں سے اس "حویلی فرنگی" کو علامہ سید سلیمان ندوی

کے الفاظ میں "ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم" بنا دیا، اور علمی تاریخ میں اس حویلی کو زندہ رہنے والا نام بخش دیا۔

"فرنگی محل" کا نام پڑھنے اور سننے والے بجا طور پر سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ فرنگی محل کے نام اور اس کے کام میں وجہ مناسبت کیا ہوسکتی ہے، خوش عقیدگی، قیاس کی مدد لیکر اسکو "فرہنگی محل" کی بگڑی ہوئی شکل قرار دے چکی ہے۔ "فرہنگ" بمعنی علم و دانش، اس کے خیال میں کثرت استعمال سے "فرنگ" ہوگیا ہے۔[1]

---

[1] قبل اسکے کہ اس نام کی اصلیت کی جستجو تاریخ کے صفحات پر کیجائے، اس سلسلے کے ایک لطیفہ کا ذکر نا طلسم ہوگا، ۴۴-۴۵ سال پہلے کی بات ہے، فرنگی محل میں مسلم اکاڈمی کا جلسہ تھا، یہ وہ علمی اور ادبی انجمن تھی جس کو مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اڈیٹر دلگداز اور شہر کے ممتاز علما اور ادبا نے باہمی تعاون سے غالباً ۲۵ء میں قائم کیا تھا۔ عموماً ہر مہینے اسکی ایک نشست کسی ایک ممبر اکاڈمی کے یہاں ہوتی تھی جس میں کوئی عالم یا اہل قلم علمی، ادبی یا تاریخی مقالہ پڑھتا تھا جس پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا، اسکے بعد میزبان ممبر کی طرف سے شرکائے جلسہ کی ضیافت کی جاتی تھی، جو شروع شروع تو عام ضیافت رہی، اسکے بعد باقاعدہ وپر تکلف دعوتیں ہونے لگیں جن میں ممبروں کے علاوہ معززین شہر مدعو ہونے لگے، اسی قسم کی پرتکلف دعوت والا ایک جلسہ فرنگی محل میں ہوا جس میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے "رباعی" پر مقالہ پڑھا تھا۔ مقالہ کے بعد تمام مہمان دسترخوان پر یکجا ہوئے۔ میزبان جدی و استاذی مولانا محمد عنایت اللہ فرنگی محلی تھے، راقم الحروف گھر کے بچوں کے ساتھ کھانا کھلانے کی خدمت انجام دے رہا تھا، ڈاکٹر محمد وحید مرزا (سابق صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی) نے یا کسی اور صاحب نے مولانا عنایت اللہ صاحب سے پوچھا کہ فرنگی محل کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ قبل اسکے کہ مولانا مرحوم کچھ کہیں مسٹر محمد وسیم بیرسٹر ایٹ لا نے (جو حکومت پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل ہوکر ۱۹۵۰ء میں وفات پا گئے) اس بے تکلفی کے حق سے جو ان کو مولانا مرحوم اور دوسرے علمائے فرنگی محل سے تھی، کہا "وجہ تسمیہ بس یہی ہوگی کہ یہاں کے کسی عالم نے ایک فرنگن سے نکاح کرلیا تھا، اسی لیے فرنگی محل ہوگیا" لکھنؤ کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالحمید نے جو پاس ہی بیٹھے تھے، برجستہ کہا "جی ہاں! جس طرح اب ڈالی باغ "فرنگی محل" ہوگیا ہے" اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا، جس میں وسیم صاحب بھی پوری طرح شریک ہوئے اسی زمانہ میں ڈالی باغ میں (جو وسیم صاحب مرحوم کی عالیشان رہائشی کوٹھی تھی) رہنے والے ایک نوجوان لندن سے بیرسٹری کرکے آئے تھے، اور ان کی منکوحہ انگریز خاتون بھی ان کے ہمراہ آئی تھیں اور وہیں رہ بھی رہی تھیں۔

(محمد رضا انصاری)

علمی تاریخ کے علاوہ مولانا قیام الدین محمد عبد الباری فرنگی محلیؒ (وفات ۱۹۲۶ء) کی رہنمائی میں جب فرنگی محل ملکی اور ملی سیاست کا ایک بڑا مرکز بن گیا اور سیاسی تاریخ میں بھی اس کا نام بار بار آنے لگا تو اس بنا پر کہ فرنگی محل سیاست کا بنیادی خیال فرنگیوں کی مخالفت تھا، اور خلافت" تحریک (جس کو لوگ مخالفت کا مرادف سمجھتے تھے) بڑی حد تک مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی ذات سے وابستہ تھی، فرنگی محل کے نام کی عجیب عجیب توجیہیں کیجانے لگیں، ان سب کا مفہوم مشترک یہ تھا کہ "یہ محل" فرنگیوں کی مخالفت کا مرکز اور مقام ہے۔

بہر حال اس مرکز علمی کے نام میں "فرنگی" کا جزء ایک سوال بن کر خاص و عام کے ذہن میں عجیب و غریب گل کھلاتا رہا، اس صورتِ حال سے لسان العصر اکبر الہ آبادی کی ذہانت نے بھی خوب فائدہ اٹھایا، جب دار العلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد یو، پی کے گورنر سر جان پرسکاٹ ہیوٹ نے رکھا تو انھوں نے جس طرح طبع آزمائی کی اس کو علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے الفاظ میں سنیے:-

"عجب حسن اتفاق ہے، ہندوستان کا سب سے بڑا دار العلوم لکھنؤ کا "فرنگی محل" تھا، جو درس نظامی کا بانی ہے، اور جس کے دامنِ فیض سے مولانا بحر العلوم، ملا حمد اللہ، ملا حسن وغیرہ تعلیم پا کر نکلے، یہ "فرنگی محل" اس لیے کہلاتا تھا کہ ایک فرنگی کی کوٹھی تھی، اس لیے "محل" اسکی طرف منسوب ہو گیا، شاہ عالمگیر کی سند میں یہ نام درج ہے، اس جدید دار العلوم (ندوۃ العلماء) کی بنیاد ہز آنر لفٹنٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہل فرنگ ہیں، میر اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی نے اس موقع پر اس حسن اتفاق سے شاعرانہ کام لیا، لکھتے ہیں:-

رکھی بنائے ندوہ ہز آنر نے آ کے خود
سچ پوچھیے اگر تو "فرنگی محل" ہے یہ"

(حیات شبلی ص ۷۸۴)

شعر و شاعری میں 'فرنگی محل' کی نمود مختلف اندازوں میں ہوئی، قدیم لکھنؤ سے واقفیت نہ رکھنے والے چکر میں پڑ گئے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ جب انھوں نے آتش کا یہ مطلع پڑھا،

ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام　　　چھانے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام

تاریخ ادب میں "کوئے فرنگی محل" کی تلمیح کی کوئی تشریح نہ پاکر قدیم و جدید ادب کے مزشناس محترم مولانا الماجد دریابادی سے اس سلسلے میں کئی سال قبل رجوع کیا تھا، مولانا نے دوسرے استفسارات کے جواب کے ساتھ یہ تحریر فرمایا تھا،

"فرنگی محل" پہلے چوک سے ممیز نہ تھا، اس کی شہرت وہی تھی جو بعد کو چوک کی ہوئی، "قلق" کا بھی مشہور مصرع ہے ع" جب دیکھئے قلق کو فرنگی محل میں ہے"۔

خدا جزائے خیر دے ریختی گو شاعر جانؔ صاحب کو (جن کا پورا نام میر یار علی ہے) ان بیچارے کی وجہ سے شاعری میں 'فرنگی محل' کی آبرو بنی رہی، وہ اپنے مخصوص انداز میں (۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں) کہتے ہیں :۔

۱۔ فرنگی محل، گوری بی صاحبہ!　　　ہے دنیا میں جنت کا تختہ اجی
۲۔ سلامت خدا رکھے اس باغ کو　　　اس باغ کے گل ہیں سب جنتی
۳۔ جو باغی ہیں ان کے رہیں خار خار　　　یہاں کے نہ غنچے کو ہووے کلی
۴۔ بڑے چھوٹے سب دین کے رہنما　　　یہ ہادی ہیں مرشد ہیں کامل ولی
۵۔ قسم باجی! مریم کے سر کی مجھے　　　کہ جس شمع سے لو ہے میری لگی
۶۔ میں سو جان سے کیوں نہ پروانہ ہوں　　　رہے ان کے اقبال کی روشنی
۷۔ وہ میرے مسیحا ہیں گردوں جناب　　　عنایت مرے حال پر ہے بڑی
۸۔ چلو جانؔ صاحب مرے ساتھ تم　　　رہے گی وہاں دو گھڑی دل لگی
۹۔ عطا مجھ کو فرمائیں گے آبرو　　　ہیں ہر علم کے قدر داں جوہری

قدیم تاریخ سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ فرنگی تاجر کی کوٹھی جو سرکاری املاک میں آچکی تھی اورنگ زیب عالمگیر نے ملا قطب الدین شہید سہالوی کے خانماں برباد کنبے کو رہنے کے لیے دیدی، اس سلسلے میں شاہی فرمان جو نافذ ہوا تھا، وہ ہنوز محفوظ ہے، جس کی نقل یہ ہے:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (طغرا) یاایہاالذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ مہر: ابوالمظفر محمد محی الدین عالمگیر بادشاہ غازی (سے فب)

دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی با متعلقۂ آں واقع بلدۂ لکھنؤ مضاف بصوبہ اودھ کہ از الکۂ نزولی است برائے بودن شیخ محمد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریان آں را بنام مشارٌالیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نشوند و اندریں باب سند مجدد نطلبند۔

(مرقوم غرۂ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد)

فرمان کے پشت پر جو عبارت ہے، اس کا اقتباس یہ ہے:-

"شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴ شعبان المعظم ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالۂ صدارت و شیخوخت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوار مرحمت و احسان صدر رفیع القدر فاضل خاں و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس معلی رسد کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبۂ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبۂ مذکور را گذاشتہ جلا وطن گردیدند و کدام مکانہائے سکونت ندارند الخ

بلاشبہ "حویلی فرنگی" ملا نظام الدین کے قیام اور نصف صدی تک سلسلۂ درس و تدریس

جاری رکھنے کے نتیجے میں علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گئی"۔ لیکن فرمان میں فرنگی محل کے نام سے مدرسہ کے قیام کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس عہد کی ایک فاضل اور لائق شخصیت یعنی مسٹر آصف بن علی اصغر فیضی نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں جس کا اردو ترجمہ "ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، لکھ دیا ہے:۔

"۱۱۰۵ھ (مطابق ۱۶۹۳ء) میں جبکہ وہ (ملا نظام الدین فرنگی محلی) پندرہ سال کے تھے اورنگزیب کے فرمان سے ایک مدرسہ "فرنگی محل" کے نام سے قائم ہوا اور کچھ زمین و مکانات ملا نظام الدین کے دو بڑے بھائیوں کے نام اس مدرسے کے لیے وقف کیے گئے، تکمیل تعلیم کے بعد ملا نظام الدین اس مدرسے میں معلم ہو گئے، اور اپنے والد ملا قطب الدین کے ساتھ "مددگار مدرس رہے" (ص ۱۰ اردو ترجمہ)

فرنگی محل کے نام سے مدرسہ[1] قائم کرنے کی بات تو کسی مغالطے پر مبنی قرار دی جا سکتی ہے مگر ملا قطب الدین شہیدؒ

---

[1] عہد اورنگ زیب کا ایک غیر ملکی باشندہ برنیر تھا، جو دارا شکوہ سے قریبی تعلق رکھتا تھا، اس نے اپنے سفرنامے میں اورنگزیب کی سخت مذمت کی ہے، اس سفرنامے کے حوالے سے نریندرناتھ لانے اپنی کتاب "پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول" میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے ایک دفعہ ایک ڈچ باشندہ کی حویلی جو فرنگی محل میں تھی، ضبط کر لی اور ایک مسلمان کے حوالے کر دی ایک مدرسہ قائم کرنے کیلئے۔" یہی عبارت مسٹر لے لے فیضی کی غلط فہمی کا باعث بنی ہے، ضبط کرنے کے الزام کی تردید تو دوسرے ذرائع سے ہو سکتی ہے (یا نہیں ہو سکتی ہے، اس سے یہاں بحث نہیں ہے) لیکن مدرسہ بنانے کے لیے "فرنگی محل" دینے کی بات اس فرمان کی روشنی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے، "برائے بودن" کے الفاظ بہت صاف ہیں یعنی رہائش کے لیے دی گئی تھی۔

خود برنیر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے" ڈچ باشندے بہت بڑے پیمانے پر کپڑوں کی خریداری کا کام بھی کرتے تھے، نہ صرف جلالپور میں بلکہ لکھنؤ میں بھی" (ص ۲۹۲ ترجمہ انگریزی سے)

(باقی حاشیہ ص ۹۳ پر)

کہ اس مدرسہ کا صدر مدرس اور ملا نظام الدین کو مدرگار مدرس قرار دینا تاریخی صراحتوں کے یکسر خلاف ہی نہیں بلکہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ ملا نظام الدین کی تعلیم کی تکمیل سے دس سال قبل ہی ان کے والد ملا قطب الدین شہید ہو چکے تھے۔

مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی غیر ذمہ دارانہ ہے،
"گزشتہ لکھنؤ" میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا، واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا....... اور غالباً اس موقعہ پر اس نے فرنگی محل کے مکانات علامۂ زماں ملا نظام الدین کی نذر کیے ہوں گے"

فرنگی محل کے مکانات نذر کرنے کا "قیاس" شاہی فرمان کی موجودگی میں بالکل بے محل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب کے لکھنؤ آنے کا زمانہ اس کی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے تخت نشین ہونے کے ابتدائی ۲۲ ۔ ۲۳ سال تو اورنگ زیب نے ضرور شمالی ہندوستان میں گزارے،

(بقیہ حاشیہ ص ۹۲) اسی انگریزی عبارت پر ایک حاشیہ بھی ہے جس میں کہا گیا ہے "فرنگی محل یا فرینک کے کوارٹر میں جو لکھنؤ شہر کا ایک قطعہ یا ایک وارڈ ہے، یہیں فیکٹری تھی، یہ عمارتیں اورنگزیب کے زمانے میں ضبط کر لی گئیں اور ایک مسلمان کو مدرسہ یا کالج بنانے کے لیے دے دی گئیں (انگریزی ترجمہ)

اس صراحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ "فرنگی محل" کا دوسرا نام "فرنیکس کوارٹرس" بھی تھا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نیل یا گھوڑوں کی تجارت کے بجائے جیسا کہ مشہور ہو گیا ہے، یہاں کپڑوں کی تجارت ہوتی تھی اور ایک کارخانہ بھی یہاں تھا، کپڑے ہی کا کارخانہ ہوگا۔ اس وقت کارخانے کا جو مفہوم ہو سکتا ہے وہی یہاں سمجھنا چاہیے۔

بہر حال لفظ "فرنگی محل" اس عمارت یا عمارتوں کا اصل نام تھا، یہ نہیں کہ بگڑ کر فرنگی محل ہوا ہو، جیسا کہ قیاس کیا جاتا رہا ہے۔

لیکن آخری ۲۵ ۔ ۲۶ سال اس کے دکن میں صرف ہوئے اور ان آخری برسوں میں اس کے لکھنؤ آنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی. فرمان شاہی پر تخت نشینی کے ۳۰ ویں سال کی تاریخ پڑی ہے اس وقت یقیناً اورنگ زیب دکن میں تھا.

فرنگی محل کے مکانات نذر کرنے کے سلسلے میں ملا نظام الدین کا نام لینا بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ملا نظام الدین شاہی فرمان کے صدور کے وقت سولہ سالہ ایک یتیم تھے، فرمان میں ان کے دونوں بڑے بھائیوں کے صرف نام ہیں، ملا نظام الدین اور ان سے بھی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا کے نام نہیں ہیں،

بے شک ملا نظام الدین کی مسند درس بچھنے کے بعد ملا صاحب کی علمی خدمتوں نے مولانا شرر کے الفاظ میں :۔

"چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علماء اور فضلاء کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پایا........ ان دنوں لکھنؤ ایک گمنام شہر تھا، مگر ایسے ایک گمنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بن جانا کہ ہندوستان تو درکنار بخارا، خوارزم اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکانے میں بہت ہی حیرت کے قابل ہے، ساری اسلامی دنیا یہیں کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی۔" (گزشتہ لکھنؤ)

جب ملا نظام الدین نے کم و بیش سنہ ۱۱۱۵ھ (مطابق سنہ ۱۷۰۳ء) میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آبائی مشغلہ "درس و تدریس" اختیار کیا، اس وقت لکھنؤ واقعی ایک قصبہ تھا، اورنگ زیب کا عہد ختم ہو رہا تھا، اور صوبہ اودھ جس کی طرف لکھنؤ مضاف (منسوب) تھا کسی خصوصی حیثیت کا مالک نہیں تھا، برہان الملک کی نوابی بھی قائم ہونے میں ابھی دیر تھی، عدلیہ، انتظامیہ اور بلدیہ کے حکام کا براہ راست مغل شہنشاہ کے دربار سے تقرر ہوتا تھا، شیخ زادوں کی سرکش حکمرانی

۴

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
۱۲	صحابۂ کرام کی عدالت	۲۲۰		**وفیات**	
۱۳	ظہیر الدین محمد بابر کا علمی ذوق	۴۴			
۱۴	عروس البلاد بمبئی کی تاریخی سرگذشت	۱۰۸ - ۲۶	۱	ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم	۲۲۸
۱۵	کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی سلور جوبلی	۴۷۱		**ادبیات**	
۱۶	معالم السنن امام خطابی	۸۵ - ۵			
۱۷	مکتوبات ایران	۳۰۹	۱	تضمین بر نعت امیر خسرو رحمۃ اللہ	۳۹۲
۱۸	ہندوستان میں وحدت الوجود کے	۱۴۵	۲	غزل	۷۳-۷۴-۳۱۴ ۳۱۵
	مسئلہ کے متعلق بعض غلط فہمیاں		۳	نوت شریف	۳۹۴

ملک بود و بہ یک حرکت ملک شد

پورا قطعہ تاریخ اس طرح ہے:-

نظام الدین محمد واصل حق   چو از روئے زمیں سوئے فلک شد

۱

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۰۵

از جنوری ۱۹۷۰ء تا جون ۱۹۷۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب احمد خاں صاحب ایم، اے،	۶۶	۷	جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی	۱۲۵

ختم ہو رہا تھا، اور صوبہ اودھ جس کی طرف لکھنؤ مضاف (صوبہ) تھا، ...
مالک نہیں تھا، برہان الملک کی نوابی بھی قائم ہونے میں ابھی دیر تھی، عدلیہ، انتظامیہ اور بلدیہ
کے حکام کا براہ راست مغل شہنشاہ کے دربار سے تقرر ہوتا تھا، شیخ زادوں کی سرکش حکمرانی

ملک بود و بہ یک حولت ملک شد

پورا قطعہ تاریخ اس طرح ہے :۔

نظام الدین محمد واصل حق   چو از روئے زمیں سوئے فلک شد

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

ختم ہو رہا تھا، اور صوبہ اودھ جس کی طرف مخصوص صفات (منسوب) ... ہیں ...

مالک نہیں تھا، برہان الملک کی نوابی بھی قائم ہونے میں ابھی دیر تھی، عدلیہ، انتظامیہ اور بلدیہ

کے حکام کا براہ راست مغل شہنشاہ کے دربار سے تقرر ہوتا تھا، شیخ زادوں کی سرکش حکمرانی

۵۰۵ویں جلد

جنوری ۱۹۷۰ء تا جون ۱۹۷۰ء

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

معارف پریس اعظم گڑھ

ملک بود و بہ یک حرکت ملک شد

پورا قطعہ تاریخ اس طرح ہے:-

نظام الدین محمد واصل حق   چو از روئے زمیں سوئے فلک شد

ختم ہو رہا تھا، اور صوبہ اودھ جس کی [illegible]

مالک نہیں تھا، برہان الملک کی نوابی بھی قائم ہونے میں ابھی دیر تھی، عدلیہ، انتظامیہ اور بلدیہ کے حکام کا براہ راست مغل شہنشاہ کے دربار سے تقرر ہوتا تھا، شیخ زادوں کی سرکش حکمرانی

۲	جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب عابدی، صدر شعبۂ عربی و فارسی، دہلی یونیورسٹی	۳۰۶	۹	جناب مولانا غلام محمد صاحب، مدیر تبلیغ، سورت	۲۲۰
۳	جناب انوار احمد صاحب سوپاروی	۲۶ - ۱۰۸	۱۰	جناب مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی	۴۴
۴	جناب ڈاکٹر شہریار نقوی	۳۰۹			
۵	سید صباح الدین عبدالرحمن	۸۲ - ۱۳۶، ۱۹۵ - ۲۲۸، ۲۴۳ - ۲۶۵، ۴۲۳	۱۱	حافظ محمد نعیم صدیقی رفیق دارالمصنفین	۱۹۲
			۱۲	جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ	۴۷۱
۶	ضیاء الدین اصلاحی	۵ - ۶۵، ۸۵ - ۱۵۸، ۲۳۹ - ۳۱۶، ۳۹۵ - ۴۷۹			

طلب بود و بہ یک حولت طلب شد

پورا قطعۂ تاریخ اس طرح ہے:-

نظام الدین محمد واصل حق ‏ ‏ ‏ ‏ چو از روئے زمیں سوئے فلک شد

مالک نہیں تھا، برہان الملک کی نوابی بھی قائم ہونے میں ابھی دیر تھی، عدلیہ، انتظامیہ اور بلدیہ کے حکام کا براہ راست مغل شہنشاہ کے دربار سے تقرر ہوتا تھا، شیخ زادوں کی سرکش حکمرانی

کے دور سے لکھنؤ اس وقت گزر رہا تھا۔ "حویلی فرنگی" یا فرنگی محل کا درجہ ملا قطب الدین شہید کے کنبے کی رہائش گاہ اور قصبہ لکھنؤ کے عام محلے سے بلند ہو کر ملا نظام الدین کی درسگاہ یا مدرسہ ملا صاحب تک جب پہنچا تو اٹھارہویں صدی عیسوی کا عین آغاز تھا۔ مغل خاندان کا آخری مطلق العنان شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر دکن میں اپنی عمر کے آخری چار سال گذار رہا تھا، وہ ۱۱۱۸ھ (مطابق ۱۷۰۷ء) میں اپنی عظیم سلطنت کو کمزور ہاتھوں کے لیے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا، شاہ عالم (محمد معظم شاہ) تخت نشین ہوا، وہ بھی چار سال حکومت کر کے (۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں) دنیا سے رخصت ہوا، مہینہ پندرہ دن کے لیے تخت پر بیٹھنے والے کئی "مغل شہنشاہوں" سے قطع نظر فرخ سیر کے چھ سالہ دور حکومت (۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک) اور محمد شاہ کے تیس سالہ دور حکومت (۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک) کو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے مسند درس کی تابانیوں سے نمو د نصیب ہو گیا،

سلطنت مغلیہ کے وارث شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ اور سلطنت علمیہ کے اورنگ نشین اور کئی پشتوں سے خاندانی علم و فضل کے وارث استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی کا وصال ایک ہی سال میں (۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) ہوا، اور دونوں "بادشاہوں" کی وفات کے درمیان فرق بھی چند ہفتوں کا رہا۔ دنیاوی بادشاہ محمد شاہ، ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ میں سدھارے، اور علمی شہنشاہ ملا نظام الدین محمد ۹ رجمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئے، میاں عبدالباسط امیٹھوی نے ملا صاحب کی وفات کا مادۂ تاریخ نکالا:۔

مُلک بود و بہ یک حرکت ملک شد

پورا قطعہ تاریخ اس طرح ہے:۔

نظام الدین محمد واصل حق　　چو از روئے زمیں سوئے فلک شد

وصال سال تاریخش فلک گفت ملک بود و بہ یک حرکت ملک شد

ان ہی میاں عبد الباسط امیٹھوی نے ایک اور قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا جس کی تقلید بعد میں بہت کی گئی، یہاں تک کہ مومن دہلوی کے اس مادۂ تاریخ کی بہت شہرت ہوئی جو انھوں نے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی وفات پر نکالا تھا یعنی

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

مومن دہلوی سے تقریباً سو سال قبل میاں عبد الباسط امیٹھوی ملا نظام الدین کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہہ چکے ہیں۔

در وفات مولوی، صاحب خصائل ہاتف تاریخ گفتش در مثال

در وفاتش بے سر و پا گشتہ اند عشق و خیر و فیض و فضل و ہم کمال

کم و بیش پچاس سال تک ملا نظام الدین فرنگی محل میں درس دیتے اور اس حویلی کی شہرت کو بام عروج پر پہنچاتے رہے، مؤرخین مستقبل کی نظر میں "فرنگی محل" اسلامی علوم کی یونیورسٹی" اور "ہندوستان کا سب سے بڑا دار العلوم" بنتا چلا گیا، لیکن تقریباً سو سال بعد تک اس حویلی کی نسبت سے "فرنگی محلی" لکھنے کا کوئی سراغ نہیں ملتا، خود ملا نظام الدین اپنی تصانیف میں اپنے کو "سہالوی" لکھتے رہے۔ ان کے نامور فرزند ملا عبد العلی بحر العلوم (وفات ۱۲۲۵ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں کہیں "فرنگی محلی" اپنے کو نہیں لکھا۔ ملا بحر العلوم کے ہم عصر اور وفات کے اعتبار سے ہم سال ملا محمد مبین فرنگی محلی نے بھی، نیز ان کے نامور جد امجد ملا احمد عبد الحق بن ملا سعید نے بھی اپنی تصانیف میں فرنگی محل کی نسبت سے اپنا تعارف کہیں نہیں کرایا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں "فرنگی محل" ذریعۂ تعارف نہ تھا، بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ تھا جس طرح دوسرے محلے کسی قصبے کے ہوا کرتے ہیں۔

معاصر مؤرخ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ملا نظام الدین سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں تو

زندگی محل کا کوئی حوالہ وہ بھی نہیں دیتے ہیں :-

انا دخلت فی التاسع عشر من ذی الحجۃ	میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ میں لکھنؤ گیا
الحرام سنۃ ثمان واربعین بعد مأۃ	اور ملا نظام الدین سے ملاقات کی ،
والف واجتمعت بالملا نظام الدین	میں نے ان کو سلف صالحین کے طریقے
فوجدتہ علی طریقۃ السلف الصالحین	پر پایا، ان کی پیشانی پر بزرگی کا نور
وکان یلمع علی جبینہ نور التقدیس	تاباں تھا،

(سبحۃ المرجان)

علامہ بلگرامی کی دوسری کتاب مآثر الکرام میں ملا نظام الدین کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:-

وہم در لکھنؤ رحل اقامت افگند وتمام	لکھنؤ ہی میں قیام اختیار کرلیا اور تمام
عمر بہ تدریس وتصنیف اشتغال ورزید	عمر درس وتدریس وتصنیف تالیف میں
واشتہار عظیم یافت امروز علمائے اکثر	گزاردی اور عظیم شہرت کے مالک ہوئے ،
قطر ہندستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند	آجکل ہندستان کے اکثر اطراف کے علماء ملا نظام الدین
وکلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند وکسے کہ سلسلۂ	سے شاگردی کی نسبت رکھتے ہیں اور تاج
تلمذ باوی رساند بین الفضلاء علم امتیاز	فخر ومباہات زیب سر کرتے ہیں، جو شخص ملا
می افرازد ومردم بسیار را دیدہ شد	نظام الدین کی شاگردی کا سلسلہ رکھتا ہے
کہ تحصیل جاہائے دیگر کردند برائے اعتبار	وہ فضلائے عہد کے درمیان امتیاز وخصوصیت
فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند	کا پرچم بلند کرتا ہے، بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ
	دوسری جگہوں میں تحصیل علم کی لیکن اپنا اعتبار
	بڑھانے کیلئے فاتحہ فراغ اکر ملا نظام الدین ہی سے پڑھا،
فقیر بتاریخ نوزدہم ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ	فقیر (علامہ آزاد بلگرامی) نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ

دربلدۂ لکھنؤ یک صحبت مولوی ،راد یدم | کو شہر لکھنؤ میں ملا صاحب کی ایک صحبت
طریقۂ سلف صالحین داشت وشخص متقی | دیکھی ہے ، سلف صالحین کا انداز رکھتے ہیں
از ناصیہ ہمایوں می تافت ، نہم جمادی الاول | اور بزرگی کی دمک انکی مبارک پیشانی سے
۱۱۶۱ھ سفر گزین ملک جاودانی شد | پھوٹ رہی تھی ، ۹ر جمادی الاول ۱۱۶۱ھ
آرام گاہ لکھنؤ ۔ | کو عالم جاودانی کی طرف سفر فرمایا ، آخری آرام گاہ لکھنؤ ہے۔

علامہ بلگرامی نے ملا نظام الدین کی تاریخ وفات بھی کہی تھی :

عالم کامل امام عصر استاد جہاں | طائر روحش بہ سیر جنت الماوی شتافت
سال تاریخ وفات او بہ طور تعمیہ | گفتہ شد ملا نظام الدین دل فردوس یافت

"حویلی فرنگی" یا "فرنگی محل" یا "فرینکس کوارٹرس" نے تاریخ میں جو جگہ حاصل کی وہ ملا نظام الدین ہی کے پچاس سالہ غلغلۂ درس وتدریس کی بدولت حاصل کی ، مرزا محمد حسن قتیل (وفات ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء) ملا نظام الدین کو محمد شاہ بادشاہ کے زمانے کے "سرآمد علماء" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ملا قطب الدین سہالوی کے (جو ملا محب اللہ بہاری کے استاد کے استاد تھے) بیٹے ملا نظام الدین محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں سرآمد علماء سمجھے جاتے تھے ، چنانچہ آج بھی (یعنی ملا نظام الدین کی وفات کے ستر بہتر سال بعد بھی جو ہفت تماشا کا زمانۂ تصنیف ہے) ہندوستان میں فاضلوں اور عالموں کا سلسلہ ان ہی پر منتہی ہوتا ہے ، ان کے شاگرد ملا کمال الدین سہالوی نے ایک کتاب "عروۃ الوثقیٰ" لکھی تھی جس کے دقائق وغوامض حل کرنے سے بڑے بڑے علماء عاجز ہیں ، اگرچہ زمانۂ حال کے علماء کے استاد اول ملا نظام الدین مرحوم تھے ، جن کی ذات سے لکھنؤ میں "فرنگی محل" کو شرف وعزت حاصل ہے ، لیکن ان کے پیر طریقت ..... (ہفت تماشا فارسی سے ترجمہ)

اس کے آگے مرزا قتیل کی عبارت خبط ہو گئی ہے، پیش نظر "ہفت تماشا" کا مطبوعہ نسخہ (نول کشور پریس) ہے، اس کا کوئی قلمی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ورنہ یہ گتھی صاف ہو جاتی، مرزا قتیل کی مطبوعہ "ہفت تماشا" میں اس کے آگے جو عبارت ہے وہ یہ ہے :۔

"لیکن ان کے پیر طریقت یہی ملا کمال الدین سہالوی گزرے ہیں۔" (فارسی ترجمہ)

یہ سراسر غلط بھی ہے، اور سیاق و سباق سے یہ ٹکڑا مطابقت بھی نہیں رکھتا ہے، بیچ میں کچھ عبارت ضرور رہ گئی ہے، مرزا قتیل کہنا یہی شروع کرتے ہیں کہ "زمانۂ حال کے علماء کے استاد اول اگرچہ ملا نظام الدین مرحوم تھے، اس کا اختتام یہ ہونا چاہیے تھا "لیکن ان کے پیر طریقت ناخواندہ اور امی محض تھے۔" اور یہ تاریخی حقیقت بھی ہے کہ ملا نظام الدین اور ان کے فاضل شاگرد ملا کمال الدین سہالوی دونوں کے پیر طریقت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی تھے، جو تذکروں کی صراحت اور خود ملا نظام الدین کے بیان کے مطابق "امی محض" تھے، قتیل کی عبارت سے اگر اس کو تحریف شدہ یا مخبوط نہ سمجھا جائے، تاریخی حقیقت بدل کر رہ جائے گی، اس کے علاوہ "اگرچہ استاد اول تھے کیا خبر کہ ان کے پیر طریقت یہی ملا کمال الدین سہالوی گزرے ہیں" سے میل بالکل نہیں کھاتی، اس لیے کہ ملا کمال بھی علمائے عصر کی ایک بڑی تعداد کے استاد تھے، ان کے پیر طریقت ہونے میں اس قدر حیرت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

مرزا قتیل اس کے بعد ملا کمال الدین کے اجلۂ تلامذہ ملا برکت الہ آبادی، ملا احمد اللہ سندیلوی، ملا حسن فرنگی محلی، ملا حسن چڑیا کوٹی اور ملا عالم سندیلوی کا ذکر کرنے اور ملا نظام الدین کے نامور فرزند ملا عبدالعلی بحرالعلوم کو (جن کی وفات کو اس وقت تک دو سال بھی نہیں ہوتے تھے) خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"یہ سب بزرگ جن کا تذکرہ کیا گیا، سلسلۂ علما کے شیوخ گزرے ہیں، ہندوستان میں

علم معقول جا بجا ان ہی حضرات سے پھیلا، کوئی طالب علم اور کوئی فاضل ایسا نہیں ہے
جو ان کی شاگردی کے حلقے سے باہر ہو، کوئی چھ واسطوں سے کوئی سات واسطوں سے اور
بعض اس سے بھی کم واسطوں سے ان حضرات سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔" (ہفت تماشا فارسی ترجمہ)

بہرحال فارغ التحصیل ملا نظام الدین محمد کی مسند درس بچھنے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبۂ علوم کی توجہ اس طرف کب مبذول ہوئی، ایک پچیس سالہ فارغ التحصیل نوجوان استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنے کی بات اور ہے لیکن اس استاد کی اہمیت محسوس کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی، جب کہ اس نوجوان کی علمی اور تدریسی استعداد کا اظہار ابھی صفر کے درجہ سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے، اس عمر کے کئی اور فارغ التحصیل ذی استعداد اساتذہ اور بھی ہوں گے، پھر ملا نظام الدین کی طرف طلبۂ علم کی کشش کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کا مجمل جواب تو یہی ہے کہ انکے طریقۂ درس کی شہرت بہت جلد ہو گئی، اور ان کے نصاب تعلیم کے فوائد جس کو ان ہی کی نسبت سے "درس نظامی" کہا جانے لگا، بہت تیزی سے ظاہر ہونے لگے، سب سے بڑا فائدہ تو یہی تھا جس کی طرف ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی نے ملا قطب الدین شہید کی وجہ شہرت کے سلسلہ میں اشارہ کیا ہے یعنی "تحصیل فراغ بسیار از مردماں بخدمت ایشاں" (بہت کم مدت میں طلبہ کو فارغ التحصیل کر دینا)۔ ملا نظام الدین کے درس سے کتنی جلد طلبہ فارغ التحصیل ہو جاتے تھے، اس کی ایک حیرت انگیز مثال ان کے ارشد تلامذہ میں ملا کمال الدین سہالوی کے احوال سے ملتی ہے۔

ملا کمال کا ستر سال (کم و بیش) کی عمر میں ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں (۱۴ محرم الحرام کو) انتقال ہوا، اس حساب سے ان کی پیدائش لگ بھگ ۱۱۰۵ھ میں ہوگی، ان کی ابتدائی تعلیم متوسطات تک انکے وطن فتحپور میں ہوئی، ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد اولاد ملا قطب نے جس طرح سہالی چھوڑ کر لکھنؤ آباد کیا تھا، اسی طرح ملا کمال کے والد ماجد قاضی دولت سہالوی نے بھی جو ملا قطب کے شاگرد اور

متبنی تھے، سہالی چھوڑ دیا تھا۔

چون قصۂ شہادت ملا قطب الدین شہید	جب خانہ زادوں کے ہاتھوں ملا قطب الدین
از دست قوم خانہ زادہا بظہور رسید	شہید کا واقعۂ شہادت ظہور پذیر ہوا کر
و بے سبب و ناحق ملا شہید را شہید کردند	بے سبب اور ناحق ان کو شہید کر دیا، قاضی
قاضی محمد دولت را بود و باش قصبۂ سہالی	محمد دولت کو سہالی میں بود و باش ناگوار
ناگوار افتادہ ناچار قاطبۃً ترک کردند	ہو گئی، مجبوراً سہالی کو کلیۃً ترک کر کے
و در قصبۂ فتحپور ...... اقامت گزیدند	فتحپور میں ....
(اغصان الانساب مخطوطہ و ملوکہ مولانا محمد میاں صاحب)	قیام اختیار کر لیا۔

اغصان الانساب کے مصنف مولوی رضی الدین محمود انصاری فتح پوری نے جو ملا کمال کے ہم جد ہیں، لکھا ہے :-

در ابتدائے حال کتب مختصرہ از میراں	(ملا کمال سہالوی نے) شروع میں چھوٹی
کمال الدین ساکن بنگالہ شاگرد ملا	کتابیں بنگال کے رہنے والے میراں
نظام الملۃ والدین محمد قدس سرہ بودند	کمال الدین سے پڑھیں جو ملا نظام
خواندہ،	الملۃ والدین محمد کے شاگرد تھے۔

اور میراں کمال الدین بنگالی کے بارے میں بہت صراحت سے صاحب اغصان الانساب نے لکھا ہے :-

چون میراں کمال الدین از استاد خود	میراں کمال الدین بنگالی جب اپنے استاد
کتب درسیہ خواندہ فارغ شدند در فتحپور	ملا نظام الدین محمد) سے کتب درسیہ پڑھکر
آمدہ تدریس آغاز نہادند دریں اثنا	فارغ التحصیل ہو گئے تو فتحپور آکر انھوں نے

ملا کمال الملۃ والدین محمد قدس سرہ	پڑھانا شروع کر دیا، اس دوران میں
از کتابہائے مختصرات فراغت گرفتند	ملا کمال الملۃ والدین محمد نے چھوٹی درسی
	کتابوں سے فراغت حاصل کرلی،

یہ مذکور ہو چکا ہے کہ ملا نظام الدین کی مسند درس ۱۱۱۵ھ یا ۱۱۱۶ھ میں بچھی تھی، اس وقت ملا کمال سہالوی کی عمر کیا ہوگی؟ یہی دس، گیارہ سال کے ہونگے، ابتدائی نوشت وخواندان کی شروع ہو چکی ہوگی، اب کیا مدت فرض کی جائے، ان کے مختصراتِ درسیات شروع کرنے کی؟ ابتدائی نوشت وخواند کے تین چار برس بعد، یعنی اندازاً ۱۱۱۸ھ یا ۱۱۱۹ھ اور ان تین چار برسوں میں میران کمال الدین بنگالی، ملا نظام الدین سے کتب درسیہ تمام کرکے فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں، اور فتحپور آکر ملا کمال کے استاد بن جاتے ہیں، فارغ التحصیل ہونے کے لیے اتنی قلیل مدت (چار، پانچ سال صرف) کو عقل بآسانی قبول نہیں کر سکتی لیکن انکار بھی نہیں کر سکتی، ورنہ تاریخ کی صراحتوں سے انکار کرنا پڑے گا، سوائے اس کے کہ یہ مانا جائے کہ لکھنؤ میں آکر ملا غلام نقشبند سے رسالہ قوشجیہ پڑھنے کے دوران ہی میں ملا نظام الدین نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا،

جب بھی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہو، ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۶ھ میں یا اس سے قبل (ایسے ہی بعض قرائن سے میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہونے کی مدت جو دس سال (۱۱۰۵ھ سے ۱۱۱۵ھ تک) تخمیناً بتائی جاتی ہے، اس کو کم ہونا چاہیے جب کہ وہ ۱۱۰۵ھ میں شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے، یہ مدت سات سال میں محدود رکھی جائے تو سب خلشیں دور ہو جاتی ہیں) بہرحال ملا صاحب کے اولین تلامذہ میں یہی میران کمال الدین بنگالی کے علاوہ خود اپنے حقیقی بھتیجے احمد عبد الحق بن ملا محمد سعید، عبد العزیز بن ملا محمد سعید بن ملا اسعد تھے، غلام مصطفیٰ اپنے جد ملا قطب شہید کی حیات میں پیدا ہو چکے تھے، اور احمد عبد الحق عین زمانۂ شہادت

(۱۹ رجب سنہ ۱۱۰۳ھ) کو پہلے سہالی میں پیدا ہوئے تھے، ان کے چھوٹے بھائی عبد العزیز کی ولادت لکھنؤ فرنگی محلی میں (سنہ ۱۱۰۵ھ) ہوئی، ملا عبد العزیز بن ملا محمد سعید پہلے مولود ہیں جو خاندان ملا قطب شہید کے فرنگی محل میں آباد ہونے کے بعد تولد ہوئے، ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہونے کی جو مدت بھی فرض کر لیجئے (مدے مدت سنہ ۱۱۱۰ھ ہی) یہ تینوں بھتیجے اس وقت بچے ہی تھے، اور ان کو پڑھانے والا درکار تھا،

حقیقی چھوٹے بھائی محمد رضا بن ملا قطب شہید کے بارے میں اغصان الانساب کے مصنف نے لکھا ہے :-

جملہ کتب درسیہ از برادر خود مولانا	ملا محمد رضا نے تمام درسی کتابیں اپنے چھوٹے
نظام الملۃ والدین قدس سرہ خواندہ	بھائی (تین بڑے بھائیوں میں سب سے چھوٹے)
بتدریس بندگان پرداختند وعالمے از	مولانا نظام الدین سے پڑھیں اور بندگان خدا
ذات ایشاں خزائن علوم اندوختند	کو پڑھانا شروع کر دیا، ایک دنیا نے ان
ولیل ونہار کمر ہمت بر درس محکم بستہ بودند	کی ذات سے علوم کے خزانے ذخیرہ کر لیے
	دات دن درس وتدریس میں استقلال
	کے ساتھ مصروف ومنہمک رہتے تھے،

ملا محمد رضا کی شاگردی بحث طلب مسئلہ اس لیے ہے کہ خاندان فرنگی محل کے تمام حوالے اسکے خلاف ہیں، اور درایت بھی اس کی موید نہیں ہے، ملا نظام الدین اور ملا محمد رضا کو "ہم برادر ہم استاد" ہر موقعہ پر کہا گیا ہے، اگرچہ ملا محمد رضا کے اساتذہ کی صراحت نہیں ملتی ہے، ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی (وفات سنہ ۱۲۰۷ھ) لکھتے ہیں :-

بعد تارک دنیا شدہ مرید حضرت سید عبد الرزاق	ملا محمد رضا نے اس کے بعد ترک دنیا اختیار کر لی
بانسوی شدہ، پس ہم پیر برادر خود شدند	اور حضرت سید عبد الرزاق بانسوی کے مرید ہو گئے۔

چنانچہ ہم استاد بودند (رسالہ قطبیہ قلمی)	اس طرح وہ اپنے بھائی (ملا نظام الدین) کے ہم پیر بھی ہو گئے، جس طرح "ہم استاد" تھے۔

ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی (وفات سنہ ۱۲۷۰ھ) شاگردی کا ذکر کیے بغیر صرف یہ لکھتے ہیں:-

محمد رضا مذکور اول تحصیل علوم کردہ در جنب برادر بزرگ بتدریس علوم مشغول گشتہ بعد ازاں بیاد مولی اشتغال نمود (عمدۃ الوسائل قلمی)	محمد رضا تحصیل علم کرکے پہلے تو اپنے بڑے بھائی کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر درس دینے میں مشغول ہو گئے، اس کے بعد درس و تدریس ترک کرکے یاد خدا میں لگ گئے۔

ملا محمد رضا اپنے نامور بھائی ملا نظام الدین سے چار ہی پانچ سال چھوٹے تھے، جب ملا نظام الدین سولہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے وطن سے نکلے تو ملا محمد رضا بھی گیارہ بارہ برس کے تھے، اور اس عمر میں تحصیل علم کیلیے گھر سے نکلنا جبکہ دیوہ (ضلع بارہ بنکی) اور جائس (ضلع رائے بریلی) جیسے قریبی مقامات ہی تک جانا ہے، ذرا بھی خلاف معقول بات نہیں ہے، اس لیے بڑے بھائی کے ہمراہ چھوٹے بھائی کا دیوہ، جائس اور بنارس کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرکے "ہم استاد" ہونا محل حیرت نہیں، یہ ضرور محل تعجب ہوتا کہ ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس آنے کے انتظار میں پڑھائی چھوڑے ملا محمد رضا بیٹھے رہتے، خصوصاً اس حالت میں جیسا کہ ایک روایت کے مطابق ملا محمد رضا صرف دو سال ملا نظام الدین سے چھوٹے تھے۔

ملا محمد رضا کی شاگردی کی روایت مذکورہ تصریحات کی روشنی میں خاصی مخدوش ہو جاتی ہے، اور "ہم استاد" ہونے کی متواتر روایت کو تقویت اس جملے سے بھی ایک حد تک ہوتی ہے کہ "در جنب برادر بزرگ بتدریس علوم مشغول گشتہ" بڑے بھائی کے پہلو بہ پہلو درس دینے بیٹھ گئے یعنی دونوں بھائی ساتھ ساتھ پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، ملا نظام الدین کے پڑھائے ہوئے بھتیجوں اور ان کی اولاد نے بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس ہی اپنا مشغلہ رکھا، جیسے ملا احمد عبدالحق ابن ملا محمد سعید، ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا، ملا محمد ولی حفید، ملا محمد اسعد اور ملا بحر العلوم بن ملا نظام الدین وغیرہ

اور ان سب نے ملا نظام الدین کے سامنے ہی درس و تدریس شروع کر دیا تھا، ملا محمد رضا، آخر عمر میں "قال" سے "حال" کی منزل میں چلے گئے تھے، اس لیے ان کے احوال میں تذکرہ نویس بس سرسری ذکر درس و تدریس کا کر کے "حال" کے ذکر میں صفحوں کے صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگر "ہم پیر" ہونے کے ذکر میں "ہم استاد" کی بات ان کے قلموں سے نکل نہ گئی ہوتی تو ملا رضا کی تعلیم کے بارے میں ہلکی سی روشنی بھی ملنا دشوار ہو جاتا، ان کی قابل قدر تصانیف بھی ان کی بے توجہی سے خاندان کے ذخیروں میں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ بھی ہاتھ آجاتا ہے کہ ملا نظام الدین کی درس گاہ میں، جس کو بعد کے مورخین "مدرسہ ملا نظام الدین" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ابتداءً دو مدرس تھے، ایک خود ملا صاحب دوسرے ان کے پہلو بہ پہلو ملا محمد رضا، یہ دونوں بھائی کثیر التعداد طلبہ کے درس کی ذمہ داریوں کو باہم تقسیم کئے ہوئے تھے، اور جب ملا محمد رضا "بعد از ال بیاد مولیٰ اشتغال نمود" کی صراحت کے مطابق درس و تدریس سے دست کش ہو گئے، جو بہرحال تدریس کو دس بارہ سال جاری رکھنے کے بعد کی بات ہے، تو ملا نظام الدین کے بھتیجے ملا احمد عبد الحق اور ملا غلام مصطفیٰ بن ملا اسعد فارغ التحصیل ہو چکے تھے، بڑے بھتیجے ملا غلام مصطفیٰ ملاوان کے قاضی ہو کر فرائض عدالت انجام دینے لگے، اور ملا احمد عبد الحق مددگار مدرس رہے، "تحصیل کتب درسیہ بخدمتش نمودہ درجنب او بتدریس مشغول گشت و تصانیف در معقولات نمود" (ملا نظام الدین کی خدمت میں تحصیل علم کرنے کے بعد ان کے برابر ہی درس میں مشغول ہو گئے اور فن معقولات میں کتابیں لکھیں) "و اعتبار تمام در ارباب علم و اراکین شہر پیدا کردہ بشغل ضبط و ربط مقدمات خانگی و وجاہات ریاست چنانکہ می بایست نمودہ" (اہل علم و عمائدین شہر میں عزت حاصل کی اور خاندانی امور اور جائیداد کے نظم و ضبط میں، جیسا کہ چاہیئے دلچسپی بھی لیتے رہے) (اغصان اربعہ از ملا ولی اللہ فرنگی محلی مطبوعہ) درس و تدریس میں مشغول ہونے کے باوجود ملا احمد عبد الحق نے اپنے نامور چچا ملا نظام الدین کو امور خانگی

سے اس طرح بے نیاز کر دیا کہ ملا نظام الدین ،

ہمیشہ از مرداں می گفت کہ بدولت میاں احمد	ملا نظام الدین ہمیشہ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے
عبدالحق نظام الدین نظام الدین شد کہ	کہ میاں احمد عبدالحق (بھتیجے) کی بدولت نظام الدین
او شاں طامت دنیا و رنج ہمہ امورات	نظام الدین بنے، انھوں نے دنیا کی الجھنیں اور
بر خود گرفتند و من باطمینان تمام بتدریس	تمام معاملات کی پریشانیاں اپنے سر لیں اور میں پورے
علوم مشغول می باشم (اغصان اربعہ مطبوعہ ص ۱۴۴)	اطمینان کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گیا

[illegible] (بانکی پور)

اس کا مطلب یہی ہوا کہ درس و تدریس کی اصل ذمہ داری ملا نظام الدین اپنے ہی سر لیے رہے اور بجا طور پر ان کی درسگاہ "مدرسۂ ملا نظام الدین" کے نام سے تاریخ میں یاد کی جاتی ہے لیکن ایسی کوئی عمارت جو مدرسہ کہلاتی ہو، ملا نظام الدین کے زمانے میں فرنگی محل میں نہ تھی، ان کا گھر یا گھر سے متصل مسجد ہی انکی درسگاہ ہونا چاہئے۔ مسجد میں درس دینے کی روایت ایک واقعہ کے ضمن میں ملا بحر العلوم سے ہے :-

چنانچہ روزے مولانا علیہ الرحمۃ گوشۂ مسجد	(ملا بحر العلوم بیان کرتے ہیں) چنانچہ ایک دن
نشستہ مرا درس می دادند کہ درین ہنگام دو	مولانا رحمۃ اللہ علیہ (ملا نظام الدین) مسجد کے
جوان خوبترو مسجد در آمدند الخ	کونے میں بیٹھے مجھے پڑھا رہے تھے کہ دو خوبرو
(عمدۃ الوسائل قلمی)	نوجوان مسجد میں آگئے الخ

اور یہ مسجد بھی بعض خاندانی روایات کی رو سے ملا صاحب کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی، "حویلی فرنگی محل" کا قدیمی جزو نہ تھی، اور نہ ہونا چاہیے تھی، یہ بھی مسموع ہوا ہے کہ محراب مسجد کے شمالی حصے میں جو منبر ہے اس کے تینوں زینوں میں سے اوپر کے زینے کا پتھر ملا صاحب کے پیرو مرشد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کا رکھا ہوا ہے، اور یہ خود اپنی آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے کہ مرشدی حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی خطبۂ جمعہ کے لیے جب منبر پر کھڑے ہوتے تھے تو ادباً تیسرے (آخری زینے) پر نہیں کھڑے ہوتے تھے، بلکہ دوسرے زینے

سے خطبہ دیتے تھے، یہی معمول مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے جانشینوں اور اماں جمعہ کا ابتک ہے، اس کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ اوپر کی سیڑھی کا پتھر حضرت سید صاحب بانسویؒ کے دست مبارک کا رکھا ہوا ہے اس لیے اس کو زیر پا نہ آنا چاہیے۔

امور خانگی اور معاملات زمینداری، جن کے متکفل ملا صاحب کے بھتیجے ملا احمد عبدالحق رہے، کیا تھے؟ اس کی تفصیل صاحب اغصان اربعہ نے جو خاندان فرنگی محل کے ممتاز مورخ تھے، اس طرح بیان کی ہے:-

ہر چند فرنگی محل بفرمان پادشاہی معاف شدہ	اگرچہ فرنگی محل شاہی فرمان کے تحت ہبہ ہوا تھا
بود لیکن رعایائے متعلقہ آں قبضہ نمی دادند	لیکن ان عمارات پر قابض لوگ قبضہ لینے نہیں دیتے
و تمرد و سری و داشتند بمساعی جمیلہ ملا احمد	تھے اور سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے، ملا احمد عبدالحق
عبدالحق زیر و زبر شدند و سربرعیت گری نہادند	کی کوششوں سے یہ لوگ زیر ہوئے اور کرایہ داری کے
و سرخط کرایہ بنام او نوشتہ دادند چرا کہ بسبب	سرخط ملا احمد عبدالحق کے نام لکھے گئے، اس لیے کہ
حلیکہ مولانا نظام الدین داشت شکستگی خاطر	ملا نظام الدین کے مزاج میں ایسی نرمی تھی کہ کسی شخص
احدے بروناگوار بود، ہر کس کہ بخدمت او	کی بھی دلشکنی ان کو ناگوار معلوم ہوتی تھی، اور جب
نالش ملا احمد عبدالحق می کرد ومی فرمود کہ	لوگ (رعایا) ملا احمد عبدالحق کے خلاف ملا نظام الدینؒ
اوشاں مالک اند ہر چہ خواہند بکنند من	سے اپیل کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ ملا احمد عبدالحق
اختیار ندارم	ہی مالک ہیں، جیسا چاہیں کریں، مجھے ان کے کاموں
(اغصان اربعہ از ملا ولی اللہ فرنگی محلی مطبوعہ)	میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔

مذکورہ اقتباس سے، جو ایک ایسے کی تحریر کا ہے جو فرنگی محل کے علمائے فرنگی محل سے آباد ہونے کے صرف پچھتر سال بعد اس خاندان میں پیدا ہوا تھا، مزید وضاحت ہو گئی کہ فرنگی محل یا حویلی فرنگی محض ایک مکان نہ تھا بلکہ اصل حویلی کے ساتھ متعلقات حویلی بھی تھے، جن میں کرایہ دار رہتے تھے، جو خاندان ملا قطب الدین کی ملکیت

ماننے اور قبضہ دینے میں سرکشی سے کام لے رہے تھے، ابر نیر کے سفر نامے کا یہ ٹکڑا "فرنگی محل یا فرنگیس کا محل میں" اور فرمان شاہی کا یہ اشارہ "یک منزل حویلی فرنگی با متعلقہ آن" اس اقتباس کی روشنی میں بہت واضح ہو جاتا ہے۔

ملا قطب الدین شہید کا کنبہ جب اس حویلی میں منتقل ہوا ہے تو نصف درجن کے قریب مرد و زن و اطفال سے زیادہ پر مشتمل نہ تھا، یعنی ملا سعید بن ملا قطب الدین شہید، بیوۂ ملا قطب شہید، والدۂ ملا قطب شہید، زوجۂ ملا محمد اسعد اور ان کے ایک کم عمر بیٹے ملا غلام مصطفےٰ، زوجۂ ملا سعید اور ایک نو عمر بیٹے ملا محمد احمد عبد الحق، ملا نظام الدین اور ان کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا، اس چھوٹے سے کنبے کے لیے اصل حویلی فرنگی، کافی تھی، متعلقاتِ حویلی سے قابضوں کی بے دخلی کی کوئی ضرورت اس وقت نہ تھی، مولانا عنایت اللہ مرحوم فرنگی محلی لکھتے ہیں:۔

"اس کوٹھی (اصل حویلی) میں سب لوگ سکونت پذیر ہوئے، جب اولاد بڑھی اور جگہ کی تنگی ہوئی تو ملا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کوٹھی کے جنوب جانب اور ملا رضا نے شمال جانب اور ملا اسعد کی اولاد نے اس کوٹھی کے اصطبل کو کھدوا کر مکانات بنوا لیے ملا سعید کے صاحبزادے (ملا احمد عبد الحق اور ملا عبد العزیز) اسی میں (اصل حویلی میں) رہتے رہے، ملا عبد العزیز کا نکاح مفتی مراد کی بیٹی سے ہوا تھا، اور اہل و عیال محلہ "سوتے ہٹی" میں مفتی مراد کے یہاں قیام پذیر تھے، اس لیے یہ کوٹھی (حویلی) مولانا عبد الحق کا مسکن رہی۔"
(تذکرہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ)

اولاد بڑھنے اور جگہ کی تنگی ہونے کے بعد ہی "متعلقات حویلی" کو اپنے قبضہ میں لینے اور حسب ضرورت اس کی تعمیر میں رد و بدل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہوگا اور اس وقت ملا نظام الدین ایک مشہور شخصیت ہو چکے تھے، طلبۂ علوم جوق در جوق ان کی خدمت میں آنے لگے تھے اور درس و تدریس

کے انہماک میں ان کو خاندان کے بڑے اور بزرگ ہونے کے باوجود جائیداد کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، اس لیے کچھ دنوں ملا صاحب کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا یہ ذمہ داری سنبھالے رہے،

و مختار امور خانگی مولوی محمد رضا بود	خانگی امور کے مختار کل ملا محمد رضا رہے
پس وے مولوی عبد الحق	(وہ "قال" سے حال میں چلے گئے، پھر گھربار
(محاسن رزاقیہ قلمی از ملا عبد الاعلی	وطن اور ملک چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے تو)
فرنگی محلی، حفید ملا نظام الدینؒ)	ان کے بعد ملا احمد عبد الحقؒ نے مختار کل
	کے فرائض انجام دیے۔

بہرحال ملا نظام الدین کی درسگاہ حویلی فرنگی کی اصل عمارت تھی، یا مسجد فرنگی محل، یا حویلی کے جنوب میں ملا صاحب کا تعمیر کردہ مکان تھا، درسگاہ میں زیر تعلیم طلبہ کا قیام کہاں رہتا تھا؟ دو چار یا دس پانچ طلبہ کے لیے یہ قیاس کر لینا ممکن بھی ہے کہ استاد کی دی ہوئی کسی جگہ یا قریبی مسجد میں رہتے ہوں گے، مگر ملا صاحب کے طلبہ کی کثرت کے پیش نظر یہ قیاس کام نہیں دے سکتا، روایات یہ بتاتی ہیں کہ ملا صاحب کے طلبہ فرنگی محل سے تقریباً ایک میل دور واقع مزار شاہ پیر محمدؒ پر رہتے تھے،

"باقی"

دربارِ اکبری کا ایک غیر معروف شاعر
ثنائی[1]

از جناب ڈاکٹر نصیر احمد صاحب صدیقی

ثنائی کا شمار فارسی زبان کے ان ممتاز شعرا میں ہے، جنھوں نے ایک طرف ایران کے درباروں کو اپنی نوا سنجی سے رشک چمن بنایا، اور دوسری طرف ہندوستان کی شاہی محفلوں کو اپنے نغموں سے گرمایا،

اس کا پورا نام "خواجہ حسین" اور تخلص "ثنائی" تھا، اس کے بارے میں تقریباً تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے،

بعض مخطوطوں میں "ثنائی" (م ۹۹۵ھ) کو "حکیم سنائی" (م ۵۲۵ھ) سے ملتبس کر دیا گیا ہے[2]، جو کسی طرح درست نہیں،

خاندان | مآثر رحیمی کا مصنف ثنائی کے علو نسب وحسب کی تعریف کرتا ہے، ثنائی کے باپ کے نام میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ آذر نے آتشکدہ میں اس کا نام "عنایت مرزا" بتایا ہے،

عبد النبی نے میخانہ میں[3] "غیاث الدین علی" لکھا ہے، ان کے برخلاف مآثر رحیمی[4] اور خلاصۃ الاشعار[5]

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب بزم تیموریہ میں ثنائی کا مختصر ذکر کیا ہے، اس مضمون میں اسکی تفصیل پیش کیا گیا ہے.
[2] دیوان ثنائی (جواہر میوزیم، آزاد لائبریری۔ علی گڑھ) [3] میخانہ، ص ۱۱۱ (مہر عالم کلکشن آزاد لائبریری علی گڑھ)
[4] مآثر رحیمی، ص ۴۴۳ ج سوم (آزاد لائبریری علی گڑھ [5] خلاصۃ الاشعار، علمی (حبیب گنج کلکشن آزاد لائبریری، علی گڑھ)

کے مصنف نے "غیاث الدین، محمد تحریر کیا ہے، بلاخمین نے بھی دیباچۂ دیوان ثنائی کے حوالہ سے "غیاث الدین محمد" ہی کو صحیح قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آتشکدہ کے مصنف نے غلطی سے "غیاث" کو "عنایت" پڑھ لیا۔ ہمارے نزدیک بھی غیاث الدین محمد ہی لائق ترجیح ہے۔

بعض اہل تذکرہ نے غیاث الدین محمد کے ساتھ "بزازی" کی نسبت کا اضافہ کیا ہے، جو ممکن ہے مشتبہ ہو، کیونکہ ثنائی کے باپ کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ پیشہ کے لحاظ سے بزاز تھا، مگر اس صورت میں اس کے لیے صرف لفظ 'بزاز' کافی تھا، بزازی کی نسبت کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ میخانہ کے مصنف نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس پیشہ سے اس کا کاروبار کافی ترقی کر گیا تھا۔

"اوقات بہ بزازی میگذرانیدہ، تا دراں پیشہ سامان لبیاری بہم رسانیدہ است ـــــ"

مولد | 'مشہد مقدس' خراسان کے شمال مشرق میں ہے اور امام ہشتم حضرت ابوالحسن علی الرضا کے مرقد کی وجہ سے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ علم و ادب کے نقطۂ نظر سے بھی مشہد کو خاص اہمیت حاصل ہے، چنانچہ غزالی، قدسی، نظری، مشرقی، نسبتی، واقفی، اقدسی، دانشی، یاذل، قاسم دیوانہ جیسے شعرا اسی خاک پاک سے اٹھے اور اپنے اپنے زمانے میں شعر و سخن کی شمعیں روشن کر گئے۔ ثنائی کو بھی اسی سرزمین سے نسبت ہے۔[1]

ابتدائی زندگی اور علمی استعداد | مشرقی شاعری خصوصاً فارسی اور اردو شاعری پر بجا طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں مقامی رنگ نہ ہونے کے برابر ہے، شعراء کے قصائد اور غزلیات کے دفتر کے دفتر پڑھ جایئے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر نے کس ماحول میں زندگی بسر کی، اس کے ابتدائی حالات کیا تھے،

[1] مآثر رحیمی، ص ۴۵۴ ج سوم۔ میخانہ، ص ۱۹۸۔ عالم آرای عباسی، ص ۱۸۱ ج اول۔ تذکرۃ الشعراء ص ۴۴۲ تذکرہ نتائج الافکار ص ۱۳۳۔

ملک میں سیکڑوں انقلابات اور حوادث رونما ہوتے ہیں مگر شاعر اپنے گرد وپیش سے ایسا بے خبر اور بے تعلق ہوتا ہے کہ گویا وہ مادی دنیا سے ماورا کوئی دوسری مخلوق ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان شعرا، کے کلام میں (بلکہ ان کے ذہن میں) زمان ومکان کا تصور اتنا مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے کہ اس کی بنا پر ہم ان کی زندگی کے بارے میں کوئی قطعی دعویٰ نہیں کر سکتے اور نہ ان کے بیانات سے ان کے ممدوحین کی نسبت کوئی یقینی بات کہی جا سکتی ہے۔

ان حالات میں ثنائی کا کلام بھی ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔ تلاش کے باوجود اس کے مجموعۂ اشعار اور تذکروں میں بھی اس کی صراحت تو کیا، اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے اس کے دربار شاہ ایران سے توسل یا شہزادہ ابراہیم میرزا سے وابستگی کی تفصیلات یا خود شاعر کی عمر اور اس کی زندگی کے واقعات جاننے میں مدد ملے، البتہ اس کی علمی استعداد کے بارے میں تھوڑی سی واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی جو کچھ ملا وہ اس کے کلام کے مطالعہ سے ملا ہے، کسی خارجی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا، اس نے اپنے دیوان میں جو دیباچہ لکھا تھا،[۱] اس میں بھی کچھ نہیں ہے۔

علوم متداولہ سے ثنائی کی شناسائی کا قیاس اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اشعار میں بعض علوم کی اصطلاحات کا بے تکلف و برمحل استعمال ملتا ہے، اور ایسے بہت سے اشعار ہیں کہ ان میں ہیئت یا ہندسہ کی اصطلاحوں کا برمحل اور بے تکلف استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

باشیر چرخ پنجۂ مردی در افگنم ... گر یک رہم دہی بہ میانِ سگاں نشست
چرخ از محیط جاہ تو خود را بروں ندید ... نقطہ ز خط دائرہ سے برکراں نشست

---

[۱] آثر رحیمی، ص ۲۰۵ ج سوم

زہرہ کو اصل شادمانیہاست — ولئی نغمۂ رباب منست

دریغ کہ قہرمان چرخ است — در کشتن کس امان ندیداست

فراشئی درگہ ترا چرخ — بروائی ہفتمین نوید

اس کے علاوہ اس کے اشعار میں بعض غیر معروف تلمیحیں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً

منم نوحی کہ از طوفان جا نزادامان دارد — بہ بہبود کساں دست دعا بر آسماں دارد

حضرت نوحؑ اور ان کے طوفان کا واقعہ کون نہیں جانتا، لیکن ثنائی نے شعر مذکور کے مصرع ثانی میں حضرت نوحؑ کی جس دعا کی طرف اشارہ کیا ہے، اس تک خیال آسانی سے نہیں پہنچتا[1]۔

اسی طرح جہاں حضرت موسیٰؑ اور سامری کی متعارف تلمیح ہے، وہاں حضرت موسیٰ کا اپنے بھائی حضرت ہارونؑ سے ناراض ہونا ایسا واقعہ ہے جو نسبتاً غیر معروف ہی، ثنائی لکھتا ہے:

گاہ از سحر سامری نفسی — موسیٰ با برادر اندازد

قصیدہ نگاری | ثنائی کی شہرت زیادہ تر اس کے قصائد کی وجہ سے ہے۔ قصائد میں وہ خاقانی کا مقلد تھا، اس کی زمینوں میں اس نے متعدد قصیدے کہے ہیں، مثلاً

خاقانی	ثنائی
۱۔ صبحدم چوں کلہ بند د آہ دود آسائے من	۱۔ صبحدم طوفاں کند چوں چشم طوفاں زائے من
چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمائے من	ساغر خورشید گردد جام خوں پیمائے من
۲۔ صبح چوں زلف شب براندازد	عشق ہر جا سخن در اندازد
مرغ صبح از طرب سر اندازد	زہرہ شیر ثریاں براندازد

[1] رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (نوح - رکوع ۲)
اے میرے پروردگار مجھ کو میری اور میرے ماں باپ اور جو مومن ہو کر میرے گھر میں پناہ لے اور تمام مومنین و مومنات کی خطاء درگذر فرما

ثنائی	خاقانی
ای از فروغ شمع رخت انور آئینہ	۳. ما فتنہ بر توایم و تو فتنہ بر آئینہ
وی گشتہ از خیال تو جاں پرور آئینہ	ما را نگاہ در تو ترا اندر آئینہ
دیدہ راستانِ شب صبحی کہ گریاں دیدہ اند	۴. شب رواں از صبح صادق کعبۂ جاں دیدہ اند
صبح را چوں چشم گریاں خوں براں دیدہ اند	صبح را چوں محرمانِ کعبہ عریاں دیدہ اند

اس کی مثالیں اور بھی ہیں، مگر اس کا استقصا مقصود نہیں، دکھانا صرف یہ ہے کہ ثنائی، خاقانی کا دیوان پیش نظر رکھتا تھا، اور اس کے تتبع یا جواب کی کوشش کرتا تھا، اس نے کہیں کہیں خاقانی پر چوٹ بھی کی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:

حقا کہ بدیں صفا عروسی — مشاطۂ شیرواں ندیدست

دوسری جگہ رقمطراز ہے:۔

انچہ زیں پیش گفت خاقانی — وصف حال من و بیان منست
از قرینم زماں تہی ست کہ ہست — در عدم آنکہ ہمقرانِ منست

جس وقت اس نے یہ اشعار لکھے ہوں گے، اس وقت یقیناً خاقانی کا یہ شعر اس کی نظر میں ہوگا،

ز تراز خائی ہر البی نترسم از انکہ — ہنوز در عدم است آنکہ ہمقرانِ منست

ثنائی نے بعض قصائد میں ظہیر فاریابی اور کمال اصفہانی پر بھی تعریض کی ہے، چنانچہ اپنے ممدوح سے خطاب کرتے ہوئے ظہیر فاریابی کے متعلق کہتا ہے:۔

شاہنشہا گر از رہ کفراں ظہیر گفت[1] — بیتی کہ انفعال قزل ارسلاں دہد
من آں محققم کہ برنگ ثنائے تو — کہ دم کہ آب روئی دگر شہرِ یاں دہد

---

[1] ظہیر کا مشہور شعر یہ ہے:۔ شاید کہ بعد خدمت سی سالہ در عراق
تا تم ہنوز خسرو مازندراں دہد

گرو جن و انس مرا دیدہ چین خواب — نام غنیں کہ خسرو ماش ندران دید

کمال اصفہانی کی نسبت بھی اس کا رویہ ایک حد تک معاندانہ ہے، ملاحظہ ہو:-

در ہندم و بر کف خیالم — سیبے ست کہ اصفہان ندیدست

ایک دوسرے شعر میں صاف صاف کہتا ہے

دانی کہ سحر ساز صفاہاں چہ گفتہ بود — وقتی کہ داوش این گہر شاہوار دست

دوشیزگان خاطر من بین کہ غنچہ وار — بررو نہادہ اند ز تو شرمسار دست

کہیں کہیں جوش میں آکر انوری کی برابری کا بھی دعویٰ کر بیٹھتا ہے

شہا بمدح تو این نظم راچنان گفتم — کہ انوری کند اندر برابرم تسلیم

اس بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ثنائی کو ان استادانِ کامل کے مقابلہ میں برتری یا برابری کے دعویٰ کا حق ہے، بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، یہ دکھانا مدنظر ہے کہ ثنائی کو فارسی سرایۂ شعر و ادب پر خاصا عبور تھا۔

اس کی علمی استعداد کی دوسری شہادت زحافات کا استعمال ہے، متداول بحروں میں شعر موزوں کرنا چنداں دشوار نہیں، اکثر کم سواد مگر موزوں طبع بھی ان بحور میں طبع آزمائی کر لیتے ہیں، لیکن زحافات کا استعمال علم عروض کی واقفیت کے بغیر بہت مشکل ہے۔

ثنائی کے کلام میں زحافات کے استعمال کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں:-

فتادہ از پا گاوِ زمیں ز غایت حمل — سر بریدہ ز بس بر سرِ سناں برخاست

عدل تو از طریق مکافات باز داد — ظلمی کہ از خلائق بر یکدگر رسید

ز فیض رای تو باشد کہ میدہد با خلق — بچشم اعمی از روشنی نشاں گوہر

غمیں مباش ازیں حضرت ار چہ یکچند ی جدا فتادی از گردشا سپہر لئیم

اس نے اپنے بعض قصائد میں مشکل زمینوں "آفتاب، گوہر، نرگس" وغیرہ بطور ردیف استعمال کیے ہیں، اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ (ثنائی) اپنے دوسرے معاصرین کی طرح ان مرحلوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوا ہے،

حقائق بالا کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے جب ہم اس کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی جیسے ذمہ دار فاضل کا یہ جملہ پڑھتے ہیں کہ " اگرچہ عامی بیادہ است وعبارا تش وفاباآں قصیدہا ی بلند اونمیکند ـــــ اما بہر حال شاعر طبیعت دار است"[1]

بدایونی کے بے لاگ مورخ، سخن سنج ناقد اور زبردست عالم ہونے میں شبہ نہیں انھوں نے ثنائی کے بارہ میں ایسی رائے کیوں ظاہر کی، بظاہر اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ملا صاحب کا معیار تنقید بہت بلند تھا اور وہ ثنائی سے اسی عالمانہ اسلوب کی توقع رکھتے تھے، جو خاقانی وغیرہ سے مخصوص ہے، ورنہ اوپر کی دی گئی مثالوں کے ہوتے ثنائی کو " عامی بیادہ" کہنا حقیقت سے دور ہے۔

ثنائی کا تغزل | ایران میں اس عہد میں دو دبستان شاعری مقبول تھے، ایک کا بانی "بابا فغانی" مانا جاتا ہے، جس نے تازہ گوئی (ندرت خیال یا اسلوب) کی بنا ڈالی، دوسرا "شرف جہاں قزوینی" تھا، جس کی خصوصیت معاملہ بندی یعنی عاشق ومعشوق کے روابط کا بیان ہے، صفوی عہد کے شعرا میں شفائی، محتشم کاشی، علی قلی میلی، ثنائی، غزالی اور وحشی اس میں شہرت رکھتے ہیں،

ایرانی شعراء جب ہندوستان آئے تو شاعری کا ورثہ ساتھ لائے، اگرچہ انصاف یہ ہے کہ ہندوستان کی آب وہوا نے ایرانی سرائے کی قدر وقیمت بڑھا دی۔

---

[1] منتخب التواریخ ص ۲۰۸ جلد سوم۔

ثنائی مشہدی پہلے دبستان سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ ہم آگے عرض کریں گے۔ اس نے اپنی غزلوں میں خیال بندی اور جدت ادا پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس لئے ہم ثنائی مشہدی کی غزل کی خصوصیات بیان کرتے ہیں، جو اس کے دیوان کے مطالعہ کے بعد ہماری نظر میں آئیں۔

(۱) ان میں پہلی چیز ثنائی کا حسن خیال اور مضمون آفرینی ہے، جس کو تخئیل بھی کہا جا سکتا ہے، عموماً تخئیل اور محاکات کو شعر کی بنیاد کہا جاتا ہے، لیکن دراصل شاعری بہت کچھ تخئیل ہی کا کھیل ہے، تخئیل کا سررشتہ فکر سے ملتا ہے، اگر شعر میں فکری عنصر نہ ہو تو وہ عوام کو تو شاید اپیل کرے، مگر خواص اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ تخئیل یا فکر ہی کی بدولت شاعر نئی نئی وادیوں کا سراغ لگاتا اور نادر تشبیہات ڈھونڈھ کر لاتا ہے۔ ثنائی کے چند شعر جن میں خیال کی خوبی پائی جاتی ہے، نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

مثلاً یہ کہنا مقصود ہے کہ محبوب کا لب لعل، عاشقوں کی جان لے لیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ عشق کی بدولت عاشق حیات تازہ پاتا ہے، اس لحاظ سے یہ سودا کچھ گراں نہیں، اس مضمون کو وہ یوں ادا کرتا ہے، ع

لعلت بفسوں چو جاں بد زدد دل جانِ دگر ازاں بد زدد

یہ بیان کرتا ہے کہ جو چیز آسانی سے میسر آجاتی ہے، اس کی انسان کو قدر نہیں ہوتی اس کے لئے یہ پیرایہ اختیار کرتا ہے:

متاع بو فا دوی کہ در طور محبت جو دار نبود لذتِ دیدار نباشد

ایک جگہ لکھتا ہے،

مرا بسنگ بلا ہیچگونہ درناید کہ مست میردم و دردی در تقاضا دارم

یعنی بعض لوگ دیدہ دانستہ اپنے لئے مصیبت مول لیتے ہیں، اس کی تمثیل میں

کہتا ہے کہ میری مثال اس شخص کی سی ہے، جو ایک طرف تو نشے میں سرشار ہے، دوسری طرف آگے دیکھنے کے بجائے پیچھے دیکھتا ہوا چلتا ہے، ایسا شخص ٹھوکر نہ کھائے گا تو اور کیا ہوگا

شرط عشق است کہ ہم باز بدل بسپارد سخن عشق کہ از دل بزباں می آید

یعنی سچے عاشق کی شان یہ ہے کہ جوں ہی عشق کا راز دل سے زبان تک پہنچے زبان، امانت (راز) صاحب امانت (دل) کو لوٹا دے،

راز عاشق کہ شود فاش ملامت مکنید راز در سینہ بلائیست کہ من میدانم

یعنی اگر راز عشق فاش ہو جائے تو برائے خدا مجھے ملامت نہ کرو کیونکہ راز کا سینہ میں محفوظ رہنا کتنی بڑی مصیبت ہے، میں جانتا ہوں، دوسرا اس کو کیا جانے ــــ،

شور نمکت در جگرم باز نگنجد در حوصلۂ جان و دل ایں راز نگنجد

یک غمزہ نہاں زاں مژہ در کار دلم کن ہر چند کہ در طاقتم ایں راز نگنجد

بوئی با در و دیوار کوئش ہر دو زدم کہ بوی آشنائی زاں در و دیوار می آید

بظاہر شعر سادہ ہے، مگر کس قدر نیچرل اور اثر آفریں ہے،

چگونہ عرض تمنا کنم ببرت سخن ہنوز نیاوردہ بر زبان خجلم

یعنی اے محبوب! تیرے حضور عرض تمنا کیونکر کروں کہ ابھی دل کی بات زبان تک نہیں آئی، اور خجالت دامنگیر ہو گئی، جب دل میں خیال آنے پر یہ کیفیت ہے، اظہار خیال کرنے پر نہ جانے کیا گذرے ــــ،

معاملہ بندی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

شوم ہلاک نگاری کہ گاہ عشوہ کند چناں بغمزہ سخن کش زباں بیاساید

یعنی اس نگار پر جان کیوں نہ دیدوں جو ناز کرتے وقت اپنی چشم "سخن گو" سے

یوں پرشش حال کرتا ہے، کہ زبان کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی مضمون کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے،

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا پرشش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

در گردن جاں دوش حمائل شدہ دیدم دستی کہ بصد ناز نبوی کمر آورد

یعنی کل رات معشوق نے بڑے ناز سے ہاتھوں کو کمر تک لاکر انگڑائی لی نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ہاتھ میری روح کی گردن میں حمائل ہو کر رہ گئے۔

زبان | سوچنا اور فکر کرنا تمام انسانوں میں مشترک ہے، شاعر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی واردات قلبی کو موزوں اور دلنشین پیرایہ میں بیان کرتا ہے، علامہ شبلی نے ابن رشیق اور دوسرے ناقدین فن کے حوالہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "زیادہ تر اہلِ فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے، وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کرسکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون کن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، بندش کیسی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشاپردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہی ہے۔" (شعر العجم، جلد چہارم)

اس وصف میں بھی شتائی دوسرے اساتذہ سے پیچھے نہیں ہے، وہ اہلِ زبان ہے، اسلئے اس کے کلام میں لطف زبان کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

غمزہ آشوب و نگہ آفت و مژگاں خونریز چشم بد دور ہماں آفتِ جانست کہ بود

سوئی من آں بت طناز نیامد چکنم گفت می آیم و از ناز نیامد چکنم

یہ پوری غزل لطفِ زبان کا نمونہ ہے،

جس شعر میں وہ لطف زبان کے ساتھ شوخی اور طنز کا مضمون لاتا ہے، وہاں شعر کی تاثیر اور بڑھ جاتی ہے، مثلاً

گفتی کہ باین خواری از کیست چنیں حالت | چندیں ہمہ بیرحمی از خوی کہ می آید

یعنی محبوب، عاشق کی حالت دیکھتا ہے اور انجان بن کر پوچھتا ہے، "ارے اس بیچارے کا یہ حال کس نے کر دیا،" وہ جواب دیتا ہے کہ "یہ نہ پوچھو کہ اتنی بیرحمی اور ستم گری کس کا شیوہ ہے تم خود سمجھ سکتے ہو،

کمن در آئینہ عرض جمال خویش کہ است | کرشمہائے بلا چشم شوخ و شنگ ترا[1]

یعنی آئینہ میں اپنے جمال کی نمایش نہ کر کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے اپنی نظر نہ لگ جائے،

غزل پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا، اور ہر شعر مضمون کے لحاظ سے دوسرے سے بالکل جدا اور غیر مربوط ہوتا ہے،

ثنائی کے دیوان میں بعض غزلیں مسلسل ملتی ہیں، جن میں سر رشتۂ خیال، مطلع سے لیکر مقطع تک ہموار ہے، مثلاً وہ غزلیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں،

(۱) آن نازنین کہ دی ز برم خشمگیں برفت | شیرین چو شہد آمد و باز ہر کیں برفت

(۲) ہنوزت گرمی بازار خوبی آتش انگیزاست | ہنوزت از کرشمہ پای تا سر آرزو خیز است

(۳) بیا کہ ہر چہ بدل کردۂ بجان بکلی | بر آر تیغ کہ باروی آنچنان بکلی

---

[1] مومن لکھتا ہے:-

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں | اور بنجائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

بزم تیموریہ

مغل سلاطین، مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء و فضلا کا تذکرہ جس میں دربار اکبری کے غیر معروف شاعر ثنائی کا بھی ذکر ہے، (۱۰ ...) "منیجر"

جدید عربی زبان

پر

ترکی کے اثرات

مترجمہ حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

جب دو قوموں کا باہمی اختلاط اور میل جول ہوتا ہے تو جہاں وہ دونوں ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن اور عقائد و خیالات سے متاثر ہوتی ہیں، وہیں دونوں کی زبانوں میں بھی لین دین کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات یہ اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ زبان کی انفرادیت ختم ہو کر اس کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے، لیکن ایک زندہ زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں ضم ہونے کے بجائے وقت کے تمام انقلابات و تغیرات کا مقابلہ پوری ثبات قدمی کے ساتھ کرتی اور اپنے دامن کو وسیع تر بناتی چلی جاتی ہے، لسانیات کی تاریخ شاہد ہے کہ عربی زبان ہمیشہ ان آزمایشوں میں پوری اتری اور سائنسی اور ٹکنالوجیکل اختراعات و اکتشافات سے الفاظ و اصطلاحات کے ذخیرہ میں جو بھی اضافہ ہوا عربی نے ان سب کو خوش آمدید کہا، اس طرح آج جدید عربی دنیا کی تقریباً ہر ترقی یافتہ علمی اور غیر علمی زبان کے الفاظ سے مالا مال ہے،

سولھویں صدی میں جب ترکوں نے عرب ممالک کو اپنے قلمرو میں شامل کیا تو عرب اور ترک اقوام کے اختلاط نے ایک دوسرے پر بہت گہرے تہذیبی و لسانی اثرات ڈالے بالخصوص شرق اوسط کی زبانوں میں ترکی الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہو گئی ہے، اور

چونکہ خود ترکی زبان میں فارسی الاصل الفاظ کی کثرت ہے، اس لئے ترکی کے واسطے سے بہت سے فارسی الفاظ بھی عربی زبان میں دخیل ہو گئے،

ذیل میں سوڈان کے ایک فاضل اہل قلم استاذ عبد الرحیم کے ایک قابل قدر مقالہ کا ترجمہ ناظرین "معارف" کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے، جس میں ان عربی الفاظ کو یکجا کر دیا گیا ہے جو یا تو ترکی الاصل ہیں یا اصلاً تو فارسی ہیں لیکن بواسطہ ترکی عربی میں دخیل ہو گئے ہیں، اس فہرست کو مکمل کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا، علامہ سید سلیمان ندوی کی "لغات جدیدہ" میں اس قبیل کے بہت سے الفاظ ہیں، "معارف" کے گذشتہ شماروں میں اردو زبان کے ترکی عنصر پر کئی گراں قدر مقالات شائع ہو چکے ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ عربی پر ترکی کے اثرات کی بھی ایک جھلک دکھا دی جائے،　　"نعیم ندوی"

گذشتہ ۱۹۶۲ء میں مجھے قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کی زبان میں بعض الفاظ جیسے سادہ، طازہ (تازہ)، خانہ (گھر)، تفتیش، بخشش، پہلوان، ترزی (درزی) اور جنزیر (زنجیر) وغیرہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ الفاظ اسی مفہوم و معنی میں ہماری اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں، چنانچہ میرے جذبۂ تجسس کو وہ راز معلوم کرنے کی خواہش ہوئی جس کی وجہ سے جدید عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یہ الفاظ موجود ہیں، معمولی تلاش و تحقیق کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ درحقیقت یہ فارسی الاصل الفاظ ہیں جو اردو زبان میں دخیل ہیں، اور یہی الفاظ ترکی (جو کہ فارسی سے مالا مال ہے) کے واسطے سے عربی زبان میں داخل ہو گئے،

اسی اثنا میں میرے ایک مصری دوست نے تاریخ لسانیات کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک کتاب دی، میں نے کچھ اس سے، کچھ دوسرے ماخذوں سے اور کچھ ذاتی تجربات و مشاہدات سے وہ تمام ترکی الفاظ یکجا کر دیئے، جو مصر، سوڈان، لبنان اور اردن کی زبانوں

ہیں عام طور سے استعمال کئے جاتے ہیں،

عہد مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کے زمانہ میں جدید عربی بالخصوص مصری زبان ترکی سے شدید طور پر متاثر ہوئی، گو مرور وقت کے ساتھ اس شدت میں کمی واقع ہو گئی، پھر بھی عربی زبان میں ترکی الفاظ کی کثیر تعداد نہ صرف عامی، بلکہ علمی و ادبی زبان میں اب بھی باقی ہے مثال کے طور پر شبرق (سرود موسیقی) بصمہ (چھاپ، طبع) جمرک (چنگی، چنگی گھر) طابو (زمین کا ٹیکس، دستاویز) طاقم (لڑی، سوٹ) قنبلۃ (بم، توپ کا گولہ) نیشان (تمغہ۔ نشان، علامت) وغیرہ،

ذیل میں بترتیب حروف ہجا ایسے الفاظ کی فہرست درج کی جاتی ہے، اس میں پہلے معرب ترکی الفاظ اور ان کی تشریح ہے، پھر جن کا تلفظ دوسرے ملکوں میں مصری بولی سے مختلف ہے، اس کی نشاندہی کی گئی ہے، پھر لاطینی رسم الخط میں اصل ترکی کو واضح کیا گیا ہے۔ (جدید ترکی لاطینی حروف میں لکھی جاتی اور اکثر انگریزی زبان کی طرح بولی جاتی ہے)

الف | ابلہ، غیر شادی شدہ کمسن عورت کو مخاطب کرنے کا لفظ اصل ترکی abla بمعنی بڑی بہن،

اجزجی: دوا فروش، عطار، ترکی Eczaci

اجزخانہ: دواخانہ، ڈسپنسری۔ ترکی Eczane Eczahane یہ عربی کے کلمہ "اجزاء" اور فارسی کے "خانہ" سے مرکب ہے، ترکی میں اجزاء دوا کے معنی میں آتا ہے،

ادبخانہ: بیت الخلاء، پاخانہ، لیٹرین، جدید ترکی میں یہ لفظ نہیں پایا جاتا،

آفندی: شرفا اور معززین کے نام کے ساتھ بطور "صاحب" کے جدید عربی میں مستعمل ہے، کبھی اس سے شریف آدمی بھی مراد لیتے ہیں، یہ لفظ یونانی الاصل ہے ترکی Efendi

الای، رجمنٹ، فوج کا دستہ۔ ترکی Alay،

انجلیزی:۔ انگریز، ترکی Ingiliz یہ دراصل اٹالین لفظ Inglese سے ترکی میں آیا ہے،

اوربا، براعظم یورپ، ترکی Avrupa اٹالین لفظ Europa سے ترکی میں دخیل ہوا،

اورطہ: ایک ہزار فوجیوں پر مشتمل دستہ، ترکی Ordu بمعنی لشکر" اردو کا لفظ اسی سے بنا ہے، اور انگریزی لفظ Horde بمعنی قبیلہ بھی اسی سے نکلا ہے،

اورمان: قاہرہ میں ایک باغ کا نام۔ ترکی Orman بمعنی جنگل،

اورنیک: سارٹیفکٹ۔ ترکی Ornek بمعنی نمونہ، سوڈان میں اس لفظ کا بکثرت استعمال ہے،

اوسطی: استاد، باورچی، ڈرائیور، ترکی Usta

اوضۃ: کمرہ، بالاخانہ، دفتر، ترکی Oda، وہ بھی اس کا تلفظ کرتے ہیں،

اونباشی: دس سپاہیوں کا افسر جس کو Corporal کہتے ہیں، اسے امباشی بھی لکھا جاتا ہے، ترکی Onbasi

ب | باش: افسر جیسے باشکاتب (ہیڈ کلرک) باش مہندس (چیف انجینیر)، ترکی Bas بمعنی سردار،

باشا: اعلیٰ عہدیدار اور معززین کا خطاب، ترکی Pasa

باشختہ، تختہ سیاہ، ترکی Pastahta یہ لفظ فارسی پیش تختہ سے ترکی میں آیا اور پھر اس سے عربی میں دخیل ہوا،

بامیا: بھنڈی۔ ترکی Bahcivan

بخشوبجی: باغبان۔ ترکی Bahcivan

بدروم: باؤلی، تہ خانہ، اس کو بدرون بھی بولا جاتا ہے، ترکی Bodrum بمعنی تہ خانہ،

برتقال: میٹھا نارنگی، برتقان اور بردقان بھی تلفظ کرتے ہیں، ترکی Portakal ۔ اصلاً یہ لفظ اٹالین Portogalla سے ترکی میں آیا، اور پھر اس کے واسطے سے عربی میں منتقل ہوا،

برجل: پرکار۔ ترکی Pergel

برطمان: مرتبان،

برواز: تصویر یا آئینہ کا چوکھٹا۔ ترکی Parvaz اصلاً اٹالین لفظ ہے،

بروجی: بگلچی، نقارچی: ترکی Boru بمعنی بگل نقارہ،

بشرف: موسیقی، (تھیٹر میں ڈراما شروع ہونے سے قبل جو سرود ہوتا ہے، ترکی Pesrev فارسی سے ترکی میں آیا،

بصمہ: انگلیوں کے نشان۔ ترکی Basma بمعنی مہر،

بقسماط: بسکٹ، ترکی Peksimet

بقشیش: بخشش۔ ترکی، Bahsis فارسی الاصل ہے،

بک: ایک معزز ترکی لقب، Bey

بقجہ: تھیلی، ترکی Bohca

بکباشی: ایک فوجی عہدہ، ترکی Benbasi یعنی ایک ہزار سپاہیوں کا افسر

یہ ترکی زبان Bin بمعنی ہزار اور Bassi بمعنی سردار سے مرکب ہے،

بلطجی: جلاد، بلط قدیم عربی میں بھی تلوار کھینچنے کو کہتے ہیں، ترکی نسبت جی لگنے سے جلاد کے معنی پیدا ہوئے، مجازاً ظالم و جابر شخص پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، ترکی Baltchi۔

بلطہ: کلاڑی۔ ترکی Balta

بلیاصتو: مہر، خاتم شاہی، چھاپ۔ ترکی، Balyaco

بمبہ: بم، توپ کا گولہ، ترکی Bomba اصلاً اٹالین لفظ ہے،

بنج: پانچ، فارسی الاصل ہے،

بھریز: پرہیز۔ ترکی Pehriz یا Perhiz بمعنی روکنا فارسی الاصل ہے،

بھلوان: بازی گر۔ ترکی Pehlivan بمعنی ہیرو، بالکسر فارسی الاصل ہے،

بوظہ: شام و لبنان میں آئس کریم اور مصر میں ایک نشہ آور مشروب کو کہتے ہیں، ترکی Buz بمعنی برف،

بوغاز: آبنائے، دشوار گذار راستہ، دریا کا دہانہ۔ ترکی Bogaz،

بویہ: روغن، وارنش۔ ترکی Boya سوڈان میں اس کا بوھیہ تلفظ کرتے ہیں

بیادہ: پیادہ، پیدل۔ ترکی (Biyada) فارسی لفظ پیادہ سے ترکی میں آیا،

بیرہ: شراب، بیر، ترکی Bira اٹالین لفظ ہے،

تبہ: ٹیلہ (شامی زبان میں) ترکی Tepe بمعنی پہاڑ کی چوٹی، چھوٹا پہاڑ،

ت

تختروان: پالکی، فنس جس پر سوار ہو کر دلھن . . . . جیکہ سے سسرال آتی ہے، یہ لفظ فارسی الاصل ہے، اور تخت و رواں دو لفظوں سے مرکب ہے،

ترزی: درزی۔ ترکی Terzi

ترسانہ[1]: سلاح خانہ، کارخانہ، جہاز سازی، ترکی Tersane

تنبل: پان۔ ترکی Tembel فارسی الاصل ہے،

تنکہ: کنستر۔ ترکی Teneke

تیزہ: مصر عورت کو مخاطب کرنے کا لفظ۔ ترکی Teyze بمعنی خالہ اور مامی،

ج | جبخانہ: ذخیرہ۔ ترکی Gebhane

جدول:۔ ڈول۔ ترکی Gerdel

جزدان: چھوٹا منی بیگ، مصری زبان میں جزلان تلفظ کیا جاتا ہے، ترکی، Guzdan اصلاً فارسی لفظ ہے،

جزمہ: بوٹ، جوتا، ترکی، cizme

جفت: دونالی بندوق۔ ترکی cilt فارسی لفظ جفت سے بواسطہ ترکی عربی میں دخیل ہوا،

جمرک: چنگی، چنگی خانہ۔ ترکی cumrak

جنباز: پہلوان۔ نٹ، اسکو جبازبھی بولتے ہیں، یعنی ورزش بدنی، جمناسٹک کا ماہر۔ ترکی، camboz اصلاً یہ فارسی لفظ جانباز ہے، اسی سے ترکی میں جنباز اور عربی میں جباز ہوا،

جنزیر: زنجیر کا مقلوب۔ ترکی zincir اور zencir فارسی الاصل ہے

[1] علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ترسانہ عربی لفظ دار الصناعہ ہے، جو یورپ میں جاکر ڈارسنا ہوگیا اور ترکی سے بعینہ عربی میں چلا آیا، اور ایک جدید لفظ کی طرح مستعمل ہوگیا، "نعیم"

جوال: بورا، بڑا تھیلا، شام و مصر میں اس کا شوال تلفظ کرتے ہیں، ترکی cuval

جی: ماہر کے معنی میں جیسے تعلیمچی (ماہر تعلیم)، عربجی (ماہر عربیات) وغیرہ،

ح | حکمدار: وائسرائے، کمانڈر انچیف، گورنر۔ ترکی Hukumdar،

یہ عربی لفظ "حکم" اور فارسی "دار" بمعنی صاحب و مالک سے مرکب ہے،

خ | خازندار: خزانچی۔ ترکی Hazne

خانہ: مکان، گھر، ترکی Hane فارسی الاصل ہے،

خردہ: معمولی سامان تجارت، بساطی کی دوکان کی چیزیں، ترکی Hurde

فارسی الاصل ہے، بواسطہ ترکی عربی میں آیا،

خواجہ: بجائے "مسٹر" اور "جناب" کے استعمال ہوتا ہے، فارسی سے ترکی میں آیا،

خوجہ: معلم، استاد، ترکی Hoca

د | درابزین: سیڑھی اور زینہ کے دونوں جانب خوبصورت جنگلہ کی قطار۔ ترکی،

Terabzan

دستہ: کسی چیز کے بارہ درجن کا پیک، ترکی deste فارسی الاصل ہے،

دغری: مستقیم، ترکی Dogru

دمغہ: مہر نشان، بالخصوص سرکاری اور حکومتی اشیا پر لگائی جانے والی

مہر۔ ترکی، Damga فارسی لفظ تمغہ سے ترکی میں آیا،

دندرمہ: قلفی، برف کی جمائی ہوئی بالائی۔ ترکی Dondurma بمعنی برفانا

دونم: ترکی ایکڑ مساوی سوف مربع، عراق اور اردن میں بھی یہ اسی معنی

میں عام طور سے مستعمل ہے۔ ترکی Donum

ر | رشتہ: طبی نسخہ۔ ترکی Recete

رنغیہ: ایک قسم کی مچھلی۔ ترکی Ringa

روشن: روشندان،

س | سبت: ٹوکرا، چھابہ، ترکی Sepet یہ لفظ فارسی سبد سے ترکی میں آیا ہے

سرایہ: قصر، محل شاہی، ترکی Saray فارسی الاصل بواسطہ ترکی عربی میں داخل ہوا،

سفرجی: باورچی، بیرہ۔ ترکی Sofrachi سفرہ عربی لفظ ہے جس کے معنی دسترخوان کے ہیں، ترکی لفظ نسبت جی کے لاحقہ سے باورچی کے معنی پیدا ہوئے

سلخانہ: مذبح، مسلخ، میونسپلٹی کی طرف سے جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے جو مقام متعین ہوتا ہے، صحیح لفظ سلخ خانہ ہے، سلخ کھال کھینچنے کو کہتے ہیں،

سنجیہ: سنگین، جو بندوقوں کی نوک پر لگاتے ہیں، ترکی Sungu

سواری: فوجی سوار۔ ترکی، Suvari اصلاً فارسی ہے،

ش | شادر: اردنی زبان میں خیمہ اور مصری میں مخزن کے معنوں میں مستعمل ہے، ترکی Cadir تخت رواں اور چھوٹے مکان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے،

شاکوش: بڑا ہتھوڑا، فارسی لفظ چاکوش سے ترکی میں شاکوش ہوا، اور پھر بعینہ عربی میں داخل ہوگیا،

شاویش: ہیڈ کانسٹبل، سارجنٹ۔ ترکی Cavus

شرشف: بالاپوش، پلنگ کی چادر، ترکی Carsaf

شفخانہ: مصر میں یہ لفظ شفاخانہ حیوانات اور سوڈان میں مطلق اسپتال کے لئے

بولا جاتا ہے،

شلتہ: تیل چٹائی، ترکی silte

شنطہ: چمڑے بیگ، ترکی canta لبنان میں شنتہ تلفظ کرتے ہیں۔

شنکل: مچھلی کے شکار کا کانٹا، کواڑ کی سٹکنی، ہک، کپڑوں کی کھونٹی، ترکی cengel

شیشہ: حقہ کی چلم، سگریٹ کا پائپ۔ ترکی sesi بمعنی شیشہ، فارسی سے آیا ہے،

شو باش: شاباش، مرحبا، شادی کے دن دلھن پر سے جو رقم نچھاور کی جاتی ہے اسے بھی شوباش کہتے ہیں،

ص

صاغ: پورا سکہ، خالص، ترکی sag

صیوان: سائبان، ترکی Sazenam فارسی الاصل ہے،

ط

طازہ: تازہ نیا، ترکی Taza فارسی سے آیا ہے۔

طاقم: سوٹ، جہاز کے کپتان کا یونیفارم، لڑی، ۱۲ عدد کا سٹ، یونانی سے یہ لفظ ترکی میں آیا، اور پھر اس کے ذریعہ عربی میں داخل ہوا،

طاولہ: شام اور اردن میں میز کے معنی میں مستعمل ہے، اور مصر و سوڈان میں ایک قسم کے کھیل کو کہتے ہیں، ترکی Tavela

طبنجہ پستول۔ ترکی، Tabanca

طرشی: اچار ترکی (Tursu) فارسی لفظ ترشی سے آیا ہے،

طلمبہ: نل، کنویں سے پانی نکالنے کا پمپ، آگ بجھانے کا انجن، ترکی Tulunke

یہ اٹیالین لفظ (Tronke) سے ترکی میں آیا، اور پھر اس سے عربی میں مستعمل ہوا،

طوبجی: گولہ انداز، ترکی Topcu

ع| عطشجی: فائرمین، انجن میں کوئلہ جھونکنے والا، ترکی Atesci یہ فارسی لفظ آتش اور ترکی لاحقہ جی بمعنی والا سے مرکب ہے، عربی لفظ عطش سے اسکو کوئی نسبت نہیں

عفارم: آفریں، شاباش۔ ترکی Aferin

عنبر: کارخانہ، مخزن، انبار خانہ، مال خانہ، گودام۔ ترکی، Ambar غالبًا یونانی الاصل ہے،

ف| فابریقہ: فیکٹری، کارخانہ۔ ترکی Fabrika ایٹالین لفظ Fabrica سے ترکی میں آیا،

فانلہ: فلالین (کپڑا) ترکی Fanila اٹالین سے ترکی میں دخیل ہوا،

فرشاہ: برش جس سے کپڑے، جوتے یا دانت صاف کرتے ہیں، ترکی Firca

فستان: لہنگا، زنانہ پوشاک، ترکی Fistan

فنجان: چائے یا کافی کی چھوٹی پیالی۔ ترکی Fincan

ق| قائش: استرا تیز کرنے کا چمڑا، ترکی Kayis

قاوون: سردہ۔ خربزہ، ترکی Kavun

قرہ جوز: گڑیا، مورتی، کٹھ پتلی۔ ترکی Karagos اس کے اصل معنی سیاہ آنکھ کے ہیں،

قرش: ایک ترکی سکہ۔ پیاسٹر۔ ترکی Kurus اصلاً جرمنی Gros - Chen ہے، ترکی میں لفظ قروش مفرد ہے لیکن تعریب کرتے وقت اسے جمع قرار دیکر اس کا واحد قرش بنایا گیا،

قزان: تانبہ کا بڑا پتیلہ۔ ترکی Kazan

قزمة: کدالی، ترکی Kazma

قشلاق: فوجیوں کی بارک، اسپتال، ترکی Kisla

قلاوز: سوراخ کرنے کا آلہ شل برما، رہنمائے جہاز۔ ترکی Kilavuz

قنال[1]: مصنوعی نہر جو کھود کر کسی دریا سے لائی جاتی ہے، ترکی Kanal

اصلاً انگریزی Canal ہے، اس سے ترکی میں اور پھر عربی میں دخیل ہوا،

قنبلة: بم، توپ کا گولہ۔ ترکی Kumbra

قورمہ: محفوظ کیا ہوا گوشت، ترکی، Kavarma

(ک) کار: غلہ سے لدی ہوئی کشتی، پیشہ، عہدہ، ترکی Kar فارسی الاصل ہے،

کتبخانہ: کتب خانہ، مکتبہ، لائبریری، ترکی Kutuphane یہ عربی کتب اور فارسی خانہ سے مرکب ہے،

کرباج، چرمی کوڑا۔ ترکی Kirbac

کردان، مالا، ہار، کنٹھی۔ ترکی Gerdan lik

کوریك: پھاوڑا، کدالی، ترکی Kurek

کستنا، شاہ بلوط کی لکڑی یا درخت، ترکی، Kestane

کشتبان، انگشتانہ جو عموماً درزی سوئی سے حفاظت کی خاطر انگلی میں پہنتے ہیں، یہ اصلاً

---

[1] سید صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ قدیم زبان میں اس کے معنی یہ تھے کہ چند کوئیں قریب ملا کر اس طرح کھودے جائیں کہ کل مل کر ان کی ایک تالاب کی شکل بنجائے، اس خاص لفظ کے مستعمل ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ نہر کو انگریزی میں کنال کہتے ہیں تو اہل مصر اس کو قنال کہنے لگے، "نعیم"

فارسی لفظ انگشت بان بمعنی انگلی کی حفاظت کرنے والا سے ترکی میں آیا ہے

کشک: خیمہ، گنبددار محل، ترکی Kosk

کفتہ: کوفتہ (گوشت کا) ترکی Kofte اصلاً فارسی ہے، بواسطہ ترکی عربی میں داخل ہوا

کبشہ: مقدار ایک کفدست، مٹھی بھر ترکی Kepce

کفکیر: کفگیر، ترکی Kevgir فارسی الاصل ہے،

کلیم: فرش، غالیچہ، کمل، ترکی Kilim اصلاً فارسی،

کمنجہ: سارنگی۔ ترکی Kemence

کندرہ: انگریزی جوتا، بوٹ۔ ترکی Kundura

کہنہ: قدیم پرانا، آوٹ آف ڈیٹ، ترکی Kohne فارسی الاصل ہے،

کوبری: پل خصوصاً آہنی پل۔ ترکی Kopru

لغم: سرنگ، جس میں بارود بھر کر کسی چیز کو اڑاتے ہیں، ترکی Lagim اصلاً یونانی ہے، بواسطہ ترکی عربی زبان میں دخیل ہوا،

لوکاندہ: ہوٹل، ریسٹوران، ترکی Lokanta اصلاً اٹالین لفظ ہے،

ماسورہ: پانی کی نالی، سگریٹ کا پائپ، ترکی Masura

ماشہ: لوہاروں کی سنسی جس سے گرم لوہا پکڑتے ہیں، چمٹا جس سے انگاروں کو پکڑا جاتا ہے، ترکی Masa اصلاً فارسی کا ہے،

ماہیۃ: تنخواہ، مشاہرہ، مصر میں اس کی جمع ماہیات اور سوڈان میں مواہی تلفظ کیا جاتا ہے، اغلب ہے کہ یہ فارسی لفظ ماہ بمعنی مہینہ سے ترکی میں آیا ہے،

سکران: نشہ میں چور، مست، ترکی Mastue

مناورة: فوجی نقل و حرکت، ترکی Manevara یہ اٹیالین لفظ Manovera سے ترکی میں اور اس کی وساطت سے عربی میں دخیل ہے،

موضة: فیشن، وضع، ترکی Moda اصلاً اٹیالین ہے،

میدالیة: تمغہ- میڈل، ترکی Medalya اصلاً اٹیالین لفظ Medaglia ہے

ن نشان: علامت، نشان، ترکی Nisan

نمرہ: نمبر، عدد، شمار، ترکی Numara یہ اصل میں اٹیالین لفظ Numero سے ترکی میں دخیل ہوا ہے،

نیشان: تمغہ، ترکی Nisan فارسی الاصل ہے،

و وابور: اسٹیمر، ریل، اسٹیم انجن، ترکی Vapur اصلاً فرنچ لفظ Vapeur ہے، اس سے ترکی میں اور پھر عربی میں آیا،

ونش: بھاری بوجھ اٹھانے کی مشین۔ ترکی Vinc اصلاً انگریزی لفظ Winch ہے،

ی یاقة: گلے کا کالر جو کپڑوں کو میل سے بچانے کے لئے لگاتے ہیں، ترکی Yaka

یاور: شاہی محافظ، ایڈیکانگ، ایک شاہی عہدہ اعلیٰ، ترکی، Yaver

یای: اسپرنگ لوچدار کمانی، ترکی Yay

یخنی: یخنی (پلاؤ کی یخنی)، ترکی Yahni

یکی: جدید، نیا۔ ترکی، Yeni

یمکخانه: مطعم، ڈائننگ روم، یہ ترکی Yemek اور فارسی خانہ سے مرکب ہے،

یفطه: اشتہار، سائن بورڈ، ترکی Yafta

یوزباشی: کپتان، فوج یا پولیس، ترکی Yuzbasi بمعنی سو آدمیوں کا افسر، یہ لفظ Yuz بمعنی سو اور Basi بمعنی سردار سے مرکب ہے،

مترجم:۔ فاضل مقالہ نگار کی دی ہوئی مذکورۂ بالا فہرست کے علاوہ اس قسم کے چند اور الفاظ بھی درج کئے جاتے ہیں،

جزمجی، بوٹ ساز،

جزلك عینک،

جلاجی قفل گر

سنجق، سردار، افسر (فارسی بواسطہ ترکی)

شلتہ، پتلی چٹائی،

شنك، آتش بازی

عشی، باورچی (لفظ ترکی نسبت عربی)

قائزلا، برِ اعظم،

قباق، جنگی جہاز، پال

قائق، کشتی،

قماش، کپڑا،

قناق، جائے قیام، عہدہ داروں کی جائے قیام (کوارٹر)

قنجہ، چھوٹی کشتی، ڈونگی،

قنطرمہ، ایک قسم کی لگام،

قورس، بندوق کی گولی،

کلبش، ہتھ کڑی، ہاتھ کی زنجیر،

مودۃ، فیشن، وضع،

ورق تمغہ، پوسٹ اسٹامپ، تمغہ (مہر)

ورسل، ادائے تشکر کے موقع پر بولتے ہیں، تشکریہ، تھینک،

یافتہ، یافطہ، سائن بورڈ، کاغذ، اشتہار،

یدك، ٹٹو،

یلقان، خنجر، پیش قبض،

یکن، بھانجہ، بھتیجہ،

یکی، جدید۔ نیا،

یلك، ویسٹکوٹ، صدری،

یکیشری، ترکوں کی ایک قدیم فوج کا نام جس کو ینگچری فوج کہتے ہیں، نگہبان، سفارت خانہ، کسی سفیر کا آرڈلی،

شاہ حسین لاہوری

کا

ایک غیر معروف رسالہ "تہنیہ"

از جناب محمد اقبال صاحب مجددی۔ لاہور

شاہ حسین بن شیخ عثمان لاہوری جو اپنے دور کے ممتاز صوفیہ میں تھے ۹۴۵ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے،

سالِ ولادت "صبح صادق براوج فقر دمید" سے برآمد ہوتا ہے،

دس[1] سال کی عمر میں شیخ ابا بکر حافظ لاہوری کی خدمت میں قرآن کریم پڑھنے کے لئے گئے۔

بود کو دک حسین آں ہنگام　　عمر دہ سالہ داشت آں ایام
بود بو بکر حافظ استادش　　کہ ز قرآں سبق ہمی دادش[1]

۹۵۵ھ یعنی دس سال کی عمر میں شیخ بہلول دریائی[2] کی بیعت کی، شاہ حسین کے والد شیخ عثمان
پنجاب میں ڈھدہ کے عرف سے مشہور تھے، معارج الولایت میں ہے۔

"در عرف ڈھدہ بود و ڈھدہ صنفی از جولاہگان است"[3]

---

[1] حقیقت الفقراء قلمی ورق ۳ الف ذخیرۂ شیرانی کتابخانہ دانش گاہ پنجاب [2] شیخ بہلول دریائی متوفی ۹۸۳ھ مرید وخلیفہ شاہ لطیف میری قادری وہ مرید وخلیفہ شیخ جمال اللہ وہ شیخ عبد القادر جیلانی (حقیقت الفقرا قلمی ورق ۳۵ ب بعد)

[3] معارج الولایت قلمی ورق ۵۱۹ - ۲ مولفہ غلام معین الدین عبد اللہ خویشگی قصوری یسال ۱۰۹۴ھ مکتوبہ ۱۱۱۱ھ، ذخیرۂ پروفیسر سراج الدین آذر کتب خانہ دانش گاہ پنجاب

حقیقت الفقرا کا مصنف ایک غالی وحدۃ الوجودی تھا، اس نے جو لاہ کو الہ بنانے کی ناکام کوشش کی ہے،[1]

شاہ حسین کی رندمشربی کے قصے تذکرہ نویسوں نے مزے لے لے کر بیان کئے ہیں، لیکن قصے یا سِر سے غلط ہیں یا بعد میں ان سے تائب ہو گئے تھے، صاحب معارج الولایت کا بیان ہے

"وگویند وقتی کہ وفات او نزدیک رسید امور نا مشروعہ را ترک نمودہ و بنماز و روزہ مشغول گشت، گفتند دریں حکمت چیست؟ فرمود بزینی میروم کہ آں مادر، زیدہ و بساکنان آں موضع معرفت حاصل نگردانیدہ نمی دانم تا حال من چہ خواہد شد، دریں حال برحمت حق پیوست رحمۃ اللہ علیہ"[2]

صاحب حقیقت الفقرا کی روایت کے مطابق شاہ حسین لاہوری کا انتقال جمادی الثانی ۱۰۰۸ھ میں ہوا۔

چوں شدش با حق از وفات وصال | بود افزوں بر الف ہشتم سال
بود ہم روز جمعہ نورانی | سلخ ماہ جمادی الثانی
شب، ماہ رجب زد و درزماں | شد حسین از وصال حق شاداں
سال تاریخش از حساب جمل | گفت ہاتف کہ "مست عشق ازل"
عقل کل نیز بر فشاندہ دو دست | باز گفت "از مئ محبت مست"[3]

۱۰۰۸ھ

مفتاح العارفین کے مصنف نے شاہ حسین کا سال وفات ۱۰۱۳ھ لکھا ہے،

"سویم شوال سنہ ہزار و سیزدہ رحلت (کرد) و در لاہور مدفون است"[4]

---

[1] حقیقت الفقرا قلمی ورق ۳۶-ا-ب [2] معارج الولایت قلمی نسخہ مذکور ورق ۵۱۹ ب [3] حقیقت الفقرا قلمی ورق ۱۰۲-ا [4] مفتاح العارفین قلمی مولفہ عبد الفتاح بن محمد فاضل سال تالیف بعد ۱۰۹۶ھ

لیکن عموماً تذکرہ نویسوں نے اول الذکر سال (۱۰۰۸ھ) وفات ہی لکھا ہے،

شاہ حسین لاہوری کے سوانح نگاروں پر ایک نظر | شاہ حسین کے حالات پر قدیم ترین کتاب بہاریہ کا ذکر ملتا ہے، لیکن ہنوز یہ کتاب ناپید ہے،

حقیقت الفقراء | ۱۰۷۲ھ میں شیخ محمود معروف بہ محمد پیر نے شاہ حسین کے خوارق و کرامات پر ایک منظوم کتاب حقیقت الفقراء کے نام سے لکھی جو تقریباً تمام متاخر تذکرہ نویسوں کا ماخذ ہے،

لیکن حقیقت الفقراء کا "حقیقت" اور "فقر" دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا مصنف ایک غالی وحدت الوجودی تھا، اس نے شاہ حسین کے بارے میں جو افسانے لوگوں کی زبانی سنے وہ بلا تامل اور بغیر غور کے نقل کر دیئے، جس سے یہ کتاب رطب و یابس کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے اس کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاہ حسین لاہوری ایک فاسق و فاجر انسان تھے،

معارج الولایت | مولفہ غلام معین الدین عبداللہ خویشگی بسال ۱۰۹۴ھ، اگرچہ اس کے مصنف نے شاہ حسین لاہوری کے حالات کے سلسلہ میں اپنے ماخذ کی وضاحت نہیں کی ہے، لیکن اس کی نقل کردہ حکایات بھی وہی ہیں جو حقیقت الفقراء میں درج ہیں، مگر شاہ حسین لاہوری کا شمار سہروردی سلسلہ کے صوفیہ میں کیا ہے، اور شاہ حسین اور مادھو کے معاشقے کی داستان نہیں نقل کی ہے،

مفتاح العارفین | بعد ۱۰۹۶ھ مولفہ عبدالفتاح بن محمد نعمان۔

اس کے مصنف نے بھی شاہ حسین سے منسوب مذکورہ حکایات پر اکتفا کیا ہے، مگر شاہ حسین اور مادھو کے معاشقے کی داستان کو انھوں نے بھی نظرانداز کر دیا ہے،

خزینۃ الاصفیاء | مولفہ مفتی غلام سرور لاہوری ۱۲۸۰ھ کا بھی حقیقت الفقراء ہی ماخذ ہے، شاہ حسین کے شیوخ شاہ لطیف بری اور شیخ بہلول دریائی کے متعلق لکھا ہے:۔

"صاحب معارج الولایت شیخ بہلول و شاہ لطیف را از مشائخ سہروردیہ شمار نمودہ است"[1]

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۱۳۱ مطبوعہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۳ء،

جس کی تصدیق معارج الولایت کے پیش نظر خطی نسخہ آقدسے نہیں ہو سکی،

دوسرے متاخر مورخین لاہور نے بھی حقیقت الفقرا میں مندرج حکایات کے اعادہ پر اکتفا کیا ہے، شاہ حسین لاہوری کی تصانیف میں ابتک صرف کافیاں ہی منظر عام پر آئی ہیں، اور تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر کیا[1] ہے، کافیوں کے قدیم وجدید ایڈیشن بھی تحریف سے خالی نہیں ہیں،

خوش قسمتی سے شاہ حسین کا تصوف کا ایک رسالہ تہنیۃ دستیاب ہوگیا ہے، یہ رسالہ اس کی جانب منسوب قصوں کا ناقابل تردید ثبوت ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسین حافظ قرآن، ذی علم اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، تذکرہ نویسوں نے جن فرضی حکایات کا ان سے انتساب کیا ہے، وہ محض افسانہ ہیں،

رسالہ تہنیۃ کا فارسی متن محققین کی خدمت میں اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اس پر نقد و تبصرہ فرما کر صحیح نتائج قارئین کے سامنے لا سکیں، رسالہ پر توضیحی حواشی رسالہ کے کتابی صورت میں شائع ہونے پر شامل کئے جائیں گے،

راقم الحروف کو رسالہ تہنیۃ کا یہ خطی نسخہ مولانا سید شریف احمد شرافت نوشاہی مد ظلہ العالی ساہن پال (گجرات) کے ذاتی کتب خانہ سے ملا،

رسالہ تہنیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدی والصلوٰۃ علی محمد المجتبیٰ وعلی الہ کہ در

---

[1] صاحب مفتاح العلوم فین نے شاہ حسین کے متعلق یہ شعر نقل کئے ہیں،
"شخصی پرسید تو کیستی گفت نہ مسلمان نہ کافر نہ مقیم نہ مسافر لا مکان کما کان چنانکہ در زبان ہندی میگفت
فقیر حسین جولاہا، ناں سو ل نہ لاہا تا گھر باری ناں مسافر جدا لہ سوا اہا"
(مفتاح العارفین قلمی نسخہ شیرانی در ضمن حالات شاہ حسین)

ایشاں قل لا اسالکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی رسیدہ و اصحابہ کہ تخلقوا باخلاق اللہ
بکمال رسیدہ در زیدہ و سائر تابعین اجمعین بعد ان میگوید حسین لاہوری کہ بخاطر رسید کہ چند فوائد
در ہفت فصل جمع کنیم تا دوستان خدا برنگ سہولت مطالعہ فرمایند و ایں را مسمی تہنیتہ کردم تا ہمہ کس
را مبارک گردد، **فصل اول** در ترک اقربا و دوستی ایشاں بدانکہ طالب را باید کہ از اقربا خود تارک
باشد برین معنی کہ اگر ایشاں غیر از محبت و وداد مبتلا سازند و تلقین ترک نمایند و باعث بغیرت باشند
و اغشتہ بنجاست غیر سازند و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل پس ازیں سبب او را لازم ست
کہ از خود ترک گیرد و اطاعت ایشاں نپذیرد، قولہ تعالیٰ و ان جاھداک علی ان تشرک بی ما لیس
لک بہ علم فلا تطعھما، و اگر در پے مزاحمت باشند پس مبتدی را باید کہ ایشاں را مانع آید،
بلکہ مدعی باشد، قولہ تعالیٰ اف لکم و لما تعبدون من دون اللہ الخ و علیٰ ھذا القیاس و غیرہم
و جائے دیگر گفتہ و اذ قال ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما اٰلھۃ انی اراک و قومک
فی ضلل مبین، و اگر ایشاں ساعی باشند کہ در کتب عشق قیام نمایند پس خدمت ایشاں باشد و
از اطاعت ابا نیارد، قولہ تعالیٰ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولو الامر منکم فان تنازعتم
فی شیئ فردوہ الی اللہ و الرسول ان کنتم تومنون باللہ و الیوم الاخر ذلک خیر
و احسن تاویلا، و نیز جائے دیگر گفتہ، قولہ تعالیٰ، وقضی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین
احسانا، کہ نتیجہ بباید و نہال عمر او ثمرہ برخورداری بارور گردد **فصل دویم** در طلب مال و ترک
آں بدانکہ طالب را یکبارگی ترک از مال خوب نیست ازیں جہت کہ ایں اسباب خود را نام یا عزیز یاد نمود
پس دوستی برد ثواب ست بقدر ما یحتاج اما نہ چنداں کہ مبتدی را از راہ باز دارد و وابستہ
گرداند، ہمچو مگس در دیگر حوائج بسیار برد مترتب ست و بمنزلہ میانجی ست و ترک بریں صورت گیرد
کہ سود و زیاں او یکساں داند قولہ تعالیٰ، لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم و لا تفرحوا بما اتٰکم

و بقدریکہ احتیاج بقوت باشد بیازو حاصل کند قولہ تعالیٰ ھو الذی جعل لکم اللیل والنھار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ وجائے دیگر گفتہ وابتغوا من فضل اللہ تا آبروئے او لایزال باشد و اگر میسر تواند کرد بسبب ذکر فقر و فاقہ پیش گیرد و چیزی بطلبد از مردم بہ رنگ استغنا نہ بالحاح قولہ تعالیٰ لا یسئلون الناس الحافا چون توشہ فقیر بر کمر بست پس آن ہادی را طلب چرا کہ بے این نمی شود و رشد الہادی **فصل سوم** در گرفتن ہادی بدانکہ طالب را باید کہ طلب ہادی کند چون در قرآن مذکورست یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ و جائے دیگر نیز مذکوراست فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون و ہادی یافتہ نمی شود مگر بطلب راسخ پس مبتدی را باید کہ ہیچ احدی را از خدائے یاد بد اعتقاد نباشد دوام محبت نہد چنانکہ صیاد دام می نہد باشد کہ یک روز ہما بدام افتد ؎

خورش دہ بہ گنجشک و کبک و حمام کہ یک روزت افتد ہمائے بدام

و بہر کہ اعتقاد او درست آید ہمون را مقتدیٰ سازد چونکہ دل منبع الٰہی است و امکان نیست کہ در وسوسۂ شیطانی راہ یابد چونکہ روش درویش دوستی خدا است و رسوم آداب یاد گیرد چنانکہ ہادی خود را بنام نخواند و در خدمت او قیام نماید و خود را بدو قیاس نکند چونکہ او دریاست و این حقیر این حقیر را بدیباچہ مناسبت ست جائیکہ دریاست و این حقیر کتب انواع آداب از رسائل بزرگان چنانکہ لمعہ وغیرہ مطالعہ کند و در عمل آرد کہ نتیجہ کلی ست و از مدعیان محبت آن عزیز بگسلاند کہ بکار او خواہد آمد ھو المطالب **فصل چہارم** در بیان فوائد کہ بدان کہ اگر طالب مطلوب اکا و ہادی او بری سرکاست پس حاجت تقاضا نماند کہ از وے چیزے پرسد یا در رنگ اعتراض پیش آید کہ این بے نصیبی ست چنانچہ قصۂ خضر و موسیٰ و اگر مطلوب را یافت کہ او بلباس درویشی ملبوس است و از علم ہدایت عاری پس او را ہیچ محبت کافیست اگرچہ ارادہ او را حاصل نکاید تا او در ہراہب لعطیۃ الجود بصورۃ المطلوب فرشتہ پیدا کند از محبت او تاہم او رہبری کند اگر این طالب قبول را در روش یگانہ

کتب مطالعہ کند و یا ندکے آموزد مطلب طلب با منع نکند داز بہتہ بر ہم و را ہ حوالہ شود کہ جمع غیر تفرقہ قرار نگیرد، کہ مقصود خت بمنزل رسایندن ست و ہوالبلیغ، **فصل پنجم** بدانکہ مرشد طالب را با افعال او ملاحظہ نماید و جامۂ دل آن را از نجاست غیریت پاک سازد چنانکہ اگر کافر باشد او را شریعت و قواعد اسلام آموزد، و اگر فاسق باشد بآب تعریہ مطہر کند از دوازدہ کبائر باز آرد و اکتفا بجریہ دبملق و تجلق او نکند چنانکہ آوردہ اند کثرۃ التواضع علامۃ النفاق و از جہت او معلوم نہ کند و چون لطیفہ حاصل آید یکایک آن طالب را شاغل بذکر جلی بکند، نخستین از جام محبت مجان خاص جرعہ نجابند کہ منظور گردد چون او بخدمت پسندیدہ شود او را بکلمہ طیب مشغول سازد قولہ تعالیٰ الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ تا آیۃ او انجلا گردد و قرار گیرد قولہ تعالیٰ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب و بعد ازاں اشارت نجفی کند کہ نتیجہ فاذکرونی اذکرکم باو متواصل گردد و شور شش عشق در جان او شعلہ گیرد قولہ تعالیٰ یحبہم و یحبونہ کہ از آتش سوزان و استخوان او چون ہیزم و دل او چو آب کباب شود ہرگاہ کہ طالب این منزل طے کرد و لوح عشق در مکتب محبت تمام نماید و ہوالمحب، **فصل ششم** وجود انسان بطریق زمین صالح است و عشق مانند تخم درخت میوہ دار پس چون آن تخم در زمین رستہ گردد و بآب محبت پرورش یابد و ہوا و محبت پیدا کند، آخرالامر آن تخم درخت میوہ دار بارور گردد و آن سہ مراتب ست مرتبۂ اول آفات و منشا او نیت است کہ الاعمال بالنیات و منشا نیت خطرہ و وسوسۂ اصل ہر شئے وسوسہ است چون شی موسوس قرار گرد و خطرہ گردد چون قرار گیرد نیست حاصل آید، چون نیت ترقی در خطرہ بند آفات آید و آفات آنست کہ ہر یک را برادر شفیق داند اندرین کہ انما المومنون اخوۃ و نیز مذکور است فاخوانکم فی الدین در رنج و راحت او بر خود لازم داند و در وقت حاجت، حاجت او را بر حاجت خود مقدم دارد و باین دوستی دوستان محبوب را پوشیدہ در محبت قیام نماید و مرتبۂ محبت آنست کہ محبوب را بمتعلقان او دوست دارد و شیوہ و داد ایشان بجا آورد، کہ کلب الحبیب حبیب. مصرعہ،

ہمہ اخوانان کویش راچو جان خویشتن دارم

تا آنکہ غربت ہمنان ادیجہ ود بعد ازاں خلت حاصل آید خلت آنست کہ دیگرے راجز دوست در دل جان دہد چنانکہ فرمودہ اند لوکنت متخذا خلیلا لاتخذت ابابکر خلیلا ولکن خلیل اللہ و چوں عقدہ یگانگی راسخ گشت دوصول یافت بعدہ باید دانست کہ ہرکہ دررابطہ دنیا بزادیہ خیال پانہادہ ہریک راندا سے عشق شامل گشتہ پس احدی از خلل عشق خالی نیست ہرکہ باشد عارف آخرالامر بچیزیکہ خلت داشتہ باشد ہموں شی محو گردد چنانکہ فرمودہ اند الناس علیٰ دین خلیلہ، حکایت نیز گفتہ و درسکرات موت وصیت کرد کہ بعد از وفات دو کوزہ دنانیر در قبرش دفن کند چوں زر بسیار بود وصیتش بجا آوردند پس از چند مدت پسران او مفلس شدند خواستند کہ آں مبلغ را از قبرش برآرند رفتہ قبرش را کافتند دآں مال پدر را ندیدند حیران بودند چہ بینند کہ ہمہ دینارہا بتمثیل ملک ماہی بوجود او چسپیدہ خواستند کہ از وجودش جدا سازند چندانکہ سعی بلیغ نمودند جدا نہ شد از بس حرص چناں مصلحت دیدند کہ آں شخص را بسوزند و زر او را از وحاصل کنند چوں سوختند ملاحظہ نمودند کہ تمام زر گشتہ ہمہ را متصرف شدند او چوں ہموں ذات بود رخت ہماں ذات شد بعد ازاں جانب من سعی نماید بدانکہ من عبارت از آنست کہ از ازل تا ابد خبر نداشتہ باشد بہر نامی کہ منسوب کنند نامیدہ شود و کنہ ایں سر معلوم نخواہی کرد ہرگز وقتیکہ مردود باشی یا مستغرق یا بہیں معاملہ مخلوق یا محدوث واللہ اعلم بالصواب

باتمام رسید نسخہ متبرکہ رسالہ تہنیت مصنفہ قدوۃ الواصلین حضرت شیخ حسین قادری لاہوری بدستخط فقیر شریف احمد عفی عنہ قادری نوشاہی متوطن ساہنپال شریف ضلع گجرات بتاریخ بست ہفتم شعبان المبارک سنہ ۱۳۴۷ یکہزار سہ صد چہل ہفت ہجری المقدس،

بزم صوفیہ

مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (زیر طبع)

آدابُ الرسائل
کا
تنقیدی مطالعہ

از ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، ایم اے، پی ایچ ڈی، لکچرر شعبہ عربی ونکٹیشور یونیورسٹی آندھرا پردیش

عبدالرحمٰن بن عیسیٰ ہمدانی الکاتب (متوفی ۳۲۰ھ) کی تصنیف آداب الرسائل نثر کی تنقید پر ایک اہم تصنیف ہے، ابن قتیبہ کے بعد یہ پہلا ناقد ہے، جس نے نثر کے نقد کی جانب توجہ کی، اور اس موضوع پر اپنے گراں قدر افکار پیش کئے، پہلی مرتبہ مطبع الآباء الیسوعیین بیروت نے ۱۸۸۵ء میں اس کتاب کو "الالفاظ الکتابیة" کے نام سے شائع کیا تھا، اس کا ایک مخطوطہ کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے، جس کا نمبر ۳۱۸ ہے، اس مخطوطہ کا نام "الالفاظ الکتابیة" کے بجائے "آداب الرسائل" ہے، کتاب کے موضوع کے لحاظ آداب الرسائل زیادہ مناسب نام معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں نے اسی کو ترجیح دی، رہ گیا ادبی الفاظ کا ذکر تو اس دور میں نثر کی تنقید پر جتنی تصنیفات کی گئیں، ان سب میں ناقد یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ کون کون سے الفاظ ادبی ہیں اور ان کو کن مواقع پر استعمال کرنا چاہئے، وہ ان کے مراتب اور استعمال کا طریقہ بھی بیان کرتا تھا، مشرقی تنقید نگاروں کے پیش نظر عام قارئین کی مشکلات نہ ہوتی تھیں، اس لئے وہ لکھنے والوں کو براہ راست مخاطب کرتے تھے، پرانا انداز فکر یہ ہے کہ اگر کسی اوسط درجہ کی تعلیم و صلاحیت رکھنے والے کو شعر و ادب

کے قواعد و اصول ذہن نشین کرا دیئے جائیں، تو وہ بھی نظم یا نثر لکھ سکتا ہے، یہ طرز فکر قدیم دور میں یورپ میں بھی رائج تھا، اس کو قانونی تنقید (Legislative criticism. کہا جاتا ہے، اس کے برعکس جدید عربی تنقید کا رجحان یہ ہے کہ تنقید فنکار کا نہیں بلکہ اس کے ناظرین کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہے، اور اس کے مخاطب عام قارئین ہیں نہ کہ فنکار، اس بنیادی فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، ورنہ آداب الرسائل جیسی تنقیدی کتابوں کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، ہمدانی نے اس کتاب میں عمدہ عبارت لکھنے کے طریقے سکھائے ہیں، اور اچھی نثر کے بارے میں وقیع خیالات کا اظہار کیا ہے، "رسالہ" اس دور کی ایک اصطلاح ہے، اس کے لفظی معنی پیغام کے ہیں مگر ادبی اصطلاح کی حیثیت سے اب اس کا استعمال عام ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آداب الرسائل میں مصنف نے قتیبہ کی ادب الکاتب کو پیش نظر رکھا ہے، ادب الکاتب میں ادبی الفاظ کو جمع کیا گیا ہے، آغاز میں ایک تنقیدی مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے کتاب کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"میں نے اس کتاب میں ہر طبقے سے متعلق وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو رسائل و دواوین میں مستعمل ہیں، اور جن کی فصاحت شبہہ سے بالاتر ہے، ان میں زبان کے وہ عیوب نہیں جو لہجہ سے متعلق ہیں، اور نہ وہ مصنوعی ادیبوں اور متکلموں کے یہاں ملتی ہیں، یہ الفاظ ہر فن سے متعلق ہیں اور فہم سے قریب ترین، یہ رسائل سے بھی ماخوذ ہیں اور عام لوگوں کی گفتگو سے بھی، دواوین و دفاتر، علماء کی تصانیف اور رؤساء کی محفلوں سے بھی، ان کے جمع کرنے کے سلسلہ میں استفادہ کیا گیا ہے، اس لئے الفاظ کو اس کے محل کی مناسبت سے بیان کیا گیا ہے، یہ لفظاں ہیں دوسرے لفظ کی مناسبت ظاہر کیا ہے"

اس دور میں عام ناقدوں کا رجحان یہ تھا کہ جو گذشتہ شاعر و ادیب گذرے ہیں، زبان و بیان میں ان کی تقلید کی جائے، ہمدانی لکھتے ہیں کہ ادیب، شاعر، خطیب کے لئے متقدمین کی تقلید

ضروری ہے، انہیں دیکھنا چاہئے کہ متقدمین نے کس طرح نئے معنی اختراع کئے اور متاخرین کے لئے کچھ باقی نہیں چھوڑا، اگر نئے ادیبوں میں سے کسی نے متقدمین کے اختراع کردہ معانی سے کوئی معنی اخذ کیا، تو یہ واضح سرقہ ہے، البتہ اگر وہ معنی تو دوسروں سے لیتا ہے، مگر اس کو نیا قالب عطا کرتا ہے تو اس کا اسکو حق ہے مگر جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ وافر نہ ہو، وہ اس سے قاصر رہے گا، اور اپنے فن میں ناقص ہوگا اس کے یہاں خامیوں کا ہونا ضروری ہے، لفظ معنی کی زینت ہے اور معنی لفظ کا ستون ہے، اگر معنی لطیف ہو تو سخیف الفاظ میں اس کا حسن ظاہر نہیں ہو سکتا،[1]

ہمذانی کے علاوہ دوسرے ناقدوں کا بھی یہ خیال ہے کہ متقدم ادبا و شعرا نے، متاخرین کے لئے کوئی موضوع باقی نہیں چھوڑا، اور معانی کا جو ذخیرہ ممکن ہے وہ ختم ہو چکا، کتاب العمدہ میں ابن رشیق نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لیکن یہ تصور غلط فہمی پر مبنی ہے، ہر دور میں زندگی اور زمانہ نئے معانی ساتھ لاتا ہے، اور خود فن کار کا ذہن معانی اختراع کرتا ہے، بہت سے الفاظ کے جو معنی جاہلیت میں تھے، وہ اسلام میں نہ رہے، جو دور اموی میں تھے وہ عصر عباسی میں نہ رہے، بلکہ نئے معانی سامنے آئے عام و فرسودہ معانی ہی تھے،

دوسرا مسئلہ سرقہ کا ہے جو اس مزعومہ تصور پر مبنی ہے کہ متقدمین نے ہر قسم کے معانی استعمال کر ڈالے، اور اب نئے معنی باقی نہ رہے، اس لئے عرب ناقدوں نے معانی کے سرقہ کو جائز قرار دیدیا البتہ یہ شرط لگا دی کہ الفاظ کا قالب اپنا اور نیا ہو،

اس سلسلہ میں جاحظ کا نظریہ یہ ہے کہ معانی کا علم تو عالم جاہل شہری اور دیہاتی سب کو ہوتا ہے، اصل حسن اس کے قالب میں ہوتا ہے، بعد میں ابو ہلال عسکری نے اس نظریہ کو بنیاد بنا کر لکھا ہے کہ چونکہ معانی کا علم تمام انسانوں میں مشترک ہوتا ہے، اور ہر شخص ان کو جانتا ہے اس لئے

---

[1] آداب الرسائل ص ۲۰۶،

اس میں سرقہ کا سوال نہیں، سرقہ صرف قالب میں ممکن ہے، اس لئے کہ الفاظ پر قدرت اور زبان پر عبور کے بغیر کوئی شخص نیا قالب نہیں پیش کر سکتا۔ ابو ہلال عسکری مہارتِ زبان کا مظہر عبارت آرائی کو قرار دیتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غلط نظریہ بہت سے غلط نظریات کو جنم دیتا ہے،

ہمدانی زبان کا کمال اس میں تصور کرتے ہیں کہ الفاظ و معانی میں مکمل ہم آہنگی ہو، اور وہ ایک دوسرے کی زینت کا باعث ہوں، ان کے نزدیک اصل قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب میں فطری صلاحیت ہو، اور اس صلاحیت کے ساتھ ادبی علوم پر پوری دسترس ہو، اسی وقت وہ اعلیٰ درجہ کا ادیب بن سکتا ہے[1]،

نثر نگاری کا فن ان کے نزدیک نہایت معزز و محترم ہے وہ لکھتا ہے کہ تمام صنعتوں میں سب سے زیادہ صنعت کتابت ہے جو انسان کو اعلیٰ مراتب تک پہنچاتی ہے، بعض لوگ اسی کے سہارے خلیفہ تک بن گئے اور کتنوں کے ہاتھ میں اس کے ذریعہ ملک اور قوم کی زمام آگئی[2]،

ہمدانی کا نظریہ اس دور میں بھی صحیح تھا، مگر آج جدید دور میں قلم، عزت و عظمت کا ایک اہم ذریعہ ہے، اور زبان و ادب کے میدان میں حیات جاودانی کا باعث ہے،

ادباء میں بعض عمداً مشکل الفاظ اور عوام کی زبان سے الگ زبان میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے عوام سے اپنے کو ممتاز بنا لیا، اور ان سے بلند ہو گئے، لیکن ہمدانی کہتے ہیں کہ ایسی زبان سے گونگا پن بہتر ہے[3]

ایک طرف وہ عوام سے الگ تھلگ رہنے اور ان کی زبان سے اجتناب کو صحیح تصور نہیں کرتے، اور دوسری طرف ادب میں سوقیانہ الفاظ کے استعمال کو غیر معیاری قرار دیتے ہیں[4]، یعنی زبان عوام کی فہم سے بالاتر نہ ہونی چاہئے، مگر ادبی حیثیت سے اتنی گری بھی نہ چاہئے، کہ

---

[1] آداب الرسائل ص ۸ [2] ایضاً ص ۵-۶ [3] ایضاً ص ۳ [4] ایضاً ص ۴.

وہ سوقیانہ ہو جائے،

نثر نگاری کے بارے میں یہ خیالات اس دور کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، اس طرز کی تنقیدی کتابوں میں غیر معمولی اہمیت ان کے مقدمہ کو حاصل ہوتی ہے، چنانچہ ابن سلام کی طبقات الشعرا ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء ادب الکاتب اور ہمدانی کے ادب الرسائل کے مقدمات میں درحقیقت تنقیدی روح پوشیدہ ہے، اگر مذکورہ کتابوں سے ان کے مقدمے الگ کر دیئے جائیں تو ان کی تنقیدی عظمت باقی نہ رہ جائے،

ادبیات

تضمین بر کلام اقبالؒ

از جناب نثار الرحمٰن صاحب نثار

افکار پہ چھاتا ہے جب رنگِ مسلمانی
کردار میں آتی ہے تابانیٔ لافانی
دانش کی تجلّی بھی ہے رحمتِ یزدانی

"اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی"

دراصل مری ہستی ہے رقصِ شرر جیسی
اس پر یہ جگر کاوی، رنجوری و دلسوزی
کس سے میں کہوں اپنی یہ شدتِ مجبوری

"اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی"

محدود تھی لے میری بس اپنے ہی یاروں تک
پھر سینہ فگاروں تک کچھ درد کے ماروں تک
پھر جھوم کے یہ نکلی محفل سے دیاروں تک

"اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزلخوانی"

شر فطرتِ بشری میں ہے جز کی طرح شامل
انساں تو ازل ہی سے تخریب کا ہے قائل
پھر تیری مشیت ہے تخلیق پہ کیوں مائل

"ہے نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی"

ہیں آرزوئیں کتنی اک دل میں خدا جانے
بت کتنے تراشے ہیں جینے کی تمنا نے
یہ امرِ حقیقت ہے تو مانے یا نہ مانے

"تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی"

غزل

از جناب قمر سنبھلی، دہلی

گلوں میں حسن شگوفوں میں تازگی نہ رہی — چمن میں ہائے وہ پہلی سی دلکشی نہ رہی
وہ ربطِ عشق و محبت میں پختگی نہ رہی — جہاں میں آج رہ و رسم دوستی نہ رہی
ہمارے دم سے تری انجمن میں رونق تھی — ہم اٹھ گئے تو وہ دلچسپ زندگی نہ رہی
بھری بہار میں گلچیں نے وہ ستم توڑے — چمن میں آج شگفتہ کوئی کلی نہ رہی
ہمارا جذبِ محبت بھی کارگر نکلا — نگاہِ دوست میں پہلی سی برہمی نہ رہی

سنبھل سنبھل کے مرے دوستو چمن میں چلو — یہ خوشگوار فضا کل رہی رہی نہ رہی
جھکی تھی شاخ جو ترتیبِ آشیاں کے لئے — مرا نصیب! کہ وہ شاخ بھی ہری نہ رہی
تری نگاہِ شرر بار کی ہو عمر دراز — کہ دل کی اب مرے پہلو میں خاک بھی نہ رہی
تمہارے ساتھ ہی رنگینیاں تھیں دنیا کی — تمہارے بعد کسی شے میں دلکشی نہ رہی
یہ سب تمہاری حسین یاد کا تصرف ہے — کہ خانۂ دلِ پرغم میں تیرگی نہ رہی

قمرؔ وہ جب بھی کبھی انجمن سے اٹھ کے گئے
فلک پہ چاند ستاروں میں روشنی نہ رہی

غزل

از جناب عزیز احمد عزیزؔ بنارسی

کیا کام تو نے نرگسِ مستانہ کر دیا — کی وہ نظر کہ حاصلِ میخانہ کر دیا
جو چاہا تو نے جلوۂ جانانہ کر دیا — کعبہ بنا دیا کبھی بت خانہ کر دیا
جانِ سحر کی اک نگہِ التفات نے — صبحِ چمن سا میرا سیہ خانہ کر دیا
کیا چیز ہے جمالِ محبت بھی ہمنشیں — ناصح کو بھی جو حسن کا پروانہ کر دیا
سکھا دیا کہاں یہ مجھے ذوقِ عشق نے — تیرے سوا ہر ایک سے بیگانہ کر دیا
ان کی نگاہِ ناز کی نیرنگیاں نہ پوچھ — دل کو کبھی چمن کبھی ویرانہ کر دیا
وہ بارگاہِ ناز کہاں اور میں کہاں — کیا کام تو نے ہمتِ مردانہ کر دیا
وہ پیکرِ جمال جو آیا نگاہ میں — ہر ہر نظر نے سجدۂ شکرانہ کر دیا

اچھی رہی یہ عشق کی سوداگری عزیزؔ
دل کا نگاہِ یار سے بیعانہ کر دیا

غزل

از جناب محسن رضا صاحب جونپوری

اللہ اللہ رے کیا مشربِ رندانہ ہے
دونوں عالم لئے اک لغزشِ مستانہ ہے

شمع سی شمع نہ پروانہ سا پروانہ ہے
عشق کا سوز حقیقت ہی کہ افسانہ ہے

چشمِ ساقی کا عطیہ ہی کہ رندوں کا خلوص
جس طرف دیکھئے میخانہ ہی میخانہ ہے

شرط ہی عشق کے اک سجدہ کی تکمیل یہاں
یہ کسے ہوش کہ کعبہ ہے کہ بتخانہ ہے

شمع کے گرد سہی شمع کی لو پر نہ سہی
بڑھ کے پروانہ سے خاکسترِ پروانہ ہے

نور افشاں نظر آتی ہے ہر اک راہ گذر
کہکشاں ہے کہ فروغ خطِ پیمانہ ہے

ہوتی ہے بارشِ انوارِ دو عالم اس پر
راز کونین کا محرم دلِ دیوانہ ہے

جب سے آئے ہیں قدم ہم جگر افگار دل کے
دشت بھی دشت ہی ویرانہ بھی ویرانہ ہے

میری روداد وفا جس میں نہ شامل ہو رضاؔ
وہ حکایت ہے کوئی وہ کوئی افسانہ ہے

باب التقریظ والانتقاد

نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر

(حصہ ہشتم)

مصنفہ مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم، تقطیع بڑی ضخامت ۴۲۶ صفحات کاغذ اعلیٰ اور خوبصورت ٹائپ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، قیمت تحریر نہیں،

ہندوستان صدیوں تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے، اس کی ثروت اور یہاں کے مسلمان سلاطین کی علم دوستی علماء نوازی اور ہنر پروری سے دنیائے اسلام خصوصاً وسط ایشیا کے بہت سے علمی خانوادے، علماء و مشائخ اور مختلف اصناف کے اصحاب علم و کمال ہندوستان میں جمع ہو گئے تھے، اور اس کے پایہ تخت رشک بغداد و قرطبہ اور شیراز و اصفہان بن گئے تھے، خود ہندوستان میں ایسے ایسے علماء اور اہل کمال پیدا ہوئے، جو ائمہ اسلام کے ہم پایہ تھے، اور ان کی علمی فضیلت کا لوہا دنیائے اسلام کے علماء تک مانتے تھے، ان کے حالات اس عہد کی تاریخوں میں ملتے ہیں، فارسی اور اردو میں خاص علماء کے حالات میں بھی بعض کتابیں لکھی گئیں لیکن وہ بہت مختصر اور تشنہ ہیں، ان میں سب قابل ذکر علماء کا احاطہ نہیں ہے، دوسری بڑی کمی یہ ہے کہ عرب دنیا ان سے استفادہ نہیں کر سکتی، اس لئے ان چند نامور علماء کے سوا جنھوں نے عربی میں کتابیں لکھیں، یا جن کا عرب دنیا سے تعلق رہا، عام علماء سے وہ ناواقف ہیں اور عربی کی تراجم کی کتابوں میں بھی ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے اس لئے عربی میں ان کے حالات لکھنے کی

بڑی ضرورت تھی، اس ضرورت کو مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء مرحوم نے پورا کیا، اور "نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر" کے نام سے آٹھ ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی اس کے سات حصے اس سے پہلے دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں، آٹھواں حصہ ابھی حال میں شائع ہوا ہے، یہ چودھویں صدی کے ۵۰۵ علماء، اور اصحاب علم و کمال کے حالات پر مشتمل ہے مصنف کا انتقال ۱۳۴۱ھ میں ہو گیا تھا، اس لئے اس حصہ میں صرف ان علماء کے حالات ہیں جو ان کے زمانہ میں شہرت حاصل کر چکے تھے یا جن کی شہرت کا آغاز تھا اور بعد میں شہرت حاصل کی انکے حالات تشنہ تھے، بعد کے حالات مصنف کے خلف الصدق مولانا سید ابو الحسن علی نے بریکٹ میں بڑھا دیئے ہیں جن لوگوں نے مصنف کے بعد شہرت حاصل کی، ان کے حالات اس میں نہیں ہیں، ان کی تعداد اتنی ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل جلد کی ضرورت تھی، نزہۃ الخواطر ہر حیثیت سے جامع اور معیاری کتاب ہے اور اس کا درجہ تراجم کی قدیم عربی کتابوں سے کسی حیثیت سے کم نہیں ہے، زبان نہایت شستہ و رفتہ، عربی سلاست کا نمونہ ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی علمی تاریخ کا کوئی مورخ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس سے اس کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، تراجم میں ایک بڑا مسئلہ سنین کا ہوتا ہے، نزہۃ الخواطر میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جو بجائے خود ہندوستانی مسلمانوں کی علمی تاریخ پر مختصر تبصرہ ہے،

"م"

نوائے عصر

جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا مجموعہ کلام ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے پیش لفظ، اور مولانا شاہ معین الدین ندوی اڈیٹر معارف کے تعارف کے ساتھ   قیمت: ۳ ر

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں از مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم، مترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی تقطیع کلاں صفحات ۴۸۰ قیمت عہ پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ،

مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی نظر ہندوستان کے اسلامی عہد خصوصاً اسکی تاریخ پر بڑی گہری اور وسیع تھی، انھوں نے ان سے متعلق تنہا ایسے کام انجام دیئے ہیں، جن کو ایک پوری جماعت اور مستقل سوسائٹیاں انجام دیتی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے، اس میں انھوں نے الفہرست اور کشف الظنون وغیرہ کے طرز پر گذشتہ ہزار سال کے ہندوستانی علماء و مصنفین کی تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے، جو چار ابواب اور متعدد فصول پر مشتمل ہے، پہلے باب میں علوم آلیہ و نحو و صرف، لغت، ادب اور تاریخ و سیر وغیرہ، دوسرے میں دینی علوم فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف، ادعیہ و اذکار اور کلام و عقائد کی، اور تیسرے میں عقلی علوم، جدل و مناظرہ، منطق و فلسفہ، ریاضی و ہیئت، اخلاق و طب و موسیقی وغیرہ کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست اور انکی مصنفین کے ناموں کا ذکر ہے، آخری باب میں ہندوستان کے عربی، اور ہندی کے شعراء اور ان کی شاعری کا اجمالی تذکرہ ہے، شروع میں ہندوستان کے قدیم نصاب درس کا مکمل خاکہ اور اس میں عہد بعہد تبدیلیوں پر تبصرہ ہے، ہر فن کے شروع میں اسکی تعریف، مختصر تاریخ اور غرض و غایت بھی بیان کی ہے اور اس کے متعلق غیر ہندوستانی علماء کی امہات کتب کا بھی ذکر کیا ہے بعض کتابوں کے متعلق مختصر معلومات بھی دیدئے ہیں، اس اعتبار سے یہ اسلامی علوم و فنون اور ان کی کتابوں کی فہرست بھی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ ہزار سالہ علمی و تعلیمی اور ذہنی و فکری

تاریخ بھی ہے، مصنف کی مشہور تصنیف نزہتہ الخواطر کی طرح یہ کتاب بھی عربی زبان میں تھی اور دس بارہ سال قبل مجمع العلمی دمشق نے اسکو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اب ندوہ کے لائق استاذ مولانا ابوالعرفان ندوی نے اس کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، شروع میں مصنف کے فاضل و نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے حالات و سوانح اور علمی کمالات و خدمات تحریر کئے ہیں، اگر اردو ترجمہ کے ساتھ چند چیزوں کی جانب توجہ کی گئی ہوتی تو یہ کتاب اور جامع اور مفید ہو جاتی، مثلاً مصنف کے بعد مختلف فنون میں جن کتابوں کا اضافہ ہوا ہے، ان سب کا نہ سہی صرف امہات کتب کا حاشیہ یا ضمیمہ میں ذکر ہو جاتا اور مصنف نے جن مصنفین کے سنین وفات نہیں لکھے ہیں اور وہ مراجعت سے معلوم کئے جا سکتے تھے ان کو تحریر کر دیا جاتا، فنون کی طرح زبانوں کے لحاظ سے بھی فصلیں اور عنوانات قائم کئے جاتے لیکن ان چیزوں سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا، اور ہندوستانی مسلمانوں کی علمی تاریخ کا کوئی مورخ اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے اس کے ترجمہ سے اردو کے علمی ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اور معلومات افزا کتاب کا اضافہ ہوا ہے،

متاعِ فقیر مرتبہ جناب عابد رضا صاحب بیدار، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۶۰، قیمت ۲ روپیہ رامپور انسٹیٹیوٹ آف اورنیٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ دہلی ۶

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی وفات کے بعد اُن پر بکثرت مضامین اور بعض مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ نئی کتاب مشہور صحافی اور صاحب قلم جناب عابد رضا بیدار نے لکھی ہے، یہ دراصل بڑی حد تک ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہے، جس کو بیدار صاحب نے نئی ترتیب اور اپنے دلچسپ اندازِ تحریر سے بہت پُرلطف بنا دیا ہے، شروع میں ڈاکٹر صاحب کے خود نوشت حالات و سوانح ہیں، پھر مرتب نے ان کی شخصیت اور افکار کو کچھ ان کی اور کچھ اپنی زبانی تحریر کیا ہے، ایک حصہ میں ڈاکٹر صاحب کی تحریروں، تقریروں اور خطوط وغیرہ کے ایسے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، جن سے ان کی

شخصیت اور اس کی تعمیر و تشکیل کے عناصر پر روشنی پڑتی ہے، اس حصہ میں ہندوستانی مسلمانوں، جامعہ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ سے متعلق حالات اور خطبے خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں، آخر میں جمیل احمد قریشی صاحب کی مرتب کردہ ببلوگرافی ہے، اس میں فن وار مختلف عنوانات کے ماتحت ذاکر صاحب کی تصنیفات، تقریروں، مکاتیب، تقریظوں، اور دیباچوں وغیرہ کا مکمل انڈکس دیا گیا ہے، اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بالکل بجا کیا گیا ہے، لیکن ان کے بارہ میں جو کچھ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، وہ مبالغہ سے خالی نہیں، لائق مرتب کو ایک مستقل باب میں ان تحریروں اور مضامین کا بھی ذکر کر دینا چاہئے تھا جو دوسرے اہلِ قلم نے ڈاکٹر صاحب پر لکھے ہیں، مرتب کے بعض تجزیوں اور نتائج میں بھی خامی ہے، مثلاً ایثار و قربانی وغیرہ کی اہمیت سے انکار، پونے دو سو صفحات کی کتاب کی بیس روپیے قیمت بہت زیادہ ہے، ان چیزوں سے قطع نظر اس سے ڈاکٹر صاحب کی سیرت و سوانح، شخصیت و افکار اور کارناموں کا مرقع بھی بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے اور دلچسپ بھی ہے،

روضات مترجمہ جناب مولوی ثناء اللہ صاحب ندوی، تقطیع متوسط، صفحات ۲۷۲ کاغذ و کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲روپے (۱) پتہ پاک اکیڈمی ۱۳؍۱ وحید آباد کراچی ۱۸ (۲) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶،

یہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی جانب منسوب ایک فارسی رسالہ کا ترجمہ ہے، اس کا موضوع شریعت و طریقت میں تطبیق اور ان کے باہمی تعلق کی وضاحت ہے، مصنف نے دونوں کی حقیقت پر مؤثر اسلوب میں مفید بحث کی ہے، اور دنیا کی حقارت و بے ثباتی، عشق و اطاعت الٰہی اور اتباعِ سنت کی اہمیت اور وحدت الوجود کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن بعض ضعیف حدیثوں سے بھی استدلال کیا ہے، ادارۂ تحقیق و تصنیف کراچی نے رسالہ کا اصل فارسی متن مع اردو ترجمہ شائع کیا ہے، لائق مترجم نے آخر میں قرآنی آیات کی علٰحدہ تخریج کی ہے، اگر وہ احادیث کی تخریج اور بعض دقیق مطالب کی وضاحت کے لئے

مختصر حواشی بھی قلمبند کر دیتے تو اس کا افادہ بڑھ جاتا، گو حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تصنیفات کی فہرست میں اس رسالہ کا نام نہیں ملتا، لیکن فاضل دیباچہ نگار مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب نے اس کو پورے یقین کے ساتھ ان کی تصنیف قرار دیا ہے، یہ رسالہ مفید دینی فوائد پر مشتمل اور علماء و اصحاب طریقت کے لئے یکساں دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے،

معارف التجوید، مرتبہ جناب مولانا قاری محمد حبیب اللہ صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت درج نہیں پتہ (۱) مدرسہ تجوید القرآن فاروقی مسجد، میری ویدر ٹاور کراچی ملا
(۲) اعجاز کالونی، ویسلے ہاؤس، لارنس روڈ کراچی عدد،

مولانا قاری محمد حبیب اللہ صدر مدرس مدرسہ تجوید القرآن فاروقی مسجد کراچی نے فن تجوید پر یہ رسالہ لکھا ہے، جو اس فن کے متعلق ضروری اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس میں علم تجوید، اوقاف کے قاعدے، مخارج کے آداب، حروف کی مفصل صفات اور رسم خط کے مسائل بڑی خوبی سے لکھے گئے ہیں، بعض مباحث کے ضمن میں فقہی مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں، یہ فنی کتاب ہے، اس لئے مصنف نے اس کو عام فہم بنانے کے لئے آسان انداز، دلچسپ پیرایہ اور سوال و جواب کے طرز میں لکھا ہے اور مصطلحات فن کی تشریح اور بعض مشکل مقامات کو جدولوں کے ذریعہ واضح کر دیا ہے، اس لئے طلبہ فن کے علاوہ عام قرآن خوانوں کے لئے بھی ایک حد تک اس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے،

مضامین ہفت رنگ، مرتبہ ڈاکٹر آفتاب اختر صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۴۰ قیمت ۲ روپیہ پتہ :- نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

ڈاکٹر آفتاب اختر ہونہار اہل قلم ہیں، ان کے ادبی وتنقیدی مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اب انھوں نے اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں اکثر مضامین اردو شاعری کے اور چار مضامین فارسی شاعری کے متعلق ہیں، یہ سب مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں، لیکن مختصر ہیں، اور موضوع کے تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہیں، وہ غیر ادبی نوعیت کے مضامین

بھی درج ہیں، ایک میں میکاؤلی کے مشہور نظریہ یعنی سیاست میں مذہب و اخلاق کے دخل نہ دینے کی وضاحت کی گئی ہے، اور اس کے بارہ میں شدید ردعمل کا ذکر کیا گیا ہے، اور دوسرے میں دنیا کے عام ملکوں خصوصاً بڑی طاقتوں کے دعوائے امن پسندی کی اصل حقیقت ظاہر کرنے کے بعد گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد میں امن عالم کا راز مضمر بتایا گیا ہے، اور اسی ضمن میں ہندوستان کی امن و صلح پسند پالیسی کا بھی ذکر ہے، لیکن یہ تحریر ہندوستان کے موجودہ سیاسی انقلاب سے ایک حد تک متاثر معلوم ہوتی ہے، ورنہ ملک میں جو اندرونی خلفشار اور بربریت پائی جاتی ہے، اس کا عدم تشدد اور امن پسندی سے کیا تعلق؟ شروع کے ایک مضمون میں مصنف نے اپنے ادبی عقائد و نظریات واضح کئے ہیں جو بڑی حد تک متوازن ہیں،

اردو شاعری میں ہندوستانی روح، مرتبہ جناب زرینہ ثانی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۱۲، قیمت ۳ روپیہ، پتہ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ،

یہ ایک صاحب قلم خاتون کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، مصنفہ نے اس میں اردو کے بعض قدیم و جدید شعراء کے کلام کے خاص اصناف کے خصوصیات دکھائے ہیں، ایک مضمون میں موجودہ دور کی عزائیہ شاعری کو مرثیہ کا نیا موڑ قرار دیا ہے، اور اس کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے، ایک مضمون "اردو شاعری میں ہندوستانی روح" کے زیرعنوان اردو شاعری کی سیکلر روایات، رواداری اور وسیع المشربی وغیرہ کو دکھایا گیا ہے، یہ مضمون اگرچہ سب میں اہم ہے، لیکن مختصر ہے، ان چیزوں کو تفصیل سے دکھانے کی ضرورت تھی، اس سے قطع نظر یہ مجموعہ دلچسپ اور نوجوان ادیبہ کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے، عرصہ ہوا مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اڈیٹر معارف نے "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ تحریر کیا تھا، جو ان کے ادبی مضامین

کے مجموعہ "ادبی نقوش" میں شامل ہے،

میگزین فضل الرحمن مرتبہ ڈاکٹر محمد شکیل احمد صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت دیدہ زیب، سرورق، صفحات ۱۱۴، قیمت تحریر نہیں، اسلامیہ انٹر کالج بریلی

پتہ: فضل الرحمن اسلامیہ انٹر کالج، بریلی،

غالب صدی کے موقع پر مختلف کالجوں نے بھی غالب نمبر نکالے ہیں یہ نمبر بریلی کے اسلامیہ انٹر کالج کا ہے، جو ترتیب، مضامین کے تنوع اور معیار کے اعتبار سے بعض رسالوں کے غالب نمبروں سے بڑھا ہوا ہے، کالج کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ بیرونی اصحاب قلم میں مولانا عرشی ضیاء احمد صاحب بدایونی اور خواجہ احمد صاحب فاروقی اور متعدد متعارف و غیر متعارف اہل قلم کے مضامین ہیں، ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا مضمون محققانہ و معلومات افزا، اور احمد جمال پاشا کا مزاحیہ مضمون بھی دلچسپ ہے، بعض مضامین میں غالب کی مشکل پسندی اور غزل میں عدم تسلسل وغیرہ کا جواب دیا گیا ہے، نظم کا حصہ بھی خاصہ متنوع ہے، اس میں حالی کے عہد سے لیکر موجودہ دور کے شاعروں نے غالب کی عظمت کے اعتراف کے بارہ میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نقل کیا گیا ہے، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی غالب کے اشعار کا اودھی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں، اس نمبر میں ان اشعار کا اودھی ترجمہ بھی شامل ہے، آخر میں ہندی میں بھی غالب پر چند مضامین ہیں، جا بجا غالب کے متفرق اقوال اور تحریریں بھی دی گئی ہیں، جو ادبی و لسانی حیثیت سے بصیرت افروز ہیں، غرض یہ نمبر محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اور غالب پر نکلنے والے اچھے نمبروں میں شمار ہونے کے لائق ہے،

"ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

ۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: عہ
ۂ صحابہ: (حصہ دوم) " ہے
ۂ صحابیات: " عا
ریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات
کی تفصیل: قیمت: غلہ
حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری
سے لیکر خاندان فرنگی محل تک کے مشہور مسلم
فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلہ
حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے
اسلام کے حالات، قیمت: للعہ
شعرالہند (حصہ اول) " غلہ
شعرالہند (حصہ دوم) " للعہ

۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان
کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ
۱۰- سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیر طبع)
۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح
اور اُن کی تصنیفات: قیمت ہے
۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور
اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)
۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل
سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ
اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے
فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی
و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ہے

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی، فقہی، تاریخی، تنقیدی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۴۲۶ قیمت: عہ

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تما
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس
مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز
نسل ورنگ و بلا لحاظ زادو بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ
مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب
انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں مختلف ا
کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ
اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے
آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتو
درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و
پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب وغیرہ سب آ
غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں
دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم
ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۲۳۰ صفحے، قیمت :- ۵ر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)　　　　ستمبر سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

مجلسِ ادارت

جلد ۱۰۶ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

۱۵ اگست ۹ بجے دن کو بعض دوستوں نے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے حوالہ سے یہ خبر سنائی کہ صدر جمہوریہ نے ایک خادم علم کو عربی کی سند کا اعزاز عطا کیا ہے، پہلے سے اسکا کوئی تصور ذہن میں نہ تھا، اس لیے اس کے یقین کرنے میں تامل ہوا، پھر مسلسل خبریں ملیں اور سہ پہر کو مسز اندرا گاندھی اور ہوم سکریٹری کے تار سے اسکی تصدیق ہوئی، اس وقت پورا یقین ہوا، دوسرے دن اخبارات میں خبر آگئی، ایک ایسے گوشہ نشین کی جس کا سیاسی و پبلک زندگی اور کسی سرکاری ادارے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا، یہ عزت افزائی حکومت ہند کی خالص علم نوازی کا ثبوت ہے، اور ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک علمی ادارے کی عزت افزائی ہے جس کے لیے دار المصنفین حکومت ہند کا شکر گذار ہے، اس اعزاز پر اعظم گڈھ کے مخلصین اور باہر کے احباب اور اہل علم نے جس اخلاص و محبت کا اظہار کیا ہے، راقم ان سب کا شکر گذار ہے، حتی الامکان فرداً فرداً ان سب کے تہنیتی خطوط کے جواب دیے ہیں، اگر کسی صاحب کو نہ ملا ہو تو ان کا ان سطور کے ذریعہ پھر شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بدبختی یہ بھی ہے کہ ان کے ہر جماعتی کام میں سیاست ضرور شامل ہو جاتی ہے، اور ایک ہی کام کے لیے کئی کئی تنظیمیں بنجاتی ہیں، تعمیری کاموں کے لیے تو الگ الگ تنظیمیں مفید بلکہ ضروری ہیں لیکن اس کے لیے بڑے اخلاص اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسکا صلہ جاہ و اقتدار کی شکل میں کم ملتا ہے اسلیے اسکی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے، اور قسمت آزمائی کا سارا زور سیاست کے میدان میں صرف ہوتا ہے جسمیں مسلمانوں کی نمایندگی کے دعویٰ اور جاہ و اقتدار کے حصول کے لیے کشمکش ہونا ناگزیر ہے، اس سے مسلمانوں میں اختلاف و انتشار

پھیلتا ہے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے لیے مسلم مجلس پہلے سے موجود ہے، اسکی موجودگی میں اس صوبہ میں مسلم لیگ کے قیام کی قطعاً ضرورت نہ تھی، اس سے مسلمانوں کو نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، شمالی ہند کا جنوبی ہند پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، جنوبی ہند میں فرقہ پروری کا اثر کم ہے اور شمالی ہند خصوصاً اتر پردیش اور بہار اس کا گڑھ ہیں، لیگ کے پیچھے ایک نہایت تلخ اور ناگوار تاریخ ہے جسکو اکثریت بھولی نہیں ہے، اس نام کے ساتھ یہ پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اس لیے مسلم لیگ کو کسی قالب میں بھی زندہ کیا جائے، اکثریت کا معقول اور انصاف پسند طبقہ بھی اس کو گوارا نہیں کرسکتا، اور فرقہ پرور پارٹیاں تو اس سے بہت غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی، پھر خود مسلم لیگ اور مسلم مجلس میں اختلاف شروع ہوگا، اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کے بجائے الٹا نقصان پہنچیگا، اس لیے شمالی ہند میں مسلم لیگ کا قیام مسلمانوں کے لیے سراسر مضر ہے۔

چند دن ہوئے انسانی برادری کا کتابچہ ہمارے پاس بھی آیا تھا، گذشتہ مہینہ دلی میں اسکا کنونشن ہوا جس میں ملک کے مختلف حصوں کے کئی سو نمایندے شریک ہوئے، اس کنونشن میں اسکا باقاعدہ قیام عمل میں آگیا ہے، یہ تنظیم خان عبدالغفار خاں کی قائم کردہ خدائی خدمت گار کی وسیع شکل ہے، اس کے مقاصد سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے، فرقہ پروری کو ختم اور بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے جتنی کوششیں بھی کیجائیں مفید ہی ہیں لیکن اصل سوال عمل کا ہے، قومی یکجہتی کونسل بڑے زور شور سے قائم ہوئی لیکن آجتک اسکا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اصل میں فرقہ پروری کا زہر اتنا پھیل چکا ہے کہ ملک کا کوئی طبقہ بھی اس سے محفوظ نہیں ہے، اس لیے افراد کو چھوڑ کر کسی جماعت میں بھی کھل کر اس کی مخالفت کی ہمت اور اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اسی لیے اتحاد و یکجہتی کی کوئی تحریک بھی کامیاب نہیں ہوتی۔

فرقہ پروری کا مقابلہ اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے جب حکومت اور پبلک دونوں اپنے اپنے

حلقہ میں اسکے دور کرنے کی پوری جد وجہد کریں، حکومت فرقہ پرور جماعتوں کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھے اور انکے لیڈروں اور اخبارات کی تقریروں اور تحریروں کا محاسبہ کرے تعلیم کے ذریعہ جو زہر پھیلایا جارہا ہو اسکو روکے، فرقہ پرور حکام پر کڑی نظر رکھے، جن کی فرقہ پروری ثابت ہوجائے انکو پوری سزا دیجائے، اس قسم کے اور جو کام حکومت کے کرنے کے ہیں، ان کو حکومت انجام دے، کانگریس اور دوسری سیکولر پارٹیاں آل انڈیا پیمانہ پر فرقہ پروری کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، گاؤں گاؤں میں اتحاد و یکجہتی کا پیغام پہنچائیں، فرقہ پرور جماعتوں نے مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں، انکو دور کریں اور اس راہ میں اپنی مقبولیت اور جاہ اقتدار سب کی بازی لگادیں، اس وقت کچھ کامیابی کی امید ہوسکتی ہے محض وعظ و پند سے فرقہ پروری کا زہر دور نہیں ہوسکتا اور اب یہ منزل آگئی ہے کہ یا فرقہ پروری کا مقابلہ کرکے اس کو ختم کیا جائے یا سیکولرزم اور جمہوریت کو خیرباد کہا جائے، اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد حکومت ہند کی سرپرستی میں بدستور اپنے کاموں میں مصروف ہے، بلکہ پہلے کے مقابلہ میں اسکا کام بڑھ گیا ہے، چنانچہ ادھر چند برسوں کے اندر اس نے جتنی اہم اور مفید کتابیں شائع کی ہیں اتنی مدت میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوئی تھیں، دائرۃ المعارف اپنی مطبوعات دارالمصنفین کو ہدیۃً بھیجتا ہے، اسکی پہلے جو کتابیں آئی تھیں اہل علم کی آگاہی کیلئے معارف میں انکا ذکر کیا گیا تھا، اب اسنے حسب ذیل مطبوعات بھیجی ہیں (۱) انباء الغمر فی ابناء العمر ابن حجر عسقلانی جلد اول و دوم (۲) کتاب الحاوی زکریا رازی کی بیسویں اور اکیسویں جلد (۳) کتاب الا لمام محمد بن قاسم نویری، پہلی و دوسری جلد (۴) نظم الدرر ابراہیم بن عمر بقاعی، جلد اول (۵) کنز العمال شیخ علی متقی، پندرہویں سولھویں جلد (۶) کتاب الاصل امام محمد جلد دوم۔ ان میں سے بعض کتابیں غیرمطبوعہ تھیں اور بعض کی پہلی جلدیں اس سے پہلے آچکی ہیں، دارالمصنفین اس قیمتی ہدیہ کے لیے دائرۃ المعارف کے کارکنوں کا شکر گذار ہے۔

مقالات

تصوّف اور اس کے مسائل

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)، سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یہ مسائلِ تصوف، یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

منجملہ ان مسائل کے جو اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ دار المصنفین میں حاضرین کے سامنے آئے، ایک تصوف کا مسئلہ بھی تھا، ہمارے محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا مقالہ وحدت الوجود پر یا اس کے کسی خاص پہلو پر تھا، وقت کی قلت کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا، لیکن فاضل معاصر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اپنے مقالہ میں ضمنی طور پر تصوف کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "ہندوستان میں اسلام آیا، تو جن چیزوں سے اس کو نقصان پہنچا، ان میں ایک تصوف بھی ہے"۔ اس پر بعض اصحاب معترض ہوئے، اور مولانا نے فراخدلی سے اپنی رائے میں ترمیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

اگر میں مولانائے ممدوح کے بیان کو صحیح طور پر سمجھا ہوں تو اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ہندوستان میں ورود اسلام کے بعد یہاں تصوف پیدا ہوا، اور وہ اسلام کے لیے نقصان یعنی ضعف کا باعث ہوا، دوسری بات جو ضمنی طور پر ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ ان کی رائے میں تصوف بنفسہ ایک ایسی تحریک ہے جو سقیم ہے، اور اسلام کیلئے

نقصان دہ ثابت ہوئی ہے، لیکن یہ دونوں باتیں غور طلب ہیں، بہرحال مسئلہ کو جس صورت میں پیش کیا گیا، اس میں قدرے الجھن ہے، اسی لیے بعض حاضرین کو اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانائے موصوف کے مفہوم کو سمجھنے میں اگر میں نے غلطی کھائی ہے تو میں ان کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کرتا ہوں اور اپنے قصور فہم کا اعتراف کرتا ہوں، بہرحال میرے نزدیک اس مسئلہ کی جو صحیح صورت ہے، اس کو سطور ذیل میں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں،

حضرت انسان نے کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی جو مسلسل کوشش کی ہے، اس کوشش کے نتائج نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں کئی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، مثلاً دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ تمام اسی کوشش اور جستجو کی بدولت معرض وجود میں آئے ہیں، سامی اقوام کے مذاہب میں نوع انسان کا ارشاد و ہدایت وحی اور رسالت (Revelation Through Prophets) کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے، درحالیکہ آریائی قوموں کے ہاں عامۃ الناس اوتار (Incarnation) کے واسطہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اہل چین کا مذہب بیشتر ضابطۂ اخلاق کا نام ہے جو الٰہیات (Theology) کے مسائل سے بہت کم سروکار رکھتا ہے، اہل مذاہب کے علاوہ فلاسفہ کا ایک گروہ ہے جو کائنات کے عقدہ کو اپنی عقل (Reason) کے ناخن سے کھولنے کی سعی کرتا ہے،

مذہب (Religion) اور فلسفہ (Philosophy) کے علاوہ اسی سلسلہ کا ایک اور "طرز خیال یا انداز فکر" ہے، جسے انگریزی میں Mysticism کہتے ہیں، یہ متصوفانہ انداز فکر بھی تقریباً تمام ملتوں اور تمام ملکوں میں پایا جاتا ہے، اسکا

ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ mystic یعنی عارف اپنے ذاتی وجدان (intuition) سے حقائق کا علم حاصل کرتا ہے، اس کے انداز خیال میں روحانیت کا غلبہ رہتا ہے اور اس کے گھر کی رونق بیشتر اس کے جذبات کے خروش پر موقوف ہے۔

عالم اسلام بھی mysticism کی تحریک سے خالی نہیں رہا، اسلامی mysticism کو اصطلاحاً تصوف کہتے ہیں (تصوف کی لغوی تشریح اس مضمون کے آیندہ حصہ میں آئے گی)۔ تصوف کے ارتقاء کی ایک خاصی لمبی اور گوناگوں تاریخ ہے، جس کے دوران میں صوفیہ کے حالات اور ان کی تصنیفات کے علاوہ بہت سے اہم اعتقادی مسائل زیر بحث آتے ہیں، اور ان کی تفسیر و تشریح کے علاوہ ان کے مآخذ و مصادر کی تلاش ہوتی ہے، اہل اسلام کی مذہبی زندگی میں تصوف کو جو نمایاں مقام حاصل رہا ہے اس کے پیش نظر اس کا مطالعہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ضمن میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اگرچہ محمد بن قاسمؒ کی فتح سندھ سے اسلام کے قدم ہندوستان میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں پہنچ چکے تھے، اور سندھ کے بعض حکمرانوں اور بعض عوام نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن مرکز خلافت کی کمزوری یا عدم توجہ سے اسلام کا قدم سندھ اور ملتان سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خاص ہندوستان میں اسلام کی عام اشاعت اس وقت سے شروع ہوئی جب غزنوی خاندان کے عہد میں پنجاب کا غزنوی سلطنت کے ساتھ الحاق ہوا، اور لاہور میں شیخ اسمٰعیل لاہوریؒ اور شیخ علی ہجویریؒ نے ایک ناسازگار ماحول میں اسلام کی تبلیغ شروع کی اور یہ زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے۔

اس زمانہ میں ہندوستان میں جو mystic (یعنی متصوفانہ) تحریک قدیم الایام سے رائج چلی آ رہی تھی، وہ ویدانت ہی کی ایک شاخ تھی، جہاں تک تصوف کا تعلق ہے

نقصان وہ ثابت ہوئی ہے، لیکن یہ دونوں باتیں غور طلب ہیں، بہرحال مسئلہ کو جس صورت میں پیش کیا گیا، اس میں قدرے الجھن ہے، اسی لیے بعض حاضرین کو اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانائے موصوف کے مفہوم کو سمجھنے میں اگر میں نے غلطی کھائی ہے تو میں ان کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کرتا ہوں اور اپنے قصور فہم کا اعتراف کرتا ہوں، بہرحال میرے نزدیک اس مسئلہ کی جو صحیح صورت ہے، اس کو سطور ذیل میں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں،

حضرت انسان نے کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی جو مسلسل کوشش کی ہے، اس کوشش کے نتائج نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں کئی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، مثلاً دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ تمام اسی کوشش اور جستجو کی بدولت معرض وجود میں آئے ہیں، سامی اقوام کے مذاہب میں نوع انسان کا ارشاد و ہدایت، وحی اور رسالت (Revelation Through Prophets) کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے، درحالیکہ آریائی قوموں کے ہاں عامۃ الناس اوتار (Incarnation) کے واسطہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اہل چین کا مذہب بیشتر ضابطۂ اخلاق کا نام ہے جو الٰہیات (Theology) کے مسائل سے بہت کم سروکار رکھتا ہے، اہل مذاہب کے علاوہ فلاسفہ کا ایک گروہ ہے جو کائنات کے عقدہ کو اپنی عقل (Reason) کے ناخن سے کھولنے کی سعی کرتا ہے،

مذہب (Religion) اور فلسفہ (Philosophy) کے علاوہ اسی سلسلہ کا ایک اور "طرز خیال یا انداز فکر" ہے، جسے انگریزی میں Mysticism کہتے ہیں، یہ متصوفانہ انداز فکر بھی تقریباً تمام ملتوں اور تمام ملکوں میں پایا جاتا ہے، اسکا

ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ Mystic یعنی عارف اپنے ذاتی وجدان (Intuition) سے حقائق کا علم حاصل کرتا ہے، اس کے انداز خیال میں روحانیت کا غلبہ رہتا ہے اور اس کے گھر کی رونق بیشتر اس کے جذبات کے خروش پر موقوف ہے۔

عالم اسلام بھی Mysticism کی تحریک سے خالی نہیں رہا، اسلامی Mysticism کو اصطلاحاً تصوف کہتے ہیں (تصوف کی لغوی تشریح اس مضمون کے آئندہ حصہ میں آئے گی)۔ تصوف کے ارتقاء کی ایک خاصی لمبی اور گوناگوں تاریخ ہے، جس کے دوران میں صوفیہ کے حالات اور ان کی تصنیفات کے علاوہ بہت سے اہم اعتقادی مسائل زیر بحث آتے ہیں، اور ان کی تفسیر و تشریح کے علاوہ ان کے مآخذ و مصادر کی تلاش ہوتی ہے، اہل اسلام کی مذہبی زندگی میں تصوف کو جو نمایاں مقام حاصل رہا ہے اس کے پیش نظر اس کا مطالعہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ضمن میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اگرچہ محمد بن قاسمؒ کی فتح سندھ سے اسلام کے قدم ہندوستان میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں پہنچ چکے تھے، اور سندھ کے بعض حکمرانوں اور بعض عوام نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن مرکز خلافت کی کمزوری یا عدم توجہ سے اسلام کا قدم سندھ اور ملتان سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خاص ہندوستان میں اسلام کی عام اشاعت اس وقت سے شروع ہوئی جب غزنوی خاندان کے عہد میں پنجاب کا غزنوی سلطنت کے ساتھ الحاق ہوا، اور لاہور میں شیخ اسمٰعیل لاہوریؒ اور شیخ علی ہجویریؒ نے ایک ناسازگار ماحول میں اسلام کی تبلیغ شروع کی اور یہ زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے۔

اس زمانہ میں ہندوستان میں جو Mystic (یعنی متصوفانہ) تحریک قدیم الایام سے رائج چلی آ رہی تھی، وہ ویدانت ہی کی ایک شاخ تھی، جہاں تک تصوف کا تعلق ہے

وہ ہندوستان میں اسلام کے ہمراہ قدم بقدم آیا۔ چنانچہ شیخ علی ہجویریؒ مبلغ اسلام بھی تھے، اور ایک بلند پایہ صوفی بھی تھے۔ ان کے عالی مرتبہ پر ان کی مشہور عالم تالیف کشف المحجوب شاہد عدل ہے، جو تصوف پر فارسی زبان میں سب سے پہلی جامع اور مستند تالیف تسلیم کیجاتی ہے' اشاعتِ اسلام کے راستہ کا دوسرا سنگ میل خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (متوفی ۶۳۳ھ) نے نصب کیا، جن کو صوفیہ کے چشتیہ طریقہ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے، اور جو اپنی بیمثال کامیابی اور اپنے وسیع اثر و رسوخ کے لحاظ سے ہندوستان کے مبلغین میں غالباً سب سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں،۔ الغرض جب تصوف اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آیا، اس وقت نہ صرف یہ کہ عالمِ اسلام میں دوسری صدی ہجری میں تصوف زہد کی صورت میں پیدا ہو چکا تھا، بلکہ زہد کے مرحلہ سے گزر کر تھیا سوفی (Theosophy) کی منزل میں داخل ہو چکا تھا، اور اس کے علاوہ اس میں حلول، اتحاد اور ارواح انسانی کے انفصال (Emanation) و انجذاب کی قسم کے کئی ایک غیر اسلامی تصورات رونما ہو چکے تھے۔

ہندوستان میں اسلام کو جو ضعف پہنچا ہے وہ بیشتر یہاں کی قدیم مشرکانہ رسوم و توہمات کے استمرار اور بدعات کے ظہور سے پہنچا ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے :

سطوتِ اسلام قائم جن نمازوں سے ہوئی ‌ ‌ ‌ ‌ وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے وہ بھی ہندوستان کے غیر اسلامی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، تصوف میں جو غیر اسلامی عناصر پہلے ہی سے موجود تھے، ان کو مقامی ماحول کے اثر سے مزید تقویت پہنچی اور انھوں نے ہندوستان کے صوفیہ کے ہاں خوب فروغ پایا، مثلاً ہندوستان تو پہلے ہی سے عقیدہ "ہمہ اوست" کا ایک قدیمی گڑھ چلا آرہا تھا، اس لیے اس

عقیدہ کے لیے یہاں کی فضا بڑی سازگار ثابت ہوئی اور اکثر مسلمان صوفیہ "وحدت الوجود" کے سیلاب میں بہ نکلے، یہاں تک کہ اس کو روکنے کے لیے "وحدت الشہود" کا نظریہ پیش کرنا پڑا۔

اہل اسلام کو تصوف سے نقصان پہنچا ہے یا فائدہ؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے اس بات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ تصوف کسی خاص منظم عقیدہ یا فرقہ کا نام نہیں جس کی تعلیمات معین ہوں، اگرچہ متعدد صوفیہ مثلاً ابوالقاسم قشیری، شیخ علی ہجویری اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ اور کلاباذی نے اپنے اپنے زمانے میں اور اپنے اپنے انداز میں تصوف اور اس کے مسائل کی تشریح کی ہے، لیکن اس کے باوجود تصوف کے اصول اور صوفیہ کے مختلف نظریات اور تصورات کسی ایسی منظم صورت میں مدون نہ ہو سکے، جس پر تمام یا اکثر صوفیوں کا اتفاق ہو، تصوف دراصل محض ایک روحانی انداز فکر ہے، جس میں ظواہر دین کی بجائے مذہب کے روحانی اور اخلاقی پہلو پر زور دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ مختلف صوفیہ نے مختلف عقائد اور نظریات کو اہمیت دی ہے، صوفیوں کے ہاں کئی مختلف سلسلے ہیں، جن کے اپنے اپنے رجحانات اور خیالات ہیں، الغرض تصوف کے کئی رنگ ہیں اور وہ دوسری صدی ہجری سے لیکر آج تک یعنی گذشتہ تیرہ صدیوں میں ترقی وکمال اور اس کے بعد انحطاط و ابتذال کے کئی مختلف مراحل سے گزر چکا ہے، تصوف کا غیر معین ہونا اس امر سے بھی ثابت ہے، کہ بہت سے صوفیہ کرام تصوف کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن مجھے آج تک دو صوفی ایسے نظر نہیں آئے، جنھوں نے تصوف کی تعریف (Definition) یکساں طور پر کی ہو، ان وجوہات سے تصوف کے متعلق کوئی ایسا حکم نہیں لگایا جا سکتا، جس کا اطلاق تمام صوفیہ پر اور صوفیہ کے تمام سلسلوں پر اور تصوف کے تمام پہلوؤں پر یکساں طور پر ہو سکے۔

تصوف کے مفید یا مضر ہونے کا مسئلہ تصوف کی اس خاص صورت پر موقوف ہے جو محقق یا مبصر کے پیش نظر ہو، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، تصوف کے کئی رنگ ہیں، اور مختلف اسلامی ملکوں میں اس کے کئی مختلف رجحانات اور مختلف خصوصیات نظر آتی ہیں، اور جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے، تصوف کے بعض پہلو بڑے روشن اور درخشندہ ہیں، مثلاً تصوف نے اسلام کے روحانی پہلو پر زور دیکر تہذیب اخلاق کے سلسلہ میں بڑی بیش بہا خدمت سرانجام دی ہے، اس کے علاوہ بہت سے صوفیہ کرام نے مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور سیدی محمد بن علی سنوسی وغیرہ ہم نے اپنی زندگی میں اور انکے بعد ان کے سلسلوں نے تبلیغ اسلام میں بڑی جانفشانی دکھائی ہے، اور ان کی مخلصانہ کوششوں سے اسلام نے دور دراز ملکوں میں اشاعت پائی ہے، علاوہ بریں جب کبھی مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، تصوف نے شکستہ دلوں کو سہارا دیا ہے اور ان کو یاس و قنوط سے بچایا ہے، اور اس طرح سے مسلمانوں کے بقاء کا سامان کیا ہے، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں عوام میں صوفیہ کے سلسلوں کو جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی، اس کی بیشتر وجہ یہی تھی کہ عامۃ الناس اس زمانہ کے سیاسی انتشار سے تنگ آکر اپنی روحانی تسکین کے لیے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھے، جن احباب کے سامنے تصوف کے مذکورۂ بالا روشن پہلو ہیں، وہ تصوف کو فیض رساں تصور کرنے میں حق بجانب ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کرنا لازم ہے کہ بعض صوفیہ کے ذریعہ سے بعض غیر اسلامی عقائد (مثلاً وحدت الوجود کا عقیدہ اور ارواح کا انفصال و انجذاب جو سراسر ویدانت ہے) مسلمانوں کے ہاں راہ پا گئے ہیں، اور اس قسم کے تصورات اور عقائد نے اس خاموشی سے سرایت کی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی، اور ان عقائد کا تسلط

اماز بردست ہے کہ بہت سے صوفیہ ان کو عین اسلام سمجھتے ہیں، غالباً تصوف کا یہی وہ افسوسناک پہلو ہے جو ہمارے بعض احباب کی نگاہ میں کھٹکتا ہے، اور میرے خیال میں بجا طور پر کھٹکتا ہے،

ان کے علاوہ تصوف میں بعض ایسے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں (مثلاً ترک دنیا، عزلت گزینی، حجرہ نشینی، نفس کشی، انکار کسب اور توکل کا غلط مفہوم) جن کو اگرچہ قطعی طور پر غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا، لیکن وہ کسی ایسی قوم کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے جو اس دنیا کی بین الاقوامی تگ و دو میں عزت و آبرو کے ساتھ باوقار زندگی بسر کرنا چاہتی ہے، مذکورۂ بالا رجحانات کے سبب سے زمانۂ حال کے اکثر حلقوں میں صوفیہ کے بارے میں خاصی بدظنی پائی جاتی ہے، چنانچہ اقبال نے کسی زمانہ میں صوفیوں کی جو مذمت کی تھی، وہ بھی اسی بنا پر تھی کہ صوفیہ کے بعض حلقوں میں ترک دنیا اور گریز کی طرف جو میلان پایا جاتا ہے، وہ اسے جمود اور بےعملی کا مترادف سمجھتے تھے، اور اسے قوم کے حق میں نقصان دہ خیال کرتے تھے،

میں ذاتی طور پر اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ بعض نیک نفس اور پاک طینت بزرگوں نے اگر وقتی طور پر گوشہ گیری اختیار کی تھی تو اس کی بیشتر وجہ یہ تھی کہ وہ دلجمعی کے ساتھ یاد الٰہی میں مشغول ہونا چاہتے تھے،

ڈاکٹر اقبال نے اپنی رائے کے اظہار کے موقع پر بدقسمتی سے ایک غلط مثال کا انتخاب کیا تھا، یعنی اس سلسلہ میں خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کو مورد طعن بنایا تھا جس سے تمام ارباب ذوق کو بیحد دکھ پہنچا تھا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو فراموش کر دیا تھا کہ خواجہ حافظ کوئی بےکار قسم کے گوشہ گیر صوفی نہ تھے، بلکہ وہ حفظ قرآن کے بعد تمام عمر پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہے، اور ان کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندگی میں اپنا کلام بھی جمع نہ کر سکے،

وہ کلام معجز نظام جس نے ان کی عین حیات ہی میں عالمگیر شہرت حاصل کرلی تھی بقول ائے

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ ۔۔۔ بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

جیسا کہ ناظرین کرام خوب جانتے ہیں، خواجہ حافظ کا کلام ان کی وفات کے بعد ان کے ایک قدر شناس محمد گل اندام نے جمع کیا تھا، چنانچہ جامع دیوان اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"لے محافظتِ درس قرآن و ملازمت شغل سلطان وتحشیہ کشاف ومصباح و مطالعہ مطالع و مفتاح وتحصیل قوانین ادب و دواوین عرب از جمع ابیات و غزلیاتش مانع آمدے واز تدوین و اثبات ابیاتش وازع گشتے۔"

چوں شعر عذب روانش زبر کنی گوئی ۔۔۔ ہزار رحمت حق بر روانِ حافظ باد

آجکل تصوف کے متعلق جو عام بد گمانی پائی جاتی ہے، اس کے بعض اسباب کی طرف اشارہ کر چکا ہوں لیکن ان کے علاوہ کچھ اسباب اور بھی ہیں، مثلاً

(۱) صوفیوں کے شطحات اور مجذوبوں کی بڑیں۔

(۲) صوفیہ کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں بالعموم کرامات کی بھرمار ہوتی ہے، لیکن موجودہ زمانے کا مزاج اس قدر بدل چکا ہے کہ آجکل کا ذہن ان خوارقِ عادات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، اور بجائے اس کے کہ پڑھنے والا ان کرامات سے اچھا اثر قبول کرے وہ الٹا صوفیہ کے خوش عقیدہ مریدوں سے بدظن ہوجاتا ہے، اور ان کو توہم پرست سمجھتا ہے،

(۳) تصوف کی بعض کتابوں میں کمزور بلکہ موضوع حدیثوں سے کام لیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے روایات کے پرکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی، اس سے یہ لازمی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا بیان اور استدلال خود بخود کمزور ہوجاتا ہے۔

(۴) بعض مکار اور ریاکار لوگ باخدا صوفیوں کے حلقہ میں شامل ہوکر ان کی بدنامی کا

باعث ہوئے ہیں، لیکن یہ شکایت تو خاصی پرانی ہے، چنانچہ خواجہ حافظ مدت ہوئی کہہ گئے ہیں،

صوفی بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز غرۂ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

(۵) مکار لوگوں کے علاوہ بے شرع صوفیوں اور قلندروں نے صوفیہ کی صفوں میں داخل ہو کر تصوف کے وقار کو سخت ٹھیس لگائی ہے، بلکہ تصوف کی لٹیا ہی ڈبو دی ہے، کیونکہ عام لوگ ان کو بھی تصوف کے نمائندے سمجھتے ہیں،

(۶) بعض صوفیوں نے حلاج جیسے انتہائی مشکوک کیرکٹر اور کردار کے شخص کو ولایت کا درجہ دے رکھا ہے، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جن صوفیہ کی اصابت رائے کا یہ حال ہو کہ وہ حلاج جیسے شخص کو ولی سمجھتے ہیں، ان کی باقی باتوں کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے،

(۷) ایک قوی سبب تنفر کا یہ بھی ہے کہ بعض صوفیہ کی وجہ سے غیر اسلامی عقائد اور تصورات مسلمانوں کے ہاں رائج ہو گئے ہیں، اس لیے بعض احباب کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ تصوف نے کسی زمانہ میں کوئی مفید خدمت انجام دی ہو لیکن تصوف بالآخر اسلام کے حق میں ایک چور دروازہ ثابت ہوا ہے، جس کے راستہ سے غیر اسلامی عناصر مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہو گئے ہیں، (ان عناصر کی تفصیل و تشریح مضمون کی آیندہ قسط میں کی جائے گی)

اصطلاحاتِ صوفیہ

تصوف کے مطالعہ کی چند ایک مشکلات ہیں، ان میں سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ صوفیۂ کرام کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں، جن کے ذریعہ سے وہ اپنے تصورات، خیالات اور وجدانی کیفیات کو ادا کرتے ہیں، اگرچہ یہ اصطلاحات بالعموم عربی زبان کے کلمات پر مشتمل ہیں، اور

ان میں سے متعدد الفاظ خود قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن صوفیہ ان الفاظ کو اپنے مخصوص معنوں میں استعمال کرتے ہیں، بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی اصطلاحی لفظ کی مختلف صوفیہ نے مختلف طور پر تشریح کی ہے، چونکہ صوفیہ کی اکثر اصطلاحات کا تعلق ذہنی تصورات اور وجدانی کیفیات سے ہے، اس لیے ان کے مفہوم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا یا متعین کرنا چنداں آسان کام نہیں ہے،

صوفیہ کی اصطلاحات کے بارے میں عربی زبان کی عام متداول لغاتیں مثلاً جمہرۃ ابن درید، صحاح جوہری، لسان العرب اور قاموس فیروز آبادی چنداں مفید نہیں ہیں، کیونکہ ان میں بیشتر زمانۂ جاہلیت یا صدر اسلام کی زبان سے سروکار رکھا گیا ہے، اور چونکہ ان کے مؤلفین کے نزدیک صرف جاہلی شعراء کی زبان ٹکسالی تھی، اس لیے انھوں نے لغوی شواہد بھی ان ہی کے کلام سے لیے ہیں، اس طریق تالیف کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جہانتک مسلمانوں کے تمدن اور ان کے علوم وفنون کا تعلق ہے، یہ لغاتیں اپنی وسعت اور ضخامت کے باوجود کفایت نہیں کرتیں، لہذا علمائے اسلام اس بات پر مجبور ہوئے کہ مختلف علوم وفنون کے متعلق خصوصی لغاتیں تیار کریں، چنانچہ قرآن پاک کے الفاظ کی تشریح کے لیے امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے المفردات فی غریب القرآن تالیف کی، اور کتب حدیث کے الفاظ کی شرح کے لیے ابو السعادات ابن الاثیر جزری (م ۶۰۶ھ) نے النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ایک وسیع پیمانہ پر تصنیف کی، اور علم حدیث کی خاص اصطلاحات کو حافظ ابن حجر نے نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر میں جمع کیا اور بعد ازاں اس کی شرح بھی لکھی،

ان کے علاوہ محمد بن یوسف الکاتب الخوارزمی نے جب ۳۶۶ھ میں مفاتیح العلوم لکھی تو علوم قدیمہ اور جدیدہ کے موضوعات کی وضاحت کے علاوہ اکثر علوم کی خصوصی اصطلاحات

کی تشریح کی، مثلاً اس کے زمانے میں سرکاری دفتروں میں جو کلمات اصطلاحی حیثیت اختیار کر چکے تھے، ان کے معانی بتائے، اسی طرح فلسفہ اور موسیقی کے بیان میں ان علوم کی اصطلاحات پر بھی روشنی ڈالی۔ علاوہ بریں ہندوستان میں شیخ محمد علی تھانوی نے "کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم" کے نام سے ایک ضخیم اور نہایت مفید لغت تیار کی جس کا سنہ تالیف ۱۱۵۸ھ ہے۔

جہاں تک تصوف کی اصطلاحات کا تعلق ہے عام ناظرین اور محققین دونوں کیلئے مندرجۂ ذیل کتابیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں:

(۱) کتاب التعریفات ۔ تالیف السید الشریف الجرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) مطبوعہ استنبول ۱۲۵۳ھ، اگرچہ یہ کتاب تصوف کی اصطلاحات کے ساتھ مخصوص نہیں، تاہم اس میں صوفیہ کی بہت سی مصطلحات مل جاتی ہیں۔

(۲) رسالۃ فی بیان اصطلاحات ابن العربی الواردۃ فی الفتوحات۔ یہ رسالہ تعریفات الجرجانی کے اس اڈیشن کے ذیل میں شائع ہوا جو مطبعہ وہبیہ (مصر) میں طبع ہوا تھا،

(۳) شرح علی فصوص الحکم لمحی الدین بن العربی۔ تالیف کمال الدین عبدالرزاق کاشانی (متوفی ۷۵۱ھ) مطبوعہ مصر ۱۳۰۹ھ۔

(۴) کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم۔ تالیف الشیخ محمد علی تھانوی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء۔ یہ کتاب تصوف کی اصطلاحات کے لیے مخصوص نہیں، تاہم اس میں صوفیہ کی اکثر اصطلاحات کی شرح مل جاتی ہے،

مذکورۂ بالا مؤلفات کے علاوہ ذیل کی معروف کتابوں میں بھی صوفیہ کی بہت سی اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے، چونکہ یہ کتابیں بڑے بلند پایہ صوفیہ کے قلم سے نکلی ہیں، اس لیے ان کا پایۂ استناد بھی اسی نسبت سے بلند ہے۔ امید ہے کہ یہ نشاندہی ان احباب کے لیے مفید رہے گی جو تصوف کا خصوصی مطالعہ کر رہے ہیں:-

(۱) کتاب اللمع فی التصوف تالیف الشیخ ابی النصر السراج الطوسی (متوفی ۳۷۸ھ)

بتصحیح ڈاکٹر نکلسن۔ مطبوعہ لائڈن ۱۹۱۴ء۔

اس کتاب میں ۱۴۴ مصطلحات کی شرح ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳۳ سے لیکر ۳۷۴ تک۔

(۲) الرسالۃ القشیریۃ (سنہ تالیف ۴۳۸ھ) تالیف ابی القاسم عبدالکریم قشیری (متوفی ۴۶۵ھ) طبع بولاق ۱۲۸۴ھ۔

مؤلف نے اس رسالہ کے ایک خاص باب میں ایک سو دو اصطلاحات کی تشریح کی ہے، اس باب کا عنوان یہ ہے: فی تفسیر الفاظ تدور بین هذه الطائفة۔

(۳) کشف المحجوب تالیف شیخ علی ہجویریؒ (پانچویں صدی ہجری)

اس کتاب کے آخری حصہ میں مؤلف نے ایک خاص باب (کشف الحجاب العاشر) صوفیہ کی اصطلاحات کی تشریح کے لیے وقف کیا ہے، اور اس میں ایک سو چھ اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔

(۴) منازل السائرین الی الحق تالیف ابی اسمٰعیل الہروی (متوفی ۴۸۱ھ) مطبعۃ السادۃ ۱۳۲۷ھ۔

اس کتاب میں ایک سو مصطلحات کی شرح کی گئی ہے۔

عبدالرزاق کاشانی نے منازل السائرین کی شرح لکھی تھی، جو ۱۳۱۵ھ میں طبع ہو چکی ہے، اصطلاحات کے سلسلہ میں اس شرح کا دیکھنا بھی بہت مفید ہے۔

(۵) امام غزالی نے بھی احیاء علوم الدین میں صوفیہ کی بہت سی اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔

(۶) عوارف المعارف (سنہ تالیف ۵۶۰ھ) تالیف شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ (متوفی ۶۳۲ھ) مطبوعہ مصر ۱۲۹۴ھ۔

اس معروف کتاب میں بھی صوفیہ کی بعض مصطلحات کی تشریح کی گئی ہے۔

اگر کوئی صاحب ہمت کریں تو مذکورہ بالا کتابوں کی مدد سے اور ان کے بیانات کے باہمی مقابلہ سے اردو میں اصطلاحات صوفیہ کی ایک جامع اور مستند لغت تیار ہو سکتی ہے، اور وہ کتبِ تصوف سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے ایک مفید اور قیمتی تحفہ ثابت ہو سکتی ہے۔

لفظ صوفی کی اصل کیا ہے

مولانا جامی رقمطراز ہیں کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے، ابو ہاشم سفیان ثوری (متوفی سنہ ۱۶۱ھ) کے ہمعصر تھے، اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس لقب کی اصل کیا ہے؟ جو بزرگوں کی ایک خاص جماعت کیلئے استعمال ہوا اور جو ان کے لیے آج تک مروج چلا آرہا ہے، اس لفظ کی اصل کے بارے میں کئی اقوال منقول ہوئے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ یہ یونانی لفظ Sophos سے ماخوذ ہے جس کے معنی "دانشمند" ہیں، لیکن اس قول کی تائید میں کوئی مضبوط لسانی یا تاریخی دلیل پیش نہیں کی گئی، شیخ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیاء کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد صوفیہ نے اسے "صفا" سے ماخوذ بتایا ہے، لیکن علم صرف اور لغوی قیاس کے اصولوں سے یہ اشتقاق درست ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ "صفا" اور "صوفی" کے اصلی مادے الگ الگ ہیں، ایک کا مادہ "صفو" ہے اور دوسرے کا "صوف"۔ تیسرا قول یہ ہے کہ صوفی صوف سے مشتق ہے جس کا معنی اون ہے، اور صوفیہ کے صوفی کہلانے کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ لوگ از راہ زہد و تقشف ریشم یا روئی یا کتان کے کپڑوں کی بجائے اونی لباس پہنتے تھے، اس لیے صوفی کہلائے، علامہ ابن خلدون نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے، چنانچہ وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ قُلتُ والاظهرُ ان قيل بالاشتقاقِ انّهٗ من الصُّوف وهم فى الغالب مختصُّون بلُبسه لِمَا

کانوا علیہ من حثا لفتۃ الناس فی لبس فاخر الثیاب الی لُبس الصّوف ، یعنی جہانتک لفظ صوفی کے اشتقاق کا تعلق ہے میری رائے میں یہ لفظ غالباً صوف سے ماخوذ ہے، کیونکہ صوفیہ میں سے اکثر لوگ عوام کے برعکس لباس فاخرہ کی بجائے اونی کپڑے پہنتے تھے"۔

لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں مغربی علماء کے ہاں بھی ایک مدت سے بحث چلی آرہی تھی، آخرکار پروفیسر نولڈکہ نے حسب معمول اپنی مخصوص ژرف نگاہی سے اس مسئلہ کی تحقیق کی اور اس کے لسانی، تاریخی اور عمرانی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے، انھوں نے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا کہ اسلام کی پہلی دو صدیوں میں عوام کے علاوہ خصوصاً زاہد اور پرہیزگار لوگ اونی کپڑے پہنتے تھے، چنانچہ قدیم کتابوں میں لَبِسَ الصّوفَ کا جملہ اکثر آیا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ فلاں شخص ترک دنیا کرکے زاہد بن گیا ہے، اور بعد میں جب زہد نے تصوف کی صورت اختیار کرلی تو اس جملہ سے یہ مراد لینے لگے کہ فلاں شخص صوفی بن گیا ہے، اس رائے کی اس امر سے بھی تائید ہوتی ہے کہ فارسی زبان میں صوفی کو پشمینہ پوش کہا گیا ہے، شام کے عیسائی راہبوں میں کئی صدیوں سے اونی لباس مروج چلا آرہا تھا، اس لیے ان ملکوں کے مسلمان زاہدوں کا اونی لباس اختیار کرنا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے، پروفیسر نولڈکہ کا یہ مقالہ جرمن اورینٹل سوسائٹی کے مجلہ کی ۴۸ ویں جلد مجریہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا، چنانچہ اس وقت سے مغربی علماء کے ہاں لفظ صوفی کی اصل کے بارے میں پروفیسر ممدوح ہی کا قول مقبول چلا آرہا ہے۔

صوفی کی جمع صوفیہ آتی ہے، چنانچہ امام قشیری اپنے رسالہ کے متعلق لکھتے ہیں :-

ھٰذہ الرّسالۃ کتبھا...... القشیریّ الی جماعۃ الصّوفیۃ ببُلدان الاسلام۔

صوفیہ کے طرز خیال اور طرز زندگی کا نام تصوف ہے۔

متصوف اور متصوفہ دونوں تصوف سے ماخوذ ہیں، اور صوفی اور صوفیہ کے مترادف سمجھے جاتے ہیں۔

تصوف کیا ہے؟

تصوف کیا ہے اور صوفی کون ہے؟ بجائے اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں، بہتر ہے کہ اس کا جواب خود صوفیۂ کرام کی زبان فیض ترجمان سے سنیے :-

۱۔ حضرت حسن بصری (متوفی سنہ ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ "معرفت یہ ہے کہ بندہ اپنے اندر تھوڑی سی بھی خصومت نہ پائے۔" یعنی عارف پورے طور پر راضی برضا ہو۔ آپ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ "فکر اور تقویٰ بہترین عمل ہیں۔"

۲۔ حضرت سفیان ثوری (متوفی سنہ ۱۶۱ھ) کا قول ہے کہ "عارف خدا سے مشغول ہو کر اس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "ہمیں چاہیے کہ اللہ کو سب سے زیادہ دوست رکھیں۔"

۳۔ ابراہیم بن ادہم بلخی (متوفی سنہ ۱۶۱ھ) نے فرمایا کہ "عارف کی نشانی یہ ہے کہ اس کا دل سوچ بچار میں ڈوبا رہے، اس کی گفتگو خدا تعالیٰ کا ذکر ہو، اور اس کا بیشتر عمل خدا کی عبادت ہو، اور اس کی اکثر نظر اس کے لطائف قدرت اور عجائب صنعت پر رہے۔"

آپ کی مناجات یہ تھی "اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ آٹھوں بہشت اُس سرفرازی کے مقابلہ میں جو تو نے مجھکو دی ہے اور تیری محبت اور ذکر دانس اور تیری عطا کردہ فراغت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔" اس مناجات کے علاوہ یہ دعا بھی اکثر اوقات ان کی زبان پر جاری رہتی تھی "اے خداوند کریم! عصیان اور نافرمانی کی شرم و ندامت سے اٹھا کر مجھے اپنی اطاعت کے شرف سے سرفراز کر۔"

۴۔ خواجہ ابو علی شقیق بلخی (متوفی سنہ ۱۷۴ھ) کا قول ہے کہ "سات سو عالموں سے پوچھا گیا

کہ خردمند کون ہے، تونگر کون ہے، زیرک کون ہے، درویش کون ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا "جو دنیا کو دوست نہ رکھے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "اصل طاعت خوف، رجا اور محبت ہے۔"

آپ کا ایک دیگر قول یوں منقول ہے کہ "طاعت کا ۹/۱۰ حصہ خلقت سے دوری پر مشتمل ہے اور باقی ایک عشر سکوت اور خاموشی ہے۔"

خواجہ شقیق بلخی نے توکل علی اللہ پر خاص طور پر زور دیا ہے اور یہ عقیدہ ان کے تصوف کی خصوصیت ہے، آپ نے فرمایا کہ "متوکل کو رزق کے اکتساب کے لیے مطلق کوشش نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی کوئی پیشہ یا حرفہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کا واحد معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔"

۵۔ حضرت رابعہ بصریہ (متوفیہ ۱۸۵ھ) کے اقوال سے ثابت ہے کہ ان کا تصوف سراسر حب اللہ پر مشتمل تھا، کسی نے ان سے پوچھا "کیا تمھیں خدا سے محبت ہے"؟ جواب دیا کہ "ہاں" پھر ان سے پوچھا گیا "کیا تمھیں شیطان سے نفرت ہے"؟ بولیں "مجھے خدا سے جو محبت ہے اس نے میرے دل میں شیطان سے عداوت کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔" پھر بولیں کہ "میں نے رسول خدا کو خواب میں دیکھا، آنحضرتؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا" اے رابعہ! کیا تجھے مجھ سے محبت ہے"؟ میں نے عرض کی" یا رسول اللہ! وہ کونسا فرد بشر ہے جس کو آپ سے محبت نہیں! لیکن خدا کی محبت نے مجھے اس قدر مشغول کر رکھا ہے کہ کسی اور کی محبت یا نفرت کے لیے میرے دل میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔"

ڈاکٹر نکلسن کی رائے ہے کہ مسلمان صوفیہ میں تھیاسوفی یعنی حب اللہ کا دور رابعہ بصریہ ہی کی ذات سے اور اسی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔

۶۔ شیخ فضیل بن عیاض (متوفی ۱۸۷ھ) کا قول ہے کہ "دوستانِ خدا کو تین چیزیں ملی ہیں: حلاوت، ہیبت اور محبت۔" ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "میں نے خدا تعالیٰ کی عبادت دوستی کی

بنا پر کی ہے۔"

۷۔ معروف کرخیؒ (متوفی سنہ ۲۰۰ھ) کا قول ہے کہ "تصوف سے مراد حقائق کا حاصل کرنا اور احوالِ خلائق کا چھوڑنا ہے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "اولیاء اللہ کی تین نشانیاں ہیں، ان کا تمام سوچ بچار اللہ کے لیے ہوتا ہے، ان کا تمام کاروبار اللہ کے ساتھ ہے، اور انکی ہجرت بھی اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے۔"

۸۔ ابو سلیمان عبدالرحمٰن دارانی (م ۲۱۵ھ) نے سب سے پہلے مسلمان صوفیہ میں معرفت یا عرفان (Gnosis) کے نظریہ کو رواج دیا اور اس کو طرح طرح سے بیان کیا، چنانچہ ان کا قول ہے کہ "دنیا کی ہوا و حرص کے دام سے وہی لوگ خلاصی پا سکتے ہیں جن کے دل میں عرفان کی روشنی ہے، یہ روشنی ان کو آخرت کے خیال میں مشغول رکھتی ہے۔" آپنے یہ بھی فرمایا کہ "جب عارف کی روحانی آنکھ کھل جاتی ہے، تو اس کی جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے، اور وہ خدا کے سوا اور کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔"

۹۔ بشر بن حارث حافی (م ۲۲۷ھ) کا قول ہے کہ "صوفی وہ ہے جو اپنے دل کو خدا کے ساتھ صاف رکھے۔"

۱۰۔ ذوالنون مصریؒ (م ۲۴۵ھ) کے تصوف میں معرفت کے نظریہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "جس شخص کو خدا کی بہترین معرفت حاصل ہوتی ہے، وہی شخص خدا کی ذات میں سب سے زیادہ فنا ہوتا ہے۔"

ذوالنون مصری نے اس نظریہ پر بھی زور دیا ہے کہ خدا کا صحیح علم وجدان ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔

"عرفان" اور "وجدان" کے اصولوں کی وجہ سے ذوالنون مصریؒ کو تصوف کی تاریخ

میں بڑی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں کہ "ذوالنون مصری صوفیہ کے سرخیل ہیں اور ان کا سلسلہ ان ہی سے چلتا ہے"۔

۱۱۔ ابوتراب نخشبی (م ۲۴۵ھ) فرماتے ہیں کہ "صوفی کو کوئی شے مکدر نہیں کرسکتی بلکہ ہر شے اس کی بدولت صفائی حاصل کرتی ہے"۔

۱۲۔ شیخ سری سقطی (متوفی ۲۵۳ھ) بغداد کے ایک معروف صوفی تھے، اور تمام علوم و فنون اور معارف و حقائق میں یکتائے روزگار تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ بغداد میں دوکانداری بھی کرتے تھے، ایک دن ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں بزرگ نے جو کوہ لبنان میں گوشہ گیر ہیں، آپ کو سلام کہا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس پیر نے پہاڑ کی سکونت اختیار کی تو یہ کوئی بڑا کام نہیں کیا، مرد خدا کو چاہیے کہ میدان میں آئے اور بازار میں رہ کر مشغول بحق ہو۔

امام قشیری نے اپنے رسالہ میں تصوف کے بارے میں شیخ ممدوح کا یہ قول نقل کیا ہے آپ نے فرمایا کہ "تصوف تین چیزوں کا نام ہے، صوفی کا نور معرفت اس کی پرہیزگاری میں خلل انداز نہ ہو۔ دوسرے کسی علم کے باطن کی ایسی تفسیر نہ کرے جو کتاب و سنت کے نقیض ہو۔ تیسرے اپنی کرامات کے بل پر محارم اللہ کے پردے کو چاک نہ کرے"۔

۱۳۔ بایزید (ابویزید) بسطامی (متوفی ۲۶۱ھ) نے صوفیہ میں سب سے پہلے "فنا و بقا" کے مسئلہ کو رواج دیا، چنانچہ ان کا قول ہے کہ "جو شخص اپنے آپ کو حق (یعنی خدا) میں فنا کرتا ہے وہ زندگی جاوید پاتا ہے"۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ راہ خدا کیا ہے؟ بولے "راہ سے گم ہو کر فنا فی اللہ ہونا"۔

ابو علی سندھی نے ان کو "تجرید التوحید" کی تلقین کی تھی، اور اس کے بعد بایزید بسطامی نے

"فنا فی التوحید" کے بارے میں گفتگو کی، میری رائے میں "تجرید التوحید" اور "فنا فی التوحید" وحدت الوجود کے عقیدہ کی طرف پہلا قدم تھا، کیونکہ ان نظریوں میں توحید کی جو تفسیر کی گئی ہے وہ انسان کو وحدت الوجود کے عقیدہ کی طرف لے جاتی ہے۔ بایزید بسطامی نے خود کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن ان کے جو "شطحات" تذکروں میں منقول ہیں، ان میں ان کا وحدت الوجود کی طرف صریح میلان پایا جاتا ہے۔

۱۴۔ ابوحفص حداد نیشاپوری (م ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں کہ "تصوف سارے کا سارا ادب ہے، ہر ایک وقت کے لیے ایک ادب ہوتا ہے، اسی طرح ہر ایک مقام اور حال کے لیے بھی ایک ادب ہے، جس شخص نے آداب کو ملحوظ خاطر رکھا، وہ مردانِ خدا کے درجہ کو پہنچا۔"

۱۵۔ سہل بن عبد اللہ تستری (م ۲۸۳ھ) نے فرمایا کہ "ہمارے اصول چھ ہیں: کتاب اللہ کو مضبوط پکڑنا۔ رسول اللہ (صلعم) کے اسوہ کی پیروی کرنا، حلال کھانا۔ لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا، اگرچہ وہ ہمیں ضرر پہنچائیں۔ حرام سے پرہیز کرنا اور معاہدات کا بلاتوقف پورا کرنا۔"

۱۶۔ ابوالحسین احمد نوری (م ۲۹۵ھ) کا قول ہے کہ "دنیا سے نفرت کرنا اور خدا سے محبت کرنا تصوف ہے"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "تصوف رسوم و علوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق کا نام ہے"۔

۱۷۔ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) فرماتے ہیں کہ "تصوف استصفاء کا نام ہے، جو شخص اس طرح سے منتخب ہو کر ماسوا اللہ سے صاف اور منزہ کر دیا جائے، وہی سچا صوفی ہے"۔ تصوف کے بارے میں آپ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "تصوف کا مفہوم یہ ہے کہ حق پہلے تجھے مارے اور پھر اپنے اندر زندہ کرے (یہ وہی فناء و بقاء کا تصور ہے جس کو بایزید بسطامی پیش کر چکے تھے۔

۱۸۔ شیخ ابوبکر شبلی (م ۳۳۴ھ) فرماتے ہیں کہ "صوفی وہ ہے جو دونوں جہانوں

میں اللہ کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھے"۔ اٹھارہواں قول یہ ہے کہ صوفی خلق سے منفصل اور حق سے متصل ہوتا ہے"۔

۱۹۔ شیخ علی ہجویریؒ (پانچویں صدی ہجری) کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ "قاعدۂ ایں طریقت بر تجرد نہادہ اند.... و شرط آداب مجرد آنست کہ چشم را از ناشائست باز دارد و نادیدنی نبیند و آتش شہوت بہ جرسنگی بنشاند و دل از دنیا و مشغولی حوادث نگاہ دارد"۔

۲۰۔ حسین بن منصور حلاج (مصلوب ۳۰۹ھ) کے بہت سے اقوال اور شطحات تذکروں اور دیگر کتب تصوف میں منقول ہیں لیکن تصوف کے بارے میں جو بات اس نے تختۂ دار پر کہی تھی، اس کی انتہائی ستم ظریفی نہ صرف لائق شنید بلکہ قابل داد ہے، سبط ابن الجوزی مرآۃ الزمان میں لکھتے ہیں کہ جس وقت لوگوں نے حلاج کو دار پر کھینچ رکھا تھا کسی نے اس سے پوچھا کہ تصوف کی تعریف کیا ہے؟ (ما حدُّ التصوف؟)۔ اس نے جواب دیا کہ "یہی جو کچھ تم دیکھ رہے ہو!" (قال: ما ترون!)

مجھے بیحد افسوس ہے کہ اپنے دیگر مشاغل کی وجہ سے میں زمانہ مابعد کے صوفیہ کے اقوال کا استقصا نہ کر سکا. لہٰذا یہ کام میں دیگر احباب پر چھوڑتا ہوں، بہرحال دوسری اور تیسری صدی ہجری کے صوفیہ کے جو اقوال میں نے صفحات بالا میں جمع کر دیے ہیں، وہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ یہ زمانہ تصوف کی تشکیل کا ہے، جس میں اس کے بہت سے خصوصی خط و خال نمایاں ہو چکے تھے، ان اقوال کے تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں تصوف محض اسلامی زہد کی ایک مؤکد صورت تھی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس میں مختلف نوعیت کے دیگر عناصر شامل ہوتے گئے اور نئے نئے مباحث پیدا ہوتے گئے. تصوف کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ ابن العربی اور ابن الفارض کو چھوڑ کر اکثر مسلمان صوفیہ عجمی تھے، جو بیشتر ایران کی خاک سے اٹھے تھے، لہٰذا یہ امر باعث تعجب نہیں کہ تصوف کی موجودہ شکل و صورت بہت حد تک ان ہی کے تصورات اور ذہنی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔

(باقی)

بانی درس نظامی ملّا نظام الدین محمد فرنگی محلی

(از جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی، استاد شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۴)

ٹیلہ شاہ پیر محمد مشہور چشتی بزرگ شاہ پیر محمد صاحب (وفات ۱۰۶۹ھ / ۱۶۶۸ء) کا مزار دریائے گومتی کے کنارے ایک بہت اونچے ٹیلے پر واقع ہے، اور اس ٹیلے پر ایک عالیشان وسیع و عریض مسجد بھی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کرایا تھا، حسّان بحر زخار کا کہنا ہے کہ شاہ پیر محمد صاحب کے مزار کی عمارت اور مسجد اودھ کے صوبہ دار فدائی خاں نے تعمیر کرائی تھی، مزار اور مسجد سے متصل آراضی بھی تھی جس پر (حضرت شاہ پیر محمد صاحبؒ کے خلیفہ اور جانشین ملا (غلام) نقشبند نے (جو ملا نظام الدین کے اساتذہ میں تھے) کچھ عمارتیں اور حویلی بنالی تھیں، ملا غلام نقشبند کی اولاد اب تک (زمانۂ تصنیف یعنی ۱۲۷۲ھ تک) وہاں رہ رہی ہے اور قابض و متمکن ہے۔

> خلیفہ شاہ، ملا نقشبند بر آں ٹیلہ نقش بندہ
> عمارات و حویلی بنا کردند و تا امروز
> اولاد ملا ممدوح دراں مکان بر سبیل
> قائم و متمکن
>
> (اغصان الانساب قلمی)

ملا غلام نقشبندؒ مدرس بھی تھے اور رشد و ہدایت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، انکی خدمت میں علوم ظاہری اور باطنی کے طلب گار آتے رہتے تھے، اور مسجد بنا کردۂ عالمگیر اور عمارات تعمیر کردہ

ملا غلام نقشبند ہیں ان کا رہنا ہوتا تھا، ملا غلام نقشبند کی وفات کے بعد (۱۱۲۶ھ) درس و تدریس کا سب سے بڑا مرکز ملا نظام الدین کا آستانہ تھا، خود ملا نقشبند کے صاحبزادگان بھی ملا نظام الدین سے شرف تلمذ رکھتے تھے، ملا صاحب کے طلبہ کی قیام گاہ یہی ٹیلہ شاہ پیر محمد صاحب تھی،

مرزا محمد حسن قتیل کا کہنا ہے کہ:

"اب سے پہلے (زمانۂ تصنیف یعنی ۱۲۲۰ھ سے پہلے) شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر جو لکھنؤ میں دریا کے کنارے مشہور جگہ ہے، سات سو طلبہ کے رہنے، کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے لیے بادشاہ ہندوستان کی طرف سے ضروری شاہرہ مقرر تھا۔" (ہفت تماشا فارسی سے ترجمہ)

"اب سے پہلے" کا ذکر کرنے کے بعد مرزا قتیل اپنے زمانے کے طلبۂ علوم کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہیں، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔

" اس ملک میں زیادہ تر طلبہ کا طریقہ یہ تھا کہ بعض ...... کسی دوسرے کی روٹیوں کا محتاج نہ تھے، جب یہ لکھنؤ آتے تھے تو ان کے والدین تین چار روپئے مہینہ یا اس سے زیادہ ان کے خرچ کے لیے ماہ بماہ بھیجتے تھے، اور بعض کو مدرسہ سے کھانا ملتا تھا، ...... اس طرح امراء بھی حسب حیثیت اس فرقہ کی خدمت کرتے تھے، چونکہ امراء کی طرف سے ہر عالم کے لیے ایک یادہ گاؤں مقرر تھے، اس لیے سب ہی علماء اپنے شاگردوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ رات کے وقت مطالعہ کے لیے چراغ کا تیل بھی استاد کی طرف سے ملتا تھا۔ اب حال یہ ہے کہ وہ علماء رہے نہیں اور فیاضی نے امیروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، طلبہ حیران پریشان اور تباہ حال ہیں، بعضوں کو تو بیحد پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جب کہیں آدھ سیر آٹا ہاتھ آتا ہے، جو فارسی جانتے ہیں وہ بچوں کو پڑھانے کی نوکری کسی ہندو کے یہاں کر لیتے ہیں، اور مقررہ اوقات میں اپنے استاد کی خدمت میں پڑھنے کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں، جو طلبہ فارسی نہیں جانتے وہ

معاشی طور پر بہت پریشان رہتے ہیں، اگر خوش نصیبی سے کوئی ہندو یا مسلمان جسے حصولِ پڑھنے کا شوق ہے، ان کے ہاتھ آگیا تو واہ واہ ورنہ روتے چھلکتے بغیر تحصیل علم کے اپنے گھر واپس ہوجاتے ہیں...... جب کوئی شخص کسی طالب علم کے لیے آدھا سیر آٹا مقرر کرتا ہے تو وہ طالب علم کہاوت کے طور پہ بیان کرتا ہے کہ میرے لیے جاگیر مقرر ہوگئی ہے۔" (ہفت تماشا فارسی سے ترجمہ)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ کی رہائش کا سب سے بہتر انتظام شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر تھا، جہاں بیک وقت سات سو طلبہ کی گنجایش تھی، ملا نظام الدین کے طلبہ کے سلسلے میں بھی ٹیلے پر قیام کی متعدد روایتیں ملتی ہیں، ملا صاحب کے مشہور شاگرد مولانا حقانی ٹانڈوی اور مولانا عبداللہ امیٹھوی کے بارے میں تو صراحۃً مذکور ہے کہ وہ ٹیلے ہی پر قیام پذیر ہے۔ اور اسی ٹیلے پر فارغ التحصیل طلبہ کا جلسۂ دستار بندی بھی ہوا کرتا تھا، اور ملا نظام الدین اس کے صدر نشین ہوا کرتے تھے، اسی جلسۂ دستار بندی میں فرزند ملا نظام الدین (ملا عبد العلی بحر العلوم) کے ساتھ ایک واقعہ ہوگیا تھا، جس نے عبد العلی کو بحر العلوم بننے پر آمادہ کردیا، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا بیان ہے:۔

"میں نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ چونکہ استاذ الہند (ملا نظام الدین) کے یہی ایک صاحبزادے تھے (یعنی ملا عبد العلی بحر العلوم) اور آخر عمر میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے محبت اور پیار میں زائد بسر ہوئی، والد ماجد کے انتقال کے وقت گو کتب درسیہ کی تحصیل سے فراغت ہوچکی تھی، مگر علم کی جانب رغبت نہ تھی، اس زمانے میں دستور تھا کہ فاتحۃ الفراغ پڑھنے والے شاہ پیر محمد صاحبؒ کے عرس کے موقعہ پر حاضر ہوتے، اور اس عرس میں اکابر علمائے وقت موجود ہوتے، ان کے سامنے دستار بندی ہوتی، استاذ الہند کی زندگی میں استاذ الہند ہی

اس مجلس کے مسند پر بیٹھ صدر و مسند نشین ہوتے. جس سال حضرت (استاذ الہند) کی وفات ہوئی تو اس سال آپ کی وفات کے بعد جب یہ موقعہ دستار بندی کا آیا حضرت بحر العلوم بھی بموافق معمول گئے، مگر صرف تماشا دیکھنے کو، شیرینی کا ایک ہاتھ میں تھی، جس وقت دستار بندی کی رسم ادا ہونے لگی تو کسی نے زور سے ان کو دھکا دیا اور کہا کہ "کہاں بڑھے چلے جاتے ہو" ملا بحر العلوم نے جواب دیا کہ "مجھ کو نہیں جانتے. میں ملا نظام الدین کا لڑکا ہوں" اس شخص نے کہا کہ "سبحان اللہ! اگر استاذ الہند کے تم بیٹے ہوتے تو مسند پر صدر میں ہوتے یا یہاں شیرینی کا ایک ہاتھ میں لیے ہوئے ہوتے"، مولانا بحر العلوم کی حمیت جوش میں آگئی، کا یک وہاں ہی توڑ ڈالی اور شیرینی اڑا دیں اور گھر آکر کتاب بغل میں لی اور پدر بزرگوار کے مزار پہ حاضر ہو کر دیر تک گریاں رہے. اس کے بعد کتاب کھول کر مطالعہ شروع کیا جہاں ذرا بھی اشکال ہوتا، روحانیت پدر بزرگوار سے مدد پاتے، یہانتک کہ فاضل بے نظیر جامع معقول و منقول، عالم علوم ظاہر و باطن ہو گئے۔" (تذکرہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ)

خاندان فرنگی محل کے متقدم تذکرہ نگار ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی ٹیلے والے واقعہ کا ذکر تو نہیں کرتے لیکن مفہوم تقریباً یہی وہ بھی بیان کرتے ہیں:۔

بعد وفاتش فرزند ارجمندش بمطالعہ کتب	ملا نظام الدین کی وفات کے بعد ان کے
معقول و منقول مشغول گشت و ہر مشکلے	فرزند ارجمند کتب معقول و منقول کے
کہ دریں باب بروے روی نمود بروحانیت	مطالعے میں مشغول ہوئے اور اس سلسلے
والد خودش حل می گشت چنانکہ زبانی	میں جو بھی مشکل ان کے سامنے آئی اپنے
ثقات شنیدہ ام کہ مولانا عبد العلی محمد	والد ماجد کی روحانیت سے حل ہو گئی،
می گفت والدم چنانکہ در تربیتم در حیات خود	چنانچہ میں نے معتبر حضرات سے سنا ہے

معروف بود ہم چناں بعد وفات نیز بر تعلیم
وتفہیم وکشف معضلات وحل مشکلات
ہم متوجہ ہست..... در ابتدائے حال
در مطالبات غامضہ ومواضعیکہ دراں
لغزش پائے علماء می گشت بخدمت ملا
کمال الدین مرحوم کہ تلمیذ خاص والدم
بودند و بزرگ وحسن لطریق مناظرہ
برائے طلب صواب و ادراک حق در مباحث
ومقامات کتب متداولہ درسیہ مذاکرہ
می کردم اوشاں افادۂ تحقیقات
غامضہ والدم وہم تحقیقات خود بیان
می فرمودند وگاہے ترش رو وتنگ خاطر
نمی گشت

(انتصار ادبعہ مطبوعہ)

(مصنف نے ملا بحر العلوم کی حیات کے دس سال
پائے تھے لیکن ملاقات نہیں کرسکے، اسلئے کہ
جب یہ پیدا ہوئے تو ملا بحر العلوم فرنگی محل
چھوڑ کر جاچکے تھے، شاہجہانپور، رامپور،
بوہار اور مدراس میں بحر العلوم کے آخری
پچپن ۵۵ سال بسر ہوئے، اور مدراس میں
انھوں نے وفات پائی) کہ مولانا عبد العلی
بحر العلوم فرمایا کرتے تھے کہ والد ماجد جس طرح
اپنی حیات میں میری تربیت فرماتے تھے،
اسی طرح وفات کے بعد بھی مشکل مقامات
اور دشوار علمی مسائل کے حل کے سلسلے میں
میری تعلیم وتفہیم کی طرف متوجہ ہیں.......
شروع شروع دشوار مسائل اور ان مباحث
کے سلسلے میں جہاں علماء کے قدم لڑکھڑا جاتے
اپنے والد ماجد کے خاص شاگرد اور بزرگ
وسن رسیدہ ملا کمال الدین مرحوم کی خدمت
میں صحیح بات معلوم کرنے اور درسی کتابوں کے
مباحث ومقامات کو کما حقہ سمجھنے کے لیے بحث
ومباحثہ کرتا تھا اور وہ میرے والد ماجد کی
نازک تحقیقات اور اپنی تحقیقات مجھ سے بیان
فرماتے اور کبھی ترش روئی اور تنگدلی ان کو نہ ہوتی تھی۔

اگرچہ والد ماجد کے تلمیذ خاص بد مزہ اور تنگ دل نہ ہوتے ہوں گے، لیکن تلمیذ خاص کے شاگردان خاص جو اپنے اپنے وقت کے علمائے اجل ہوئے ہیں، نیز دوسرے سن رسیدہ حضرات جو ایک ۱۸ - ۱۹ سالہ لڑکے کو ایک علمائے روزگار سے مناظرہ کرتے دیکھتے تھے وہ ضرور بد مزہ ہوتے تھے، بلکہ ان کو سخت ناگوار گزرتا تھا، ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی کا بیان ہے کہ

بہ راقم رسیدہ است کہ مردم از ملا کمال الدین	راقم کو بعض ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ لوگوں نے
گفتند کہ این طفل این قدر بحث و تکرار بجدت	ملا کمال الدین سے کہنا شروع کر دیا کہ یہ
می نماید و بے ادبانہ کلام می کند و شما با وی	لڑکا آپ سے اسقدر بحث و تکرار کرتا رہتا ہے
دلجوئی او می فرمائید و گاہے رنجہ خاطر	اور گستاخی سے بات چیت کرتا ہے، آپ اسکا
نمی شوند و بملائمت با او سخن می گویند	بہت لحاظ و دلجوئی کرتے رہتے ہیں، کبھی
این معنی پسند طبع تلامذہ و دیگر عزیزان	غصہ نہیں ہوتے، ہمیشہ ملائم انداز میں گفتگو
و دوستان نیست بزرگان را تادیب	فرماتے رہتے ہیں، یہ آپ کا انداز شاگردوں،
خوردان با تعلیم و تفہیم مناسب است	عزیزوں اور دوستوں کو ناگوار ہے، بزرگوں
نہ کہ اینہا را ہم سر خود گردانند	کو مناسب ہے کہ چھوٹوں کو پڑھانے اور سمجھانے
	میں مودب رہنا سکھائیں، نہ کہ یہ صورت
	کہ چھوٹوں کو اپنے برابر کا سمجھکر بات چیت کریں

ملا کمال الدین تلمیذ خاص ملا نظام الدین سے لوگوں نے شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کے خیالات کی بڑی وضاحت سے ترجمانی کر دی اور مدلل انداز سے ان کو اپنا رویہ بدلنے کا مشورہ بھی دیدیا لیکن ملا کمال الدین نے اس کا جو جواب دیا وہ بھی یادگار ہے:

جواب داد کہ اول این طفل صاحبزادۂ من است کہ	ملا کمال الدین نے جواب دیا پہلی بات تو یہ کہ

می استفادہ علوم بخدمت والدش کردہ ام آنچه من با او می‌کنم در مقابلهٔ احسانات والدش قدرے ندارد	یہ لڑکا میرا استاد زادہ ہے، اسکے والد ماجد کی خدمت میں میں نے یہ سب علوم حاصل کیے ہیں جو کچھ میں اس لڑکے کے ساتھ کر رہا ہوں وہ اسکے والد ماجد کے احسانات کے دیکھتے کوئی حیثیت
دوم آنکه این طفل درین عمر آنچه بمحنت و مشقت خود حاصل کردہ است یقین می دانم که والدش را درین سن حاصل نبود هرچند در آخر وقت علامهٔ زمان بودہ است	دوسری بات یہ کہ اس عمر میں اپنی محنت اور مشقت سے اس لڑکے نے جو حاصل کر لیا ہے، مجھے یقین ہو کر اسکے والد ماجد (ملا نظام الدین) نے جب وہ اس عمر کے تھے حاصل نہ کیا ہوگا، اگرچہ آخر عمر میں وہ اپنے عہد کے بڑے عالم ہو گئے تھے۔
سیوم آنکه درین عرصهٔ قلیل مطالعهٔ کتب قدما و نظر بر تصانیف متاخرین آنچه این کس را میسر گشته بعلما در تمام عمر حاصل نمی شود (غصان اربعہ مطبوعہ)	تیسری بات یہ کہ اس چھوٹی عمر میں اس لڑکے نے متقدمین کی کتابوں اور متاخرین کی تصانیف پر جو عبور حاصل کر لیا ہے وہ دوسرے علما کو تمام عمر میں حاصل نہیں ہوتا ہے۔

اس کے آگے کی عبارت ہو سکتا ہے کہ ملا کمال الدین ہی کا "قول" ہو اور سیاق کلام کے دیکھنے سے یہی اغلب ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہی خیال ہے کہ ملا کمال الدین ہی کا یہ قول ہے مگر ممکن ہے کہ مصنف (ملا ولی اللہ فرنگی محلی) کا اخذ کردہ نتیجہ ہو، بہر حال :

این همه بتوجه روح والدش که جامع علوم ظاهر و باطن بود و ولایتش بحد کمال رسیده او را حاصل گشته درین صورت	اور یہ سب کچھ اس کے والد ماجد کی توجہ روحانی کا ثمرہ ہے، وہ علوم ظاہر و باطن کے جامع تھے، اور انکی ولایت حد کمال پہنچی ہوئی تھی، ان

بحسب ظاہر اگرچہ صغر سن دارد و لاکن	ان حالات میں گو دیکھنے میں وہ ابھی کم سن ہے
در مقام بحث و تکرار در تبۂ علامہ صدرالدین	لیکن بحث و مناظرہ میں اس کا رتبہ علامہ صدرالدین
شیرازی و محقق دوانی دارد	شیرازی اور محقق دوانی کے برابر ہے۔

ملا بحرالعلوم سے متعلق اس واقعہ کی اتنی تفصیل سے اصل غرض اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے کہ استاد کے حق کی حفاظت و نگہ داشت کا لحاظ من جملۂ فرائض تلامذہ ہمیشہ رہا ہے، اور ملاّ کمال الدین کے تلامذہ جو استاد زادے کی جرأت آمیز گفتگو پر اظہار ناگواری کرتے تھے، وہ بھی استاد کے حق کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے، پھر بھی استاد زادے کے طرزِ گفتگو سے ان کو جو ناراضگی محسوس ہوئی تو ظاہر ہے کہ "حق استاد" کے حدود سے وہ متجاوز ہو گئی تھی، ملا کمال الدین کے جواب سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ملا نظام الدین کے ایسے استاد کا حق اور احسان عام اساتذہ کے حقوق و احسانات سے اتنا زیادہ اور خصوصی تھا کہ ان کے بیٹے کی گستاخانہ گفتگو اور ان کے شاگرد کا نازبردار انداز کلام اس کے مقابلے میں کچھ بھی معاوضہ نہیں دے رہا تھا۔

بہرحال ملا بحرالعلوم جس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے، وہ اس شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر پیش آیا تھا، جہاں نہ صرف یہ کہ ملا نظام الدین کے تلامذہ رہتے تھے، بلکہ وہیں دستاربندی کا سالانہ جلسہ بھی ہوا کرتا تھا جس کے مسند نشین ملا نظام الدین ہوا کرتے تھے،

اور ملا بحرالعلوم جب اپنی سابقہ لاپروائیوں پر متنبہ ہو کر آبائی شغل کی طرف متوجہ ہوئے تو یہی نہیں کہ ملا کمال الدین نے ان کے سن و سال کے لحاظ سے ان کی عظیم لیاقت کی داد دی بلکہ دوسرے مؤرخین بھی جنھوں نے ملا بحرالعلوم کو دیکھا نہ تھا، صرف ان کا زمانہ پایا تھا، یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ :

"وہ اپنے والد ماجد کے سوا اس جماعت میں کسی کے شاگرد نہ تھے، انھوں نے شرح سلّم کے سلسلے میں مولوی حمداللہ سندیلوی پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں، وہ ملا کمال الدین کو بھی خاطر میں نہیں

لاتے تھے، کہتے ہیں جو تبحر ان میں تھا، وہ ان کے والد میں بھی نہ تھا۔ (ہفت تماشا از مرزا قتیل فارسی سے ترجمہ)[1]

ملا نظام الدین کے تلامذہ کی فہرست، پچاس سالہ درس و تدریس کے نتیجے میں، خاصی طویل ہونا چاہیے تھی، صرف ان ہی تلامذہ کی جامع فہرست پیش کرنا جنھوں نے اول سے آخر تک ملا صاحب سے استفادہ کیا، آسان نہیں، اور اگر ان "مردم بسیار" کو بھی شامل کرلیا جائے، جنھوں نے برائے اعتبار "فاتحۂ فراغ از مولوی گرفتند" کے تحت سلسلۂ تلمذ ملا صاحب تک پہنچا کر "بین الفضلاء علم امتیاز" بلند کرنے کی تمنا پوری کی تو احاطہ اور بھی دشوار ہوجائے گا۔

شاگردوں میں صرف فرنگی محل میں مقیم بیٹے، بھتیجوں، پوتوں اور آبائی گھر سہالی کے بنی اعمام کا حساب لیا جائے تو تعداد کے لحاظ سے خواہ یہ فہرست مختصر معلوم ہو لیکن استاد کی عظمت اور قوت تدریس کا سکہ قلوب پر بٹھانے کے لیے بہت کافی ہے۔

اولین تلامذہ میں میراں کمال الدین تو تھے ہی، بنگالہ کے رہنے والے بقول صاحب اغصان الانساب اور عظیم آبادی صاحب نزہتہ الخواطر اور بہاری مرزا قتیل کے بیان کے مطابق جنھوں نے ملا صاحب سے فارغ التحصیل ہوکر فتحپور (ضلع بارہ بنکی) میں مسند درس بچھائی تھی، اور ملا صاحب کے ایک نامور اور صاحب درس شاگرد ملا کمال الدین سہالوی کو درسیات کے مختصرات پڑھائے تھے، مگر میراں کمال رشتہ داروں کی فہرست میں شامل نہیں، اگرچہ اولین تلامذہ میں سرفہرست قرار دیے جاسکتے ہیں،

بڑے بھائی ملا محمد اسعد بن ملا قطب الدین شہید کے اکلوتے بیٹے جو اپنے نامور چچا ملا نظام الدین سے آٹھ سال کے قریب چھوٹے تھے، جن کا نام غلام مصطفےٰ تھا، اور منجھلے بھائی ملا محمد سعید کے بڑے بیٹے

---

[1] ہفت تماشا از مرزا قتیل کی عبارتوں کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر استاد شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترجمہ "ہفت تماشا" سے بڑی حد تک لیا گیا ہے، ترجمہ ہفت تماشا حال ہی میں ندوۃ المصنفین کے مطبوعات میں مکتبہ برہان اردو بازار دہلی سے شائع ہوا ہے۔

جو ملا صاحب سے چودہ سال چھوٹے تھے، جن کا نام احمد عبدالحق تھا، یہ دونوں بھتیجے لئے ہوئے کنبہ کے ساتھ سہالی سے آکر فرنگی محل میں آباد ہوئے، جبکہ ایک خورد سال تھے اور ایک شیر خوار، پھر منجھلے بھائی ملا سعید کے دوسرے بیٹے جو فرنگی محل ہی میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی سے دو سال اور اپنے چچا سے سولہ سال چھوٹے تھے، جن کا نام عبدالعزیز بن ملا محمد سعید تھا، یہ تینوں بھتیجے ملا نظام الدین کے اولین تلامذہ میں تھے، حقیقی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا جو "درجنب برادر بزرگوار بتدریس علوم مشغول" ہوگئے تھے، صحیح روایت کے مطابق شاگرد نہ تھے، "ہم استاد" تھے، اور فرائض درس و تدریس میں اپنے برادر بزرگ کے معاون و مددگار عرصے تک رہے، پھر ملا نظام الدین ملک پیرومرشد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ ہی کی حیات میں تارک الدنیا ہوگئے، درس و تدریس ہی نہیں اہل وعیال اور گھربار، بلکہ ملک و وطن سب کچھ چھوڑ دیا، مدینہ منورہ کے قصد سے یکہ و تنہا روانہ ہوگئے، وہیں سپرد خاک ہوئے، مدفن اور وفات کے سلسلے میں اپنے دونوں بڑے بھائی ملا محمد اسعد اور ملا محمد سعید ہی کے ہم قسمت ثابت ہوئے،

خاندان کے اولین شاگردوں میں ملا احمد عبدالحق مصنف اور صاحب درس گذرے ہیں، وہ ملا صاحب سے چودہ سال چھوٹے تھے، لیکن وفات میں صرف چھ سال پیچھے رہے، اور انکے چھوٹے بھائی ملا عبدالعزیز اپنے بڑے بھائی سے دو سال قبل ہی وفات پاگئے، ملا صاحب کے سب سے بڑے بھتیجے ملا غلام مصطفےٰ، فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملانواں (ضلع اناؤ) کے قاضی ہوگئے، منصب قضا پر عزل و نصب کے کئی دور دیکھنے کے بعد اپنے بڑے بیٹے ملا محمد علی کے ساتھ عازم دہلی ہوئے کہ معاملات کا آخری تصفیہ کرائیں، راستے میں دونوں باپ بیٹے غالباً شہید کر دیے گئے۔

دوسری پیڑھی میں مذکورہ تینوں بھتیجوں کے علاوہ جو اولین تلامذہ بھی ملا صاحب کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا کے بیٹے ملا احمد حسین اور ملا عبدالحی اور خود اپنے اکلوتے فرزند ملا عبدالعلی بحرالعلوم بھی ممتاز تلامذہ میں تھے

(ملا بحرالعلوم ملا صاحب کے آخری دور کے شاگرد تھے) پھر تیسری پیڑھی میں بڑے بھتیجے اور شاگرد ملا قاضی غلام مصطفٰے کے تینوں فرزند ملا محمد علی، ملا محمد ولی اور ملا محمد حسن (جو ملا حسن کے نام سے مشہور ہیں) منجھلے برادر زادے اور شاگرد ملا احمد عبد الحق کے بڑے بیٹے ملا محب اللہ، چھوٹے بھتیجے اور شاگرد ملا عبد العزیز کے اکلوتے بیٹے ملا محمد یعقوب ان سب نے ملا نظام الدین ہی سے پڑھا، اور ان میں سے بیشتر نے ملا صاحب ہی سے سند فراغت بھی حاصل کی۔ ملا حسن (بن ملا قاضی غلام مصطفٰے) ملا محمد ولی اور ایک روایت کے مطابق ملا احمد انوار الحق (بن ملا احمد عبد الحق) ابھی تکمیل نہیں کر سکے تھے کہ ملا صاحب کی وفات ہوگئی، درسیات کی تکمیل ملا صاحب کے شاگردوں ملا کمال الدین سہالوی ثم فتحپوری، ملا احمد حسین فرنگی محلی اور ملا بحرالعلوم وغیرہ سے ان حضرات نے کی۔

یہ سب ملا صاحب کے خاندان کے حضرات تھے، جنھوں نے فرنگی محل ہی میں (بعض نے ملا صاحب کی حیات میں اور بعض نے ملا صاحب کی وفات کے بعد) درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور سینکڑوں تشنگان علوم کو سیراب کیا، ان میں سے ملا کمال الدین سہالوی فتحپوری، ملا احمد حسین اور ملا بحرالعلوم کے تلامذہ نامآور ہوئے ہیں۔

ملا کمال الدین سہالوی | ملا کمال الدین سہالوی (ثم فتحپوری) کے تلامذہ میں ناموَر ترین ملا حسن فرنگی محلی، ملا محمد برکت الہ آبادی، ملا حمد اللہ سندیلوی، ملا عبد اللہ سندیلوی اور ملا محمد اعلم سندیلوی تھے، ان ہی ملا اعلم سندیلوی کے شاگرد رشید، ملا عبد الواجد خیرآبادی تھے، جن کے شاگرد رشید مولانا فضل امام خیرآبادی تھے، ان میں مولانا فضل امام (والد ماجد مولانا فضل حق خیرآبادی) سے خیرآبادی سلسلۂ تلمذ جاری ہوا، اور دہلی، رامپور اور اودھ میں یہ سلسلہ کافی پھیلا۔ ملا کمال الدین سہالوی کے درس کا فیض مغربی اضلاع بجنور، مرادآباد

مظفرنگر اور سہارنپور وغیرہ میں ملا کمال کے تلامذہ کے ذریعہ دور دور تک اس وقت پھیلا، جب نواب نجیب الدولہ نے دارانگر متصل امروہہ میں ایک مدرسہ قائم کیا، اور ملا کمال کے ممتاز شاگردوں کو بیش قرار تنخواہوں پر درس و تدریس کے لیے مامور کیا، رضی الدین محمود انصاری اپنی کتاب اغصان الانساب (قلمی) میں لکھتے ہیں:-

درین اثنا نواب نجیب الدولہ بہادر کہ رئیس و امیر ذوی الاقتدار ملک نواح شاہجہان آباد بودند مدرسہ بردے دریائے گنگ در مقام دارانگر کہ متصل امروہہ و مرادآباد است بنا کردہ علمائے ذوی الاحترام مثل مولوی محمد برکت الہ آبادی کہ از شاگردان رشید مولانا کمال الدین محمد قدس سرہ کہ عنقریب ذکر شان مرقوم قلم می گردد و مولوی محمد حسن کہ ہمشیرزادہ و ہم شاگرد مولانا موصوف و مولوی محمد سالم خلف متوسط مولانا ممدوح بودند و دیگر فضلائے ولایتی و ہندی را بشاہرہ معقول کہ صدہا روپیہ باشد مقرر کردہ و علیٰ ہذا القیاس طلبہ

اسی زمانے میں نواب نجیب الدولہ نے جو دہلی کے اطراف کے رئیس اور ذوی اقتدار امیر تھے، اور مرادآباد کے قریب واقع دارانگر میں دریائے گنگا کے کنارے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں بڑی بڑی تنخواہوں پر جو سینکڑوں روپیہ تھیں، ممتاز علما کو جیسے ملا محمد برکت الہ آبادی (ملا کمال الدین سہالوی کے خاص شاگرد) ملا حسن فرنگی محلی (ملا کمال کے شاگرد اور بھانجے) اور ملا محمد سالم (ملا کمال کے منجھلے فرزند اور شاگرد) اور بہت سے ہندستانی اور غیر ملکی علما کو مقرر کیا، اسی طرح بے شمار طلبہ کیلئے بھی جن میں اطراف و جوانب کے شرفا کے بچے اور دوسرے بچے بھی شامل تھے جب استعداد ماہانہ وظیفہ بھی مدرسہ کی طرف سے

بجا ہا انداز از شرفائے جوار وغیرہ جا دادہ آمد	مقرر کیا، اس طرح دارانگر کے
حسب لیاقت آنہا تعین نمودہ دراں مدرسہ	مدرسہ میں پڑھنے پڑھانے کی صورت
صورت تعلیم و تعلم نمودار گردید۔	پیدا ہوگئی۔

ان شاگردان ملا کمال الدین کے ذریعہ ملا کمال کے استاد ملا نظام الدین کے درس کا سلسلہ دارانگر کے مدرسہ کے نکلے ہوئے طلبہ کے واسطے سے تمام مغربی اضلاع میں جن میں ہندوستان کی راجدھانی شاہجہان آباد (دہلی) بھی شامل ہے پھیل گیا، یہ وہ زمانہ ہے جب دلی میں ولی اللّٰہی خاندان کا حلقۂ درس خاصا وسیع ہو چکا تھا، اور اس خاندان کے سربراہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی دیگر علوم کے ساتھ تفسیر و حدیث و فقہ کی ترویج میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے، ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد ملا کمال الدین کے دو شاگرد ملا حسن فرنگی محلی اور ملا قطب الدین محمد (بن ملا کمال الدین سہالوی بھی شاہ صاحب کی حیات میں دلی پہنچ گئے تھے، اور ملا حسن نے وہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا، اور یہ اسی عہد کا واقعہ ہے جس کو مولانا عنایت اللّٰہ فرنگی محلی نے "تذکرۂ علمائے فرنگی محل" میں حسب ذیل الفاظ میں درج کیا ہے :-

"ملا حسن (فرنگی محلی) نے کچھ مدت دلی میں قیام فرمایا تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رہ کے شاگردوں کو خبر ہوئی، وہ بھی ملا حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی مبحث علمی پر بحث کرنے لگے، ملا حسن نے جوابات معقولہ سے ان کی تشفی کر دی، وہ حضرت شاہ صاحب کے پاس واپس گئے، اور ملا حسن کی تعریف کرنے لگے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ "ان معقولیوں کو حدیث و قرآن سے بالکل بے خبری ہوتی ہے۔ یہ بیچارے عمر بھر قال الشیخ و قال الرازی میں پڑے رہتے ہیں"۔ ملا حسن اس عرصہ میں رامپور واپس ہو چکے تھے، کسی نے بحر العلوم تک یہ واقعہ پہنچا دیا، بحر العلوم نے جواب میں "ارکان اربعہ" لکھ کر شاہ صاحب کی خدمت میں

بھیجی، حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں نہایت توصیف و مدح مولانا کی لکھی اور خط کے عنوان میں مولانا کو "بحر العلوم" کے لقب سے ملقب فرمایا، خدا کی قدرت کہ حضرت شاہ صاحب کے قلم سے نکلا ہوا خطاب آج عالم میں شہرت پا گیا اور اب اہلِ علم کے حلقوں میں نام اور شاہی خطاب سے زائد حضرت شاہ صاحب کا عطیۂ خطاب[1] ہی مشہور ہے۔" (ص۱۸۱)

ان ہی ملا کمال الدین سہالوی کے ذریعہ ان کے استاد ملا نظام الدین کا فیض ہندستان کے باہر بھی پہنچا، کس طرح پہنچا؟ اس سلسلے کا واقعہ اغصان الانساب (قلمی) کے مصنف نے بایں طور بیان کیا ہے:-

مولوی عبدالرحمٰن یمنی کہ در یمن صاحبِ درس	یمن (ملک عرب) میں ایک عالم اور مدرس
بودند سالے برائے زیارت حرمین شریفین	مولوی عبدالرحمٰن تھے، ایک سال وہ
زادہما اللہ شرفاً در بیت اللہ آمدند	حج و زیارت کے سلسلے میں مکہ معظمہ آئے،
و ہم در اں شخصے از شاگردانِ مولانا	اسی سال ملا کمال الدین سہالوی کے
ممدوح مشرف بزیارت کعبہ شریفہ آمدہ	ایک شاگرد بھی شرف حج و زیارت سے
بود، حسب اتفاق از مولوی عبدالرحمٰن	مشرف ہوئے تھے، اتفاق سے مولوی
یمنی در آں جا ملاقات دست داد	عبدالرحمٰن یمنی اور شاگرد ملا کمال کی ملاقات
چیزے بحث علمی بمیاں آمد چوں مولوی	مکہ معظمہ میں ہو گئی، آپس میں کوئی علمی بحث
عبدالرحمٰن بمقابلۂ آں کس خود را ایچ‌دان	چھڑ گئی، جب مولانا عبدالرحمٰن یمنی نے
دیدند مستفسر شدند کہ ایں علم از کدام	شاگرد ملا کمال کے مقابلے میں علمی اعتبار
فاضل آموختہ اید، ایں شخص مدح و تعریف	سے اپنے کو ہیچ پایا تو دریافت کرنے لگے کہ
استاد خود بیان کرد مولوی عبدالرحمٰن یمنی	کس فاضل و عالم سے آپ نے پڑھا ہے، شاگرد نے

[1] پھر جب بحر العلوم کسی سلسلے میں دلی تشریف لے گئے تو ان کی اتنی شہرت اور وقعت بڑھ چکی تھی کہ (باقی حاشیہ ص ۲۰۰ پر)

از بیت اللہ بہ ارادۂ اخذ علم و تعلیم عازم
ہندوستان شدند و چوں بودہ بخدمت
مولانا موصوف رسیدہ و پنج شش سال
اقامت نمودہ مجدداً کتب درسیہ خواندہ
و بخوبی علوم حاصل کردہ راہی وطن خود
شدند و در انجا رسیدہ بر وسادۂ تدریس
تمکین کردند و نام استاد خود در ملک عرب
بلند آوازہ گردانیدند

اپنے استاد ملا کمال الدین سہالوی کا نام
لیا اور انکی مدح و توصیف کی۔ مولوی
عبدالرحمن یمنی کہ معظمہ سے وطن جانے کے
بجائے علم حاصل کرنے سیدھے ہندوستان
کی طرف چل کھڑے ہوئے، ہندوستان
پہنچکر ڈھونڈھتے ہوئے ملا کمال الدین
سہالوی تک پہنچ گئے، اور پانچ چھ سال
رہکر از سر نو کتب درسیہ ملا کمال الدین سے
پڑھیں اور اچھی طرح تحصیل علوم کرکے اپنے
وطن مین واپس گئے، وہاں پہنچکر مسند تدریس
بچھائی اور اپنے استاد ملا کمال الدین سہالوی
کے نام کو ملک عرب میں خوب خوب شہرت دی۔

ملا کمال الدین کے بڑے فرزند ملا قطب الدین محمد نے اپنے والد ہی سے علوم حاصل کیے تھے، نکتہ سنجی اور وقت آفرینی میں وہ اس درجہ تک پہنچ گئے تھے کہ

ملا کمال الدین طاب ثراہ می فرمودند
کہ اگر قطب الدین درس می کردند از من
کمتر نمی بودند و حسرت می کردند کہ افسوس
طبیعت ایشاں راغب سوئے درس
نیست (انصاف الانساب قلمی)

ملا کمال الدین فرمایا کرتے تھے کہ اگر قطب الدین
درس دینا شروع کرتے تو مجھ سے کم نہ رہتے۔
ملا صاحب افسوس کرتے تھے کہ بیٹے کی طبیعت
پڑھانے کی طرف کسی طرح راغب نہیں ہوتی۔

ملا قطب کے ایک ہم درس ملا محمد مستعان کاکوروی جو ملا کمال الدین کے شاگرد تھے کہا کرتے تھے:

روح مولانا مرحوم کلیتہً درجسم مولوی	ملا کمال الدین سہالوی کی روح مولوی
قطب الدین حلول کردہ است اگر درس	قطب الدین کے جسم میں پوری طرح سما گئی ہو
می کردند نام پدر عالی قدر خود را رونق	اگر وہ درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے
می دادند[1] (اغصان الانساب)	تو اپنے نامور باپ (ملا کمال الدین) کے نام کو

[1] ملا کمال الدین کے اس لائق و ہونہار فرزند نے درس و تدریس کی طرف کیوں توجہ نہیں کی، اس کی وجہ اغصان الانساب کے مصنف نے وہی بیان کی ہے جو اکثر علمی ذہنوں کی خانہ خرابی کی ہوا کرتی ہے یعنی سیاست میں پڑکر خدمت علم سے غافل ہوگئے، مصنف اغصان الانساب کا کہنا ہے کہ:

ہرگاہیکہ مولوی قطب الدین محمد از تحصیل علم	مولوی قطب الدین محمد جب تحصیل علم کرچکے
فارغ شدند عم ایشاں قاضی جان محمد مرحوم	تو انکے حقیقی چچا قاضی جان محمد کسی ضرورت
بہ بعلّت ہمراہ خود بہ شاہجہان آباد بردند	یا مقصد سے انھیں اپنے ہمراہ دلی لے گئے
درآں جا از امراء و اہلکاران شاہی ملاقات	(قاضی صاحب خود بڑے حکام رس اور دربار شاہی
کنانیدہ بکار و بار دنیا گزاشتند	تک پہنچنے والے آدمی تھے) انھوں نے
	دلی میں امیروں اور شاہی افسروں سے
	بھتیجے کی راہ و رسم کرادی اور دنیاوی دھندوں

اس طرح ملا کمال الدین کا ایک ہونہار جانشین علمی دنیا سے درباری ماحول میں پہنچکر خدمت علم سے جدا ہوگیا، دلی کا دربار درہم برہم ہوا تو سید شرف الدین محمد عرف مولوی مدن شاہ (جو حضرت بڑے پیر صاحب کی اولاد میں تھے، اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے بڑی جاگیر پائے ہوئے تھے، نواح لکھنؤ میں قریہ خالص پور میں مسند فقر پر بیٹھکر رئیسانہ فیاضیوں کے ساتھ زندگی گزارتے تھے) نے ان کو اپنے پاس بلا لیا، مولوی مدن کا کارخانہ درہم برہم ہوا تو

ملا کمال الدین سہالوی خود اس درجے کے فاضل تھے کہ تنہا وہی اپنے استاد ملا نظام الدین کے نام کو روشن کرنے کے لیے بہت تھے، ان کی ٹکر کا عالم، مدرس اور مصنف اس زمانہ میں دور دور کوئی دوسرا نہ تھا۔ ان کی تصانیف عروۃ الوثقیٰ، شرح کبریت احمر اور حاشیہ شرح عقائد جلالی ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۰) ملا قطب الدین خانہ نشین ہو گئے، ہر چند شجاع الدولہ کے نائب راجہ بینی بہادر نے بلایا مگر قبول نہ کیا، اسی خانہ نشینی کے عالم میں ۳ رشعبان ۱۱۹۰ھ میں انتقال کیا، ملا قطب الدین، اغصان الانساب کے مصنف رضی الدین محمود انصاری کے حقیقی نانا تھے، ان کے بارے میں یہ ساری تفصیل نواسے ہی نے بیان کی ہے۔

قاضی جان محمد کے بارے میں جو ملا کمال الدین کے حقیقی بھائی تھے، اغصان الانساب کے مصنف نے ایک تاریخی واقعہ لکھا ہے جس کو یہاں نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کسی اور تاریخ میں یہ نظر سے نہیں گزرا، ایک قلمی تصنیف میں درج رہ کر ہو سکتا ہے کہ کبھی معدوم ہو جائے، قاضی جان محمد کے والد قاضی دولت (جن کا ذکر اس سے قبل آیا ہے کہ وہ ملا قطب الدین شہید سہالوی کے شاگرد و متبنیٰ تھے، اور ملا شہید کی شہادت کے بعد واحد رشتہ دار تھے، جو خاندان ملا قطب شہید کے ساتھ سہالی سے فتحپور چلے گئے تھے)۔ فتحپور کے قاضی ہو گئے تھے، ان کے بعد قاضی جان محمد فتحپور کے قاضی ہوئے، پھر دلی گئے، جہاں سے کئی اور قصبات جیسے فرخ آباد کے اطراف کے قصبات بھوں گاؤں اور چھبرامئو وغیرہ علاوہ بہرائچ کی سند قضاۃ حاصل کر کے حکم شریعت کو رواج دیتے رہے، دربار شاہی تک پہنچ ہو چکی تھی، "عطائے پالکی" سے سرفراز تھے، محمد شاہ کا زمانہ تھا، اس کے دربار میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے، "مدام حاضر باش دربار شاہی بود" جری اور بہادر ایسے تھے کہ "دراں عصر مثل شان کمتر کسے بودہ باشد"۔ یہ دلی ہی میں تھے جب نادر شاہ کا حملہ ہوا اور قتل عام سے دلی تاراج ہوئی، نادر شاہ ابھی دلی میں مقیم تھا کہ عید الاضحیٰ (بقر عید) آ گئی، اور یہ خطرناک اور خوفناک سوال بادشاہ اور امرائے سلطنت کے سامنے آ کھڑا ہوا کہ عید کا خطبہ جس میں خلفائے راشدینؓ کے اسمائے گرامی لیے جاتے ہیں، کیسے پڑھا جائے گا اور کون پڑھے گا؟ نادر شاہ شیعہ تھا، اس کی سفاکی، قہرناکی اور خونریزی کا ہولناک تجربہ پوری دلی کو ابھی ابھی ہوا تھا، اس سوال کے سامنے آتے ہی "اہلکاران سلطنت در تہلکہ افتادند و ہوش و حواس در باختند"

(باقی حاشیہ ص ۲۰۲ پر)

حاشیہ طبع ہو چکا ہے۔ اور عروۃ الوثقیٰ اور شرح کبریت احمر مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی) کے مولانا عبد الحی فرنگی محلی کلکشن میں مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہے، مرزا قتیل عروۃ الوثقیٰ سے اس قدر مرعوب نظر آتے ہیں کہ ان کا خیال ہے :-

کتابے موسوم بہ عروۃ الوثقیٰ نوشتہ کہ
نحاریر علما در کشف غوامض وحل دقائق
آں حیراں اند ("ہفت تماشا")

ملا کمال نے ایک کتاب عروۃ الوثقیٰ لکھی ہے
جس کی باریکیوں کے سمجھنے اور جس کے دقیق
مطالب کے حل کرنے سے بڑے بڑے علماء عاجز ہیں

پھر لکھتے ہیں :-

میر کمال الدین نامی ساکن بہار نیز شاگرد
ملا نظام الدین بود چنانچہ میر مزبور و ملا
کمال الدین ہر دو را "کمالین" می گفتند
شاگردانش بیشتر در اطراف بنگالہ اند

("ہفت تماشا")

میر کمال الدین وہی جنکا ذکر میراں کمال الدین
بنگالی کے نام سے اوپر گزر چکا ہے اور جن سے ملا
کمال الدین سہالوی نے فتحپور میں مختصرات درس
پڑھے تھے) بہار کے رہنے والے بھی ملا نظام الدین
کے شاگرد تھے، چنانچہ ملا نظام الدین، میر کمال الدین
اور ملا کمال الدین کو "کمالین" کہا کرتے تھے، میر کمال الدین
کے اکثر شاگرد بنگال کے اطراف میں ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۱) "واحدے را یارائے خواندن خطبہ نمی شد"۔ خطیب قدیم و دیگر علما کہ در پایۂ تخت حاضر بودند کنارہ کشی کردند یہاں تک کہ ایک روز باقی رہ گیا، اب بادشاہ کو تشویش لاحق ہوئی کہ کس سے خطبہ پڑھنے کو کہے، قاضی جان محمد جو حاضر دربار شاہی رہا کرتے تھے، عرض پرداز ہوئے کہ "بندگان عالی را دریں باب فکرے نباید بندہ حاضر است در خواندن خطبہ دریغ و تساہل نخواہد کرد، گمان این است کہ نادر شاہ از شنیدن نامہائے خلفاء را بقتل خواہد رسانید جانم فدائے حضور باد"۔ چنانچہ عید الاضحیٰ کے روز قاضی جان محمد سہالوی ثم فتحپوری دلی کی عیدگاہ گئے اور دونوں بادشاہوں (نادر شاہ اور محمد شاہ) کی موجودگی میں "خطبہ بآواز بلند واسمائے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم با مناقب و مفاخر روبروے بادشاہوں خواندند"۔ لیکن نہ قتل ہوئے نہ گرفتار ہوئے بلکہ "قدمبوس جا از پیشگاہ بادشاہ غور در سہم نادر شاہ لعطائے دو تائے خلعت سرفرازی اندوختند"۔

اس طرح میران کمال الدین ساکن بنگالہ یا ساکن بہار نے اپنے استاد کا فیض بنگال میں عام کیا جہاں ان کے شاگردوں کی کثرت ہوئی اور ملا کمال الدین سہالوی اودھ میں سرگرمِ فیض رسانی رہے۔ میران کمال کے بارے میں ملا عبدالاعلیٰ (حفید ملا نظام الدین فرنگی محلی) نے لکھا ہے:-

محبت با استاد بسیاری داشتند چنانچہ شنیدن خبر کاذب در باب وفات استاد میدکمال از غم فوت کردند و سید ظریف بگریان اشک کور شدند۔

(رسالہ قطبیہ قلمی)

استاد ملا نظام الدین سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، استاد کے وفات کی جھوٹی خبر سنکر اس قدر غمگین ہوئے کہ اس رنج و غم میں جان دیدی اور اور سید ظریف (یہ ملا صاحب کے دوسرے شاگرد اور میران کمال کے ہم وطن) روتے روتے بینائی کھو بیٹھے۔

مزید لکھا ہے:-

ہر دو صاحب تصانیف بودند و شاگردان معتبر می داشتند اعلیٰ شاگرد انش مولوی اسد اللہ جہانگیر نگری مدرس و مصنف بود۔ (رسالہ قطبیہ قلمی)

دونوں شاگرد (سید ظریف و میران کمال الدین) صاحب تصانیف بھی تھے، اور لائق و معتبر شاگرد بھی رکھتے تھے، جن میں سے ایک مولوی اسد اللہ جہانگیر نگری مصنف اور مدرس گزرے ہیں۔

ملا کمال الدین سہالوی کے براہ راست شاگردوں، بہ یک واسطہ شاگردوں اور دو یا تین واسطوں سے شاگردوں کے کچھ نام اغصان الانساب کے مصنف نے گنائے ہیں، مولوی حمد اللہ سندیلوی، قاضی محمد نور الحق فتح پوری (ملا کمال کے ابن عم) مولوی محمد اعلم سندیلوی، مولوی برکت الہ آبادی، ملا حسن فرنگی محلی اور ان کے بھائی ملا محمد ولی فرنگی محلی (یہ دونوں فرنگی محلی حضرات ملا کمال کے سگے بھانجے بھی تھے) مولوی حمد اللہ خیر آبادی، مولوی محمد حسن چریا کوٹی

(یہ سب براہ راست شاگرد)، ان حضرات کے وہ شاگرد جو صاحب درس ہوئے، مولوی باب اللہ جونپوری، مولوی غلام یحییٰ بہاری، مولوی عبدالواجد خیرآبادی وغیرہ ہیں، اور تین واسطوں سے شاگردوں میں مولوی فضل امام خیرآبادی، مولوی غلام امام شہید، مولوی عبدالواسع سیدن پوری، مولوی ضامن ساکن کڑہ مانک پور وغیرہ، یہ سب مولوی عبدالواجد خیرآبادی کے شاگرد ہیں، اور مولوی عبدالواجد، مولوی محمد اعلم سندیلوی کے شاگرد اور بھانجے تھے، اور مولوی اعلم ملا کمال کے شاگرد رشید تھے، اس کے آگے صاحب اغصان الانساب لکھتے ہیں:-

و دیگراں را تا کجا برشمارم و آنہا کہ تدریس	کہاں تک نام گناؤں، وہ شاگرد جو صاحب علم
نہ کردند و صاحب علم بودند صدہا بودند	تھے مگر تدریس کا مشغلہ اختیار نہیں کیا،
پس از مولانا موصوف تا ایں زماں	سینکڑوں ہیں، ملا کمال الدین کے بعد سے
ہر کس کہ مدرس ست خواہ فاضل از	اس وقت تک جو بھی صاحب درس ہو یا عالم
شاگردی جناب موصوف بیک واسطہ	فاضل ہے، ناممکن ہو کہ ایک یا دو یا تین یا
خواہ بدو واسطہ خواہ بسہ واسطہ	چار واسطوں سے ملا کمال الدین کے
و چہار واسطہ از تلمذ آں عالی جناب	دائرۂ تلمذ میں نہ آتا ہو، پورے ملک ہندوستان
ممکن نیست کہ بیروں آید و در تمام	میں جو بھی صاحب علم تھا یا ہے یا ہوگا سبھوں کو
ملک ہندوستان ہر کسیکہ صاحب علم	بالواسطہ ملا کمال الدین سہالوی سے تلمذ
بود و ہست و خواہد بود ہمہ را نسبت	اور آئندہ بھی ہوگا۔
تلمذ باو اسطہا بجناب ہست و خواہد شد	(اغصان الانساب کا زمانۂ تصنیف ۱۲۹۰ھ ہے

(اس وقت ملا کمال الدین کے وصال کو ایک سو اسی برس گزر چکے ہیں ۱۸۰)

مرزا قتیل نے بھی جن کی کتاب ہفت تماشا کا سنہ تصنیف ۱۲۲۶ھ ہے، اس وقت ملا نظام الدین کے وصال کو چھیاسٹھ برس، ملا کمال الدین کے وصال کو اکیاون برس اور بحر العلوم کی وفات کو فقرہ وصال

گزرے تھے۔ ملا نظام الدین کے دو شاگردوں ملا کمال الدین سہالوی اور ملا بحر العلوم (فرزند ملا نظام الدین) کے کئی شاگردوں کے نام گنانے کے بعد تقریباً یہی لکھا ہے:۔

ایں بزرگان کہ بشمار در آمدند شیخ سلسلۂ
علماء بودہ اند جا بجا در ہند علم معقول
از ہمینہا منتشر شدہ ہیچ فاضلے وطالبعلمے
نیست کہ از حلقۂ شاگردی اینہا بیروں باشد
بعضے بشش واسطہ بعضے بہفت وبعضے
بکم ازیں در تلمذ علمی باینہا میرسند
لیکن بعضے پنجابیاں و دہلویاں
(ہفت تماشا)

یہ سب علما جن کا ذکر اوپر ہوا ہے (یعنی ملا
نظام الدین فرنگی محلی اور ان کے شاگرد ملا
کمال الدین سہالوی اور ان کے بلا واسطہ
تلامذہ نیز ملا بحر العلوم اور ان کے تلامذہ)
علما کے سلسلے کے شیخ و سرگروہ ہیں، ایک بھی
عالم یا طالب علم ایسا نہیں ہو جو ان کے شاگردوں
کے حلقے سے باہر ہو، کوئی چھ واسطوں سے
کوئی سات واسطوں سے اور کوئی اس سے کم
ہی واسطوں سے علمی شاگردی کے سلسلے میں ان
حضرات تک پہنچتا ہے، ہاں بعض پنجابی اور
دہلوی علما اس سلسلے سے باہر ہیں۔

دہلی اور پنجاب کے علما کے بارے میں بھی صحیح نہیں ہے کہ سب ہی خارج از سلسلہ ہوں، اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ نجیب الدولہ کے مدرسہ واقع دارانگر میں ملا کمال الدین سہالوی کے اجلہ تلامذہ ملا برکت الٰہ آبادی، ملا حسن فرنگی محلی اور ملا محمد سالم فتحپوری (فرزند دوم ملا کمال) مسند درس کو رونق بخش کر اطراف و جوانب کے طلبائے کثیر کو فیض پہنچا چکے ہیں، اور کچھ وقفے کے بعد مولوی فضل امام خیرآبادی نے جو تین واسطوں سے ملا کمال کے شاگرد تھے، دلی میں سلسلۂ درس شروع کیا، ان کے نامور تلامذہ میں سے ایک مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور دہلی بھی ہیں۔

اس کے علاوہ ملا بحر العلوم (فرزند ملا نظام الدین) اور ملا حسن فرنگی محلی نے خاصے طویل عرصے تک رامپور میں درس وتدریس کی اور بڑی تعداد میں ان کے حلقۂ درس سے فضلاء وعلماء نکلے، بہت وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں پنجابی اور دہلوی کتنے تھے لیکن اس سلسلۂ تلمذ سے پنجابیوں اور دہلویوں کو یکسر خارج سمجھنا خلاف مقتضائے احوال بھی ہوگا، اور بعض تاریخی صراحتوں کے بھی خلاف ہوگا، ملا نظام الدین کے تلامذہ میں ایک صاحب ایسے تھے جن کے نام کا جزء دہلوی ہے، یعنی ملا وجیہ الدین دہلوی، جن کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر کا کہنا ہے کہ الشیخ العالم الکبیر وجیہ الدین الدہلوی احد العلماء المبرزین فی المنطق والحکمۃ قرأ العلم علی مولانا نظام الدین بن قطب الدین الکھنوی اس کے آگے صاحب نزہۃ الخواطر جو لکھتے ہیں وہ مرزا قتیل کے قیاس کو کمزور کرنے کے لیے کافی ہے، یعنی

ولی التدریس ببلدۃ دھلی	دہلی شہر میں درس وتدریس پر مامور ہوئے
اخذ عنہ خلق کثیر	اور ان سے کثرت سے لوگوں نے علم حاصل کیا

تو اس "خلق کثیر" میں دہلی کے باشندے بالکل نہ ہوں، یہ بالکل خلاف قیاس ہے، غرض دہلی کے لوگ بھی ملا وجیہ الدین دہلوی کی معرفت ملا نظام الدین کے سلسلۂ تلمذ میں بڑی تعداد میں "خلق کثیر" ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ملا وجیہ کے اور ان کے تلامذہ کے ذکر میں تساہل برتا یا سیاسی طور پر وہ ایسے نامور نہیں ہوئے کہ ان کی ایک ایک بات کی کھوج اس زمانے کا مورخ لگاتا، جب دلی کی تاریخ درباری سازشوں اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں کی تاریخ بن چکی تھی، رسالہ قطبیہ کے مصنف ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی نے ملا وجیہ کے سلسلہ میں ایک اچھی نشاندہی کی ہے، وہ کہتے ہیں :-

راغب سوئے شعر بودند لہذا	نا وجیہ شعر و شاعری کی طرف راغب
در علماء شمار کردہ شدند	تھے، اس لیے علماء کے زمرے میں انکا
	شمار نہیں کیا جاتا تھا۔

(باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۸) مشہور نقشبندی بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کو ان کی تشریف آوری معلوم ہوئی، اور جامع مسجد میں بحر العلوم کو تلاش کرکے ان سے ملاقات کی اور "مقام محمود" کی تشریح ان سے دریافت کی، بحر العلوم کا جواب سن کر مرزا صاحب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے،

مولانا وکیل احمد سکندر پوری نے اپنی تصنیف "ہدیہ مجیدیہ" کے حاشیے پر درج کیا ہے :-

چوں مولانا بحر العلوم لکھنوی بدہلی	جب مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، لکھنوی
تشریف فرا شدند بجامع مسجد شاہجہانی	دہلی میں تشریف فرما ہوئے، تو جامع مسجد
حضرت ایشان را دریافتہ از "مقام	شاہجہانی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں
محمود" پرسیدند در جواب حضرت	نے ان کو تلاش کرکے ملاقات کی اور ان سے
مرزا بہا لبتا نشہا کشادند	"مقام محمود" کے بارے میں پوچھا، جواب
(ہدیہ مجیدیہ مطبوعہ، ص ۳۳۳ حاشیہ)	سنکر مرزا صاحب نے تعریف و توصیف
	میں دیر تک گفتگو فرمائی۔

حضرت عمرو بن احمر الباہلی کا دیوان

(المتوفی نحو ۶۵ھ)

از جناب مولوی احمد خاں صاحب ایم اے، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی

حضرت عمرو بن احمر الباہلی رضی اللہ عنہ اہل وبر کے مخضرمی شاعر تھے[1] ان کی زندگی کا کچھ حصہ جاہلیت میں اور زیادہ حصہ اسلام میں گزرا ان کے نسب نامے میں کچھ اختلاف ہے،[2] یہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں رومیوں کے خلاف لڑے ہیں، ان ہی جنگوں میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی، کبار صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی،

اسلام لانے کے بعد بہت سے اشعار کہے ہیں، خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت خالد ابن ولیدؓ کی بھی مدح کی ہے، کسی سبب سے یزید بن معاویہ سے ناراض ہو گئے تھے، اس لیے اسکی ہجو لکھی،[3] یزید نے پکڑ کر قتل کرنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ نہیں لگے، اور کہیں روپوش ہو گئے، اگرچہ ان کی پیدائش اور وفات کے سنین کا صحیح علم نہیں، مگر یہ معلوم ہے کہ یزید بن معاویہ (۶۰ھ۔۶۴ھ) کے عہد کے بعد وفات پائی۔ اور نوے[90] سال سے کچھ زائد عمر پائی۔ عبد الملک بن مروان (ابتدائے حکومت ۶۵ھ) کے عہد کے ابتدائی حصہ میں بقید حیات تھے، غالباً اسی بنا پر الزرکلی کا خیال ہے کہ ان کا انتقال ۶۵ھ کے لگ بھگ ہوا،[4] مقام پیدائش اور مقام وفات بھی نامعلوم ہیں۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ جزیرۃ العرب ہی میں

مقیم رہے ہیں[5]

افسوس ہے کہ اس عظیم شاعر اور بطل جلیل کی زندگی کے حالات بہت کمیاب ہیں، ممکن ہے ان کے کلام کی مزید چھان بین سے ان کی حیات پر کچھ روشنی پڑ سکے وہ اپنے قبیلہ کے مشہور لوگوں اور جنگوں کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں،

فصاحت و بلاغت اور نئے الفاظ کی ایجاد

ابن احمر بڑے فصیح شاعر تھے، اجنبی اور شاذ (غریب) الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے، ان کی فصاحت، ناقدانِ شعرا اور لغویوں کے ہاں مسلّم ہے[6]، ابن جنی (م ۳۹۲ھ) نے اپنی کتاب الخصائص کے باب: فی الشئ یسمع من العربی الفصیح لا یسمع من غیرہ" میں ابن احمر الباہلی کے ارتجال اور فصاحت پر بڑی طویل بحث کی ہے، اس کے آخر میں فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہیں: فان الاعرابی اذا قویت فصاحتہ وسمت طبیعتہ تصرّف وارتجل ما لم یسبقہ احد قبلہ بہ[7]" اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن احمر میں فصاحت کا ملکہ اس قدر راسخ تھا کہ اس نے بہت سے الفاظ ارتجالاً اپنے اشعار میں استعمال کیے، جو بعد میں عربی زبان کے جزو لا ینفک ہو گئے، اس طرح کا ارتجال العجاج (م ۹۰ھ) اور اس کے بیٹے رؤبہ (م ۱۴۵ھ) میں بھی تھا، ان کے اراجیز عربی زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ابن احمر کے بارے میں ناقدین شعر کی آراء

اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ابن احمرؓ جاہلی عہد کے چند گنے ہوئے شعراء میں شمار ہوتے تھے، ابن حجر العسقلانی کہتے ہیں: کان من شعراء الجاھلیۃ المعدودین[8]۔ ان کے کلام کی بلندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے اور امرؤ القیس کے اشعار میں ایک طبقے کے نزدیک خلط ملط ہو گیا ہے[9]، یعنی دونوں کے شعری محاسن میں اس قدر مماثلت تھی کہ لوگوں کو ابن احمر اور امرؤ القیس کے اشعار میں تفریق کرنا دشوار ہو گیا،

المفضل الضبی (م ۱۶۸ھ) نے ابن احمر کا شمار بھی فحول شعراء میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں
ھؤلاء فحول شعراء اھل نجد الذین ذموا ومدحوا وذھبوا فی الشعر کل مذھب[10]
اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ابن احمر نے مختلف اصناف میں جولانی طبع دکھائی ہے۔ ابوعبیدہ (م ۲۰۹ھ) نے ابن احمر الباہلی کو طبقہ ثالثہ کے شعراء میں شمار کیا ہے[11]، الاصمعی (م ۲۱۶ھ) کی رائے ہے: لیس بفحل ولکنہ دون ھؤلاء (الفحول) وفوق طبقتہ[12]۔ ابن سلام الجمحی (م ۲۳۲ھ) نے ان کو اسلامیین کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے[13]، الآمدی کی المؤتلف والمختلف کے حوالے سے ابن احمر کے بارہ میں ابن حبیب (م ۲۴۵ھ) کی یہ رائے ملتی ہے: کان یتقدم شعراء اھل زمانہ۔ انھوں نے مشہور شعراء کے ساتھ ابن احمر کے مکمل حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر بحث میں اس کا نمونہ بھی دیا ہے[14]۔

ابن احمر نے جو خود بھی اعلیٰ درجے کے ناقد شعر تھے، شعر کے بارے میں ...... ایک رائے دی ہے، جو ایک لحاظ سے خود ان پر صادق آتی ہے، کیونکہ جب کوئی ناقد کسی شاعر کے بارے میں کوئی رائے دیتا ہے تو اس سے خود اس کے بارہ میں بھی رائے قائم ہوتی ہے، ابن احمر کی رائے میں "زہیر اشعر الناس" تھے[15]، زہیر کے بارے میں یہ رائے ابن احمر کے ذوق شعری کی دلیل ہے۔

ابن احمر الباہلی کا دیوان | دوسری صدی ہجری میں جاہلی، مخضرمی اور اسلامی شعراء کے دواوین کو جن میں سے کچھ ابھی سینہ بسینہ چلے آرہے تھے یا متفرق اجزاء میں موجود تھے، باقاعدہ مدون کیا جا رہا تھا[16]، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں ابن احمر کے کلام کا مجموعہ دیوان کی شکل میں موجود تھا، احمد بن علی بن احمد بن العباس النجاشی (م ۴۵۰ھ) نے اپنی کتاب الرجال میں یعقوب بن اسحاق ابن السکیت (م ۲۴۴ھ) کے تذکرے کے ضمن

یں اُن شعرا کے دواوین کا ذکر کیا ہے، جو ابن السکیت نے جمع کیے تھے، اس فہرست میں عمرو بن احمر الباہلی کا دیوان بھی شامل ہے۔[۵۴] اس لیے یہ بلا خوف وخطر کہا جا سکتا ہے کہ ابن احمر کا دیوان موجود تھا، اور بڑی مدت تک سہل الحصول بھی تھا، کیونکہ متقدمین کے ہاں شواہد کے سلسلہ میں ابن احمر کے اشعار بکثرت ملتے ہیں، ان کے دیوان کا ذکر متعدد لغویوں نے کیا ہے، ان میں سے بعض ابن احمر کے دیوان کے مشکل کلمات اور نادر ترکیبوں کی مشق کے لیے سبقاً سبقاً پڑھا کرتے تھے، اور جو دیوان سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہو، اسکی نقول بھی بکثرت ہو گئی۔

ابن احمر کے دیوان کی کثرت مزاولت سے اس کے کلمات اور الفاظ میں اختلاف بھی پیدا ہو گیا تھا، اس کی تصدیق ذیل کے واقعہ سے ہوتی ہے:۔

(قال ابوسعید العسکری) اخبرنی ابو ذکوان، حدثنا موسیٰ بن سعید بن مسلم قال: کان ابن الاعرابی یودبنا فدخل الاصمعی ونحن نقرأ شعر ابن احمر:

اعدوا واعد الحی الزبالا لوجه لا نرید به سبالا

الی ان بلغنا الی قوله:

اری ذا شیبة حمال ثقل وابیض مثل صدّ السیف نالا

قال الاصمعی: "بالا" فصاح ابن الاعرابی: "نالا" بالنون من النوال ... فحدثنی یموت بن المزرّع عن ابی امامة الباهلی وحضر المجلس: ان الاعرابی افتضح بهذا، ثم احتال فاحضر نسخةً فیها شعر عمرو بن احمر وقد غیّر البیت الاول فیها فجعله:

اعدوا واعد الحیّ الزمالا وشوقاً لا یبالی العیب بالا[۵۵]

ابن احمر کے دیوان کا ایک نسخہ ابو الفتح عثمان بن جنی (م ۳۹۲ھ) کے پاس بھی موجود تھا۔

جس کا ذکر انھوں نے "الخصائص" میں کیا ہے، وہ ابن احمر کے دو اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ولم یسند ابوزید ھذین البیتین الی ابن احمر ولا ھما ایضاً فی دیوانہ۔[۱۹]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابن احمر کے دیوان کی نقلیں صرف ان ہی دونوں کے پاس تھیں، یہ بدیہی امر ہے کہ ابن احمر کا دیوان اتنا ہی عام تھا جتنے امرؤالقیس، الاعشی، الاخطل اور دیگر شعراء کے دواوین۔ لیکن خوش قسمتی سے ان شعراء کے دواوین تو ہمیں دستیاب ہیں، مگر ابن احمر کا دیوان حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گیا،

علامہ الحسن بن محمد بن الحسن الصغانی (م ۶۵۰ھ) کی ان مؤلفات سے جو لغت پر مشتمل ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر دوسرے شعراء کے دواوین کے علاوہ ابن احمر کا دیوان بھی تھا، ان میں اس کے بکثرت اشعار نقل کیے ہیں، چنانچہ العباب الزاخر میں بہت سے اشعار ملتے ہیں، اس میں ابن احمر کے ایسے اشعار بھی ہیں جو لغت وادب کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے۔

ابن احمر کے دیوان کا سراغ مشہور مورخ مغلطائی بن قلیج بن عبداللہ (م ۷۶۲ھ) کے ہاں بھی ملتا ہے، جیسا کہ البغدادی (م ۱۰۹۳ھ) کی کتاب خزانۃ الادب سے ظاہر ہے، بغدادی ابن احمر کے حالات کے ضمن میں ایک شعر کے بارے میں لکھتے ہیں: قال الحافظ مغلطائی فی حاشیتہ (الروض الباسم) علیہ (ای علی الروض الانف): وفیہ نظر من حیث ان الذی فی دیوانہ ابن احمر ان ذالک البیت بعد قولہ ......[۲۰]

معلوم ہوتا ہے بغدادی نے بھی ابن احمر کے دیوان کے کئی نسخے دیکھے تھے، چنانچہ وہ ابن احمر کے ایک شعر کے پہلے مصرعہ "بتیہاء قفر والمطی کانھا" کی مختلف روایات کو بیان کرتے ہیں لکھتے ہیں: ھذا الکلام من لم یقف علی الروایۃ والتی عامۃ نسخ شعرہ (ای ابن احمر)

اسے یحمد سعید الواسطی کا ملنا۔[۲۱]

ابن احمر کے دیوان کا ذکر مندرجۂ ذیل حضرات کے ہاں بھی موجود ہے:

(۱) محمد بن خیر الاشبیلی (م ۵۷۵ھ) فہرست ما رواہ عن شیوخہ، طبع بیروت ۱۹۶۳ء ص ۳۹۳-۳۹۶

(۲) حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ): کشف الظنون، طبع استنبول ۱۳۶۰ھ ج ۱ ص ۷۷۴،

(۳) السید الحسین العباسی النبہانی (م بعد ۱۰۹۵ھ)، فوٹو ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ورق ۵۶

افسوس ہے کہ ہمارے اسلاف کے دوسرے نوادرات کے ساتھ ابن احمر کا دیوان بھی دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ اور آج دنیا کے کسی کتب خانہ کی فہرست میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

ابن احمر کے دیوان کی اہمیت | ابن احمر کے کلام کو حسب ذیل وجوہ سے خاص اہمیت حاصل ہے

(۱) وہ اس عہد کے شاعر ہیں جس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے زندگی بسر کی ہے، اس لیے ان کے کلام سے اس عہد کے بارے میں بہت سی نئی معلومات منظر عام پر آئیں گی۔

(۲) قرآن کی زبان اور تراکیب کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے لٹریچر کا مطالعہ ضروری ہے، ان میں اس عہد کے مروجہ کلمات کی تشریح اور خصوصی معانی پوری طرح محفوظ ہیں، اس لیے متقدمین نے فہم قرآن کے لیے جن شاعروں کے کلام کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے ان میں ..... عمرو بن احمر الباہلی بھی ہیں، چنانچہ تفسیر اور علوم القرآن سے متعلق کتابوں، اور حدیث کی شرحوں میں ابن احمر کے کلام کو بطور شاہد پیش کیا گیا ہے، اور اس سے قرآن و حدیث کی زبان سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے، اس کے علاوہ اس میں اس عہد کی

رائج لفظی تراکیب، محاورات اور روزمرہ کا بڑا ذخیرہ ہے۔

(۳) بعض اوقات شعراء کے دواوین میں ان کے عہد کے تاریخی واقعات کے متعلق ایسے اشارے مل جاتے ہیں، جس سے اس عہد کی تاریخیں خالی ہوتی ہیں، اس لیے بہت سی قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔

(۴) ابن احمر الباہلی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے عہد میں تھے، اس عہد کے بعض واقعات خود ان پر گزرے، بعض انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بہت سے مستند ذرائع سے سنے، اس کی تصویریں ان کے کلام میں ملتی ہیں، انھوں نے بہت سی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں روم کی معرکہ آرائیوں میں شامل رہے، ان کے کلام میں ان سب واقعات کا ذکر ہوگا، اس لیے ابن احمر کا دیوان تاریخ کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

(۵) ابن احمر نجد کے شاعر تھے، یہ وہ علاقہ ہے جس کی طرف آثار قدیمہ کے ماہرین نے کما حقہ توجہ نہیں کی ہے، اب رسالہ "العرب" کے مدیر اعلیٰ حمد الجاسر کی توجہ سے اس خطہ کے آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام شروع ہوا ہے، اس زمانہ میں نجد اور اس کے گردونواح میں بہت سی بستیاں تھیں جو اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں، بہت سے مقامات اور وادیوں کا اب پتہ نہیں چلتا، مگر عرب کے قدیم لٹریچر میں ان کا ذکر موجود ہے، اس لٹریچر کا بڑا حصہ صرف شعروں کی شکل میں ہے، کیونکہ ان ہی وادیوں اور بستیوں میں اس علاقہ کے شعراء گھومتے پھرتے رہے ہیں، اس لیے ان نیست و نابود مقامات، وادیوں اور جگہوں کو صرف ان شاعروں کے کلام میں تلاش کیا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں ابن احمر کا کلام نجد اور گردونواح کے مقامات کی تعیین کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، ان میں سے بعض مقامات کے محل وقوع کے سلسلے میں ابن احمر کا کلام بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے، چنانچہ قدیم جغرافیہ

نویسوں نے دوسرے شعراء کے علاوہ ابن احمرؔ کے اشعار بھی بعض مقامات پر نہ صرف بطور شواہد پیش کیے ہیں، بلکہ کچھ مقامات کی تعیین ابن احمر کے اشعار ہی سے کی ہے[۲۲]۔

(۶) اس عظیم شاعر نے، جو عموماً شاذ اور مشکل الفاظ استعمال کیا کرتا تھا، عربی کو بہت سے اچھوتے اور نئے الفاظ دیے ہیں، جن کا وجود اس سے پہلے کی عربی زبان میں نہیں ملتا، اس کا اعتراف متعدد لغویوں نے کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: "(۹) اعلم احداً اتی بھا الا ابن احمر الباھلی"[۲۳]۔

(۷) ابن احمر اہل دیہ کے شاعر تھے، اور ان کی زبان خالص عربی تھی، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا کلام جمع کر کے اسے محفوظ کیا جائے، جو عربی زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

اس اہم اور ضروری کام کو میں نے ۱۹۶۷ء میں استاد محترم اور عربی کے نامور عالم مولانا عبد العزیز المیمن کی نگرانی میں لاہور میں شروع کیا تھا، اب خدا کے فضل سے ابن احمرؔ کے موجود اشعار کا مجموعہ ایک دیوان کی شکل میں جمع ہو چکا ہے۔ جو عنقریب چھپ جائیگا۔

ابن احمرؔ کے اشعار جمع کرنے کا طریقہ اشعار کے ضائع شدہ سرمایہ کو زندہ کرنے کی ایجاد کا سہرہ مولانا عبد العزیز المیمن کے ہی سر ہے جنھوں نے سب سے پہلے اس کی طرف علماء کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

میں نے بھی ابن احمر کے اشعار مندرجہ ذیل قسم کی کتابوں سے جمع کیے ہیں، ان میں مطبوعہ کے علاوہ خطی کتب سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۱) عربی زبان کے لغات (۲) عربی ادب کی کتابیں (۳) عربی زبان، قواعد اور نقد کی کتابیں (۴) تاریخی و جغرافیائی کتابیں جن میں شعری سرمایہ موجود ہے اور وہ قدیم بھی ہیں (۵) قرآن مجید کی تفاسیر، علوم القرآن، اور حدیث کی شرحوں پر مشتمل کتب (۶) عربی اشعار کے

مختلف مجموعے۔ (۷) مختلف شعراء کے دواوین کی شروح۔

ان کتابوں سے جمع شدہ اشعار کے ساتھ ان کی مختلف روایات کو بھی جمع کیا گیا ہے اور صحیح ترین روایت کو اصل قرار دے کر روایات کو حواشی میں درج کر دیا گیا ہے، مشکل الفاظ کی تشریح اور اس کے لیے جو شواہد میسر آسکے ہیں، جمع کیے گئے ہیں، اعلام کے تراجم اور جن واقعات کی طرف اشعار میں اشارہ ہے ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ: ان اشعار کو جمع کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ شعر ابن احمر الباہلی ہی کے ہیں، جبکہ اس کے علاوہ اس نام کے تین اور شاعر بھی گذرے ہیں، ممکن ہے کہ ان کا کلام ہمارے عمرو بن احمر الباہلی کے ساتھ مل گیا ہو۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ سب سے پہلے ہم باقی تین شعراء کا جائزہ لیں گے، اس کے بعد آخر میں ان کے کلام کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جاسکے گا۔

الآمدی نے اپنی کتاب المؤتلف والمختلف[۲۴] میں چار ابن احمر نامی شعراء کا ذکر کیا ہے:
(۱) عمرو بن احمر بن العمرد الباہلی جن کا کلام ہم نے جمع کیا ہے (۲) ابن احمر البجلی: قدیم اسلامی شاعر (۳) ابن احمر الکنانی: اس کا نام سِنبِسی ہے اور جاہلی شاعر ہے (۴) ابن احمر الایادی مؤخر الذکر تینوں شعراء کا ذکر ادب کی کتابوں میں ان کی نسبت کے ساتھ لیا جاتا ہے، یعنی پہلے کو البجلی، دوسرے کو سنبسی ابن احمر الکنانی اور تیسرے کو الایادی، انکے برعکس عمرو بن احمر بن العمرد کا ابن احمر، عمرو ابن احمر، عمرو بن احمر الباہلی تینوں ناموں سے ذکر کیا جاتا ہے۔

مذکورہ تینوں شعراء کے کلام کا ذکر بہت کم ملتا ہے، ابن احمر الایادی کے ایک شعر کے علاوہ کوئی کلام نہیں ملا، الآمدی کہتے ہیں: لم يقع الی من شعره كبير شيء وجدت[۲۵]

فی کتاب ابادبیتاً واحداً وھو :

هل يُهنِنَ عن نون و عن حتق من بالحزيزة من برد و عمقٍ

قبائلی شعراء کے مجموعے جن میں ان شعراء کا کلام جمع تھا۔ ان میں سے چند کا تو وجود ہی نہ تھا، جیسا کہ الآمدی نے قبیلہ آیاد کے متعلق لکھا ہے، اس کے علاوہ باقی دونوں شعراء کے کلام کے وجود سے تو کسی نے انکار نہیں کیا ہے، لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا، اور وہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا، یا وہ اتنا کم تھا کہ وہ مرور زمانہ کے ساتھ گم ہو گیا، صرف اس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

ابن احمر البجلی اور منتٰی بن احمر الکنانی کے ایک دو شعروں کا ذکر ابن منظور نے لسان العرب میں کیا ہے، مگر جہاں ان کے شعر دیے ہیں وہاں ان کے ناموں کے ساتھ البجلی اور الکنانی ضرور لکھا ہے، پھر چاروں شعراء کے زمانوں میں اتنا فرق ہے کہ اس سے ان کا طرز کلام بالکل ممیز ہو جاتا ہے، ابن احمر الباہلی کی مشکل تراکیب اور غریب کلمات میں دوسرے اشعار کے اختلاط کی بہت کم گنجائش ہے، مؤخرالذکر تینوں شعراء کے کلام کے وجود کی نفی اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے دواوین کا کسی نے کہیں ذکر نہیں کیا ہے، ان کے مقابلہ میں ابن احمر الباہلی کے دیوان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

ابن احمر کے اشعار ابن احمر الباہلی اور کہیں کہیں عمرو بن احمر الباہلی کے نام سے مختلف کتب خانوں میں ہیں، ان وجوہ کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ جمع شدہ کلام صرف عمرو بن احمر ابن العمرو الباہلیؒ کا ہی ہے۔

ابن احمرؒ کے اشعار کا ضیاع ابن احمر بہ گو اور کثیر الکلام نہ تھے، بلکہ کم کہتے تھے مگر اچھا کہتے تھے، اس کے باوجود لغت و ادب کی کتب میں شاذ کلمات کی بنا پر ان کے بیشتر اشعار محفوظ ہو گئے ہیں۔

مگر ان اشعار کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا، جن میں غریب کلمات کا استعمال نہیں ہوا ہے، یا جو آسان تھے یا جن کا ذکر ایسی کتابوں میں آیا ہے جو اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں، اس لیے جو کچھ ہم نے جمع کیا ہے، یقیناً وہ ابن احمر کے کلام کا ایک حصہ ہے، باقی اشعار ضائع ہو چکے ہیں، اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ بعض قصائد کی ابتدا میں ہے: "من قصیدة له طویلة"۔ مگر اس کے صرف چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، اسی طرح بعض قصائد کے صرف ایک دو شعر ملے ہیں، پورا قصیدہ نہیں مل سکا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن احمر کے کلام کا کتنا حصہ ضائع ہو گیا، پھر بھی اس مجموعے میں ساڑھے چھ سو کے قریب اشعار جمع کیے گئے ہیں، یہ مجموعہ عنقریب چھپ جائے گا۔

(ترجمہ ۶۸/۴/۲)

حواشی | لہ الف۔ الاصابہ فی تمییز الصحابۃ ط مطبعۃ مصطفی محمد، القاہرۃ ج ۳ ص ۱۱۲

ب۔ المؤتلف والمختلف للآمدی ط القاہرۃ سنۃ ۱۳۵۴ھ ص ۳۰

ج۔ معجم الشعراء للمرزبانی ط القاہرۃ سنۃ ۱۳۵۴ھ ص ۲۱۴

د۔ الشعر والشعراء لابن قتیبۃ ط بیروت سنۃ ۱۹۶۴ء ص ۲۷۳

ہ۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام ط دار المعارف بمصر سنۃ ۱۹۵۲ء ص ۴۹۲

و۔ فحولۃ الشعراء للاصمعی ط القاہرۃ سنۃ ۱۹۵۳ء ص ۲۳

ز۔ جمہرۃ اشعار العرب لابی زید القرشی ط بولاق سنۃ ۱۳۰۸ھ ص ۳۴-۳۵

ح۔ خزانۃ الادب لعبد القادر بن عمر البغدادی ط بولاق سنۃ ۱۲۹۹ھ ج ۳ ص ۳۸

ط۔ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی ط دار الکتب المصریۃ ج ۸ ص ۲۳۴-۲۳۵

ی۔ الموشح فی مآخذ العلماء علی الشعراء للمرزبانی ط القاہرۃ سنۃ ۱۳۴۳ھ ص ۸۰

ک۔ سمط اللآلی شرح امالی القالی تحقیق عبد العزیز المیمنی ط القاہرۃ سنۃ ۱۹۳۶ء ص ۲۶۴

ل۔ الاعلام للزرکلی ط ثانیۃ ج ۵ ص ۲۳۰

۲ھ دیکھئے :- المؤتلف والمختلف للآمدی ص ۳۷، معجم الشعراء للمرزبانی ص ۲۱۴، الشعر والشعراء لابن قتیبة ص ۲۷۳؛ الاصابة ج ۳ ص ۱۱۲

۳ھ اس ہجو کے اس شعر کا ہمیں علم ہوا ہے (معجم ما استعجم للبکری ط القاہرة ۱۹۴۵ء ص ۳۲):

اذا ما جعلت الستر بینی وبینه ۔۔۔ فلیس علی قتلی یزید بقادر

۴ھ الاعلام للزرکلی ج ۵ ص ۲۳۷، مصادر الشعر الجاهلی وقیمتها التاریخیة للدکتور ناصر الدین الاسد ط دار المعارف بمصر سنة ۱۹۶۲ء ص ۲۷۳؛ بحوالہ کتاب الاغانی ج ۸ ص ۲۳۴؛ ڈاکٹر ناصر الدین الاسد نے ابن احمر کو یہاں مشہور اور معمر شعراء کے زمرے میں بیان کیا ہے۔

۵ھ الزرکلی : الاعلام ج ۵ ص ۲۳۷

۶ھ طبقات فحول الشعراء لابن سلام ص ۴۹۲: المؤتلف والمختلف للآمدی ص ۳۷؛ الخصائص لابن جنی ط القاہرة ۱۹۵۵ء ج ۲ ص ۲۱-۲۵؛ ان کے شاذ کلمات کا ذکر لغت وادب کی متعدد کتابوں میں کئی مقامات پر آیا ہے: لا اعلم احداً اتی بها الا ابن احمر الباهلی۔

۷ھ الخصائص لابن جنی ج ۲ ص ۲۱ ۸ھ الاصابة ج ۳ ص ۱۱۲

۹ھ ڈاکٹر ناصر الدین الاسد، امرؤ القیس کے دیوان پر بحث کے دوران اسکے نسخہ یزیدی (ابو عبد اللہ محمد بن العباس بن محمد بن یحیی بن المبارک الیزیدی المتوفی ۳۱۰ھ) کے بارے میں ابن النحاس کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قال ابن درید: دفعها الاصمعی ورواها قوم لابن احمر، وهی فی اصل الیزیدی (مصادر الشعر الجاهلی ص ۴۹۹)، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اچھے خاصے گروہ پر ابن احمر اور امرؤ القیس کے اشعار میں مماثلت کی بنا پر غلط مبحث ہو گیا تھا۔

۱۰ھ جمهرة اشعار العرب ص ۳۵ ۱۱ھ فحولة الشعراء للاصمعی ص ۲۳، الموشح للمرزبانی ص ۹۲ ۱۲ھ طبقات فحول الشعراء

۱۳ھ المؤتلف والمختلف للآمدی ص ۳۷ والخزانة للبغدادی ج ۳ ص ۳۸، الآمدی

اور صاحب الخزانہ نے ابن حبیب کی اس قسم کی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا، البتہ دوسرے مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ ابن حبیب کی ضائع شدہ کتابوں میں یہ دو کتابیں بھی ہیں جو شعراء کے حالات پر مشتمل تھیں، اب یہ کتابیں مفقود ہیں، ان میں سے کسی ایک میں ابن احمر کے مفصل حالات ہوں گے، وہ کتابیں یہ ہیں:

(۱) کتاب اخبار الشعراء وطبقاتھم (۲) کتاب الشعراء وانسابھم، دیکھئے المحبر لابن حبیب ط حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء ص ۵۱۵ - ۵۲۰ -

۱۵ جمهرة أشعار العرب ص ۴۳۲ المزھر للسیوطی ط مطبعة عیسیٰ البابی الحلبی بمصر ج ۲ ص ۴۰۱

۱۶ الآمدی (م ۳۷۰ھ) نے المؤتلف والمختلف میں ساٹھ مختلف قبائل کے دواوین کا ذکر کیا ہے اگرچہ ان میں اکثر کا وجود نہیں مل سکا، مگر جو مجموعے اس وقت موجود تھے ان میں سے بھی صرف ہذیل کے اشعار کے علاوہ چند قبائل کے شعراء کے دواوین ملے ہیں، بہرحال ان مجموعوں میں عمرو بن احمر الباہلی کے قبیلہ باہلہ کا ایک مجموعہ کتاب باہلہ کے نام سے بھی ملتا ہے ممکن ہے اس میں ابن احمر کے اشعار بھی شامل ہوں، ان دواوین کے جامعین کے متعلق الآمدی نے کچھ نہیں بتایا، البتہ ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) نے کتاب الفہرست میں جن ۲۹ قبائل کے دواوین کا ذکر کیا ہے ان کے جامعین کا نام بھی دیا ہے مگر ابن ندیم کے یہاں اشعار یا کتاب میں باہلہ کا ذکر نہیں ہے، دیکھئے مصادر الشعر الجاہلی ص ۵۴۳ - ۵۴۱، ۳۵۰

۱۷ احمد بن علی بن احمد بن العباس النجاشی: کتاب الرجال ط ایران (تاریخ طباعت درج نہیں) ص

۱۸ ابو احمد الحسن بن عبداللہ بن سعید العسکری ۲۹۳ھ - ۳۸۲ھ، شرح ما یقع فیہ التصحیف و التحریف ط القاہرہ ۱۹۶۳ء ص ۱۵۲ - ۱۵۳ -

۱۹ الخصائص لابن جنی ج ۲ ص ۴۲، پتہ نہیں ابو زید الانصاری (م ۲۱۵ھ) نے کیوں ان دونوں شعروں کو ابن احمر کی طرف منسوب نہیں کیا، حالانکہ وہ دیوان میں موجود تھے، ابو زید القرشی (م ۱۷۰ھ) نے جمهرة اشعار العرب میں عمرو بن احمر الباہلی کے منتخبات کا انتخاب کیا ہے اور جس قصیدے کے یہ دونوں شعر ہیں، اس کو پورا نقل کیا ہے، چنانچہ ابن احمر کے اس مرثیہ میں سات اشعار کے بعد یہی دونوں شعر ہیں۔

اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ابن جنی بھی کہتے ہیں۔ ولاھا ایضاً فی دیوانہ۔ غالباً ان دونوں کے پاس دیوان ابن احمر کے نسخے ناقص تھے، کیونکہ ان سے پہلے ابوزید القرشی ان اشعار کو پورے قصیدے کے ساتھ اپنی کتاب میں نقل کر چکے ہیں۔

[۲۰] خزانۃ الادب للبغدادی ج ۳ ص ۳۸، الاعلام للزرکلی ج ۵ ص ۲۳۔

[۲۱] خزانۃ الادب للبغدادی ج ۴ ص ۳۳۔

[۲۲] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ البکری نے معجم ما استعجم میں ابن احمر کے اشعار کو ۴۶ مقامات پر مختلف مقاموں کی تعیین اور توصیف (Description) کے لیے درج کیا ہے، اس کام کے لیے یاقوت الحموی نے بھی معجم البلدان میں بہت سے اشعار نقل کیے ہیں، اس کے علاوہ لسان العرب، تاج العروس، تہذیب اللغۃ اور العباب جیسی لغت کی کتابوں میں ابن احمر کے بہت سے اشعار مقامات کی تعیین و توصیف کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔

[۲۳] دیکھئے: الخصائص لابن جنی ج ۲ ص ۲۱، اصمعی نے توکیئ کلمات کے لیے کہا ہے۔ لسان العرب میں کافی الفاظ ہیں جن کے ضمن میں یہ توصیفی کلمات آئے ہیں۔

[۲۴] المؤتلف والمختلف ص ۳۷

[۲۵] ایضاً ص ۳۸

سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی

اور

اس کا نایاب مرثیہ

از جناب محمد ایوب صاحب ضیا واقف ایم اے ریسرچ اسکالر اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی

بمبئی میں سید نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم کا ذاتی کتب خانہ اپنی بیش بہا کتابوں اور نادر مخطوطات کے لیے خاصا اہم تھا، بمبئی شہر اور دوسرے مقامات سے علم و ادب کے شائقین اس کتب خانہ سے استفادہ کے لیے اکثر آیا کرتے تھے، لیکن عمر کے آخیر دنوں میں ان کی توجہ اور ان کا وہ ذوق جو اس لائبریری سے تھا، برقرار نہ رہا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتب خانہ کی بیشتر کتابیں ضائع ہوگئیں، جو بچ رہیں انھیں ندوی صاحب نے انتقال سے قبل انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کو دیدیا، جہاں وہ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، یہ غالباً ان کے انتقال سے ایک ماہ قبل کی بات ہوگی، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرے کتب خانہ کی تمام کتابیں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں جائیں گی، تم ان کتابوں کو ترتیب سے رکھوا دو تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کل کتنی کتابیں اور کن کن موضوعات پر ہیں، میں نے ان کے حکم کی تعمیل شروع کردی، اسی درمیان میں کتب خانہ کے ایک گوشے میں اینٹوں کی ڈھیر تلے کاغذات کا ایک ضخیم پلندہ ملا، احتیاطاً میں اسے بھی دیکھنے لگا، اس میں بہت سے اہم منظوطا اور نظم و نثر کے کچھ مخطوطے ملے، میں نے اس کی اطلاع ندوی صاحب کو دی تو وہ سنکر

ایسے خوش ہوئے جیسے انھیں کوئی متاع گراں مایہ ہاتھ لگ گئی ہو کہنے لگے ان مکاتیب و مخطوطات کو میں ایک عرصہ سے تلاش کر رہا تھا لیکن مل نہیں رہے تھے، انھوں نے انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بعض خطوط و مخطوطات تو ایسے ہیں جنھیں حاصل کرنے میں انھیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے، لیکن جس مقصد کے تحت انھوں نے ان کو حاصل کیا تھا، اب وہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا، میں نے اس کی وجہ دریافت کی کہنے لگے اب تو ہاتھ میں قلم پکڑنے کی طاقت رہی اور نہ آنکھوں میں روشنی، میں نے عرض کیا حضور آپ نے ایسے ایسے باکمال شاگرد پیدا کیے ہیں جو آپ کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پورا کر سکتے ہیں، آپ اتنا بددل کیوں ہوتے ہیں، خود آپ کے رفیق کار عبدالرزاق قریشی صاحب تصنیفی و تالیفی کام میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، اس پر انھوں نے فرمایا "بیچارہ قریشی تو کام کر ہی رہا ہے میں تو اُن نوجوانوں سے کام لینا چاہتا تھا جن سے مستقبل کی بہت سی توقعات ہم نے وابستہ کر رکھی ہیں لیکن آج کل کے نوجوانوں کے ذوق اور رجحان کو دیکھکر بڑی مایوسی ہوتی ہے" میں نے ندوی صاحب سے مودبانہ درخواست کی کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس سلسلے میں کام لیں۔ انشاء اللہ میں آپ کی نگرانی میں حتی الوسع اس اہم کام کو ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کروں گا، اس پر ندوی صاحب نے خوشی و طمانیت کا اظہار کیا اور اسی وقت مجھے مکاتیب و مخطوطات کے اس پلندے سے احمد آباد کے ایک گمنام شاعر سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ مرحمت فرمایا، اور خوشتر کے حالات تلاش کرنے میں امداد کا وعدہ بھی کیا، مگر افسوس کہ اس کے ایک ماہ بعد ہی استاد محترم اس دار فانی سے کوچ کر گئے،

ندوی صاحب نے مجھے جو غیر مطبوعہ مرثیہ عنایت فرمایا تھا وہ سید قادر میاں خوشتر

احمد آبادی کا ہے، خوشتر تخلص کے احمد آباد میں ایک عہد میں تین شاعر ہوئے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: سید برہان الدین خوشتر عرف میران صاحب ضیا یہ احمد آباد کے قصبہ دھوکے رہنے والے تھے، ان کا آبائی پیشہ پیری مریدی تھا، ان کے آباء و اجداد نے راجہ بڑودہ کے یہاں ملازمت اختیار کی تھی، دوسرے سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی ہیں، تیسرے خوشتر کا پورا نام نہیں دریافت ہو سکا، ان کے بارے میں مصنف مخزن الشعراء نے لکھا ہے کہ یہ بوہرہ قوم سے تعلق رکھتے تھے، سالہا سال تک بنگالہ، اودھ اور صوبہ بہار میں بسر اوقات کیے، خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ سے ان کے مراسم تھے،

راقم الحروف نے جو مرثیہ حاصل کیا ہے اس کے شروع میں تخلص کے ساتھ پورا نام سید قادر میاں لکھا ہوا ہے، اس لیے اس مرثیہ کے اصل مصنف کے بارہ میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا، اب رہا سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے حالات زندگی کی فراہمی تو حتی الوسع میں نے گجرات کے قدیم شعراء و صوفیاء سے متعلق تذکروں کا مطالعہ کیا لیکن بدقسمتی سے مخزن الشعراء کے علاوہ کسی کتاب میں خوشتر کے بارہ میں کچھ نہ مل سکا، گجرات کے بہت سے اصحاب سے خط و کتابت کی لیکن وہ بھی میری مدد سے قاصر رہے، حیدر آباد سے محمد اکبر الدین صدیقی اور ناگ پور سے ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے خوشتر سے متعلق جو معلومات بھیجے وہ مخزن الشعراء ہی سے ماخوذ تھیں، مجھے سید ظہیر الدین مدنی صاحب کا تحقیقی مقالہ "سخنوران گجرات" جو انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا، پڑھکر تعجب ہوا، انھوں نے گجرات کے متعدد شعراء کے صرف نام گنا دیے ہیں، ان شعراء کے متعلق تسلی بخش مواد فراہم نہ کر سکے پرانے تذکروں میں جو کچھ مل گیا، اسی پر قناعت کر لی، مدنی صاحب گجرات ہی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے لیے سہولتیں بھی تھیں، وہ چاہتے تو بیشتر شعراء کے

خاندانی حالات فراہم کرسکتے تھے، ان کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں شائع ہونے والا ہے۔ مدنی صاحب اشاعت سے قبل اگر اس کمی کو پورا کر دیں تو یہ کتاب گجرات کے شعرا اور وہاں کی اردو شاعری کی عہد بہ عہد کی ترقی پر ایک گرانقدر تصنیف ہوگی۔

مخزن الشعراء جس میں سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے حالات درج ہیں، اس کے مصنف قاضی نورالدین حسین خاں فائق نے اس میں کل ایک سو چودہ[114] شاعروں کا ذکر کیا ہے، اس کے دیباچے میں اس تذکرہ کے بارہ میں لکھا ہے:

"این اوراق خزینہ از جواہر زر معانی سخنوران و درر غرر خوش بیانی نکتہ پروران است موسوم بہ مخزن الشعراء شد"

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس تذکرہ میں مستند اور قادر الکلام شعراء ہی کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا اہم تذکرہ مرتب کرتے وقت قاضی نور العین فائق جیسے بلند پایہ تذکرہ نگار نے جن کی قابلیت اور فنی شعور کی تعریف غالب جیسے شاعر نے کی، شاعروں کے حالات زندگی، ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں کو پردہ اخفا میں کیوں رکھا، حالانکہ اس تذکرہ کے بیشتر شاعر مصنف کے معاصر تھے، اور بہتوں سے تو ان کے مراسم بھی تھے، بہر حال مخزن الشعراء میں فائق نے خوشتر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں ہم ان کے حالات زندگی اور ان کے عہد کا تعین کریں گے، فائق نے سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے متعلق یہ چند سطور قلمبند کی ہیں:

"خوشتر تخلص، سید قادر میاں نبیرۂ سید مہدی صاحب مرحوم کہ اوصاف جمیلۂ ایشان مشہور است طبع رسان ذہن ذکا میداد و در فارسی و عربی استعداد

معقول دہم علم فرائض بخوبی مستحضر داردو در رفتار و گفتار بطرز نوعمیاں درست وخوب است چوں معاشِ مشائخین بر خدمتِ مریداں سورت می بندد لہذا اقامتش گاہے در سورت و گاہے در احمد آباد از راقم تعارف باحسن وجہ جاری است۔"

اس سے خوشتر احمد آبادی سے متعلق بہت سی باتوں کی نشاندہی ہوتی ہے، اول یہ وہ سید مہدی کے پوتے یا نواسے تھے، محترم اکبرالدین صاحب صدیقی مدیر "سب رس" حیدرآباد نے مجھے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہو کہ خوشتر سید مہدی کے فرزند تھے، جو صحیح نہیں ہے، مؤلف مخزن الشعرا نے انھیں نبیرۂ سید مہدی لکھا ہے، نبیرہ کے معنی پوتا یا نواسہ ہوتے ہیں، فرزند نہیں، اس کی تصدیق علی جواد زیدی اور ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی وغیرہ نے بھی اپنے خطوط میں جو انھوں نے مجھے لکھے ہیں کی ہے، اس لیے خوشتر سید مہدی کے پوتے یا نواسے تھے، دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ صوفی مسلک رکھتے تھے، اور چونکہ تذکرہ نویس نے خصوصیت کے ساتھ ان کے دادا سید مہدی کا نام لیا ہے، اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان سے پہلے بھی ان کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا، وہ علم فرائض کے ماہر تھے، کبھی احمد آباد میں قیام کرتے تھے اور کبھی سورت میں، ان مقامات پر ان کے مریدوں کی کثیر تعداد تھی۔

سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی کے عہد کے متعلق اگرچہ اس تذکرہ میں کوئی تصریح نہیں ہے، لیکن مصنف نے لکھا ہے کہ" از راقم تعارف باحسن وجہ جاری است" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشتر اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت بقید حیات تھے، اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس تذکرہ کو اپنے جامع مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے،

نورالدین فائق کو مرزا غالب کا معاصر بتایا ہے، اور اس کے ثبوت میں انھوں نے تذکرہ کے اخیر میں قاضی صاحب کے نام مرزا غالب کا ایک خط بھی شائع کیا ہے، یہ خط دوشنبہ جولائی ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا ہے؛ اور غالب نے یہ خط اس موقع پر لکھا تھا جب فائق نے تذکرہ لکھنے کے بعد اس کو ان کے پاس اصلاح و مشورہ کے لیے بھیجا تھا، وہ خط حسب ذیل ہے:-

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نورالدین حسین خاں بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خاں بہادر نے یہ اجزا دو مجھکو دے نظم سے میں نے بالکل قطع نظر کی اکال صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے اسکو بھی نہیں دیکھا، صرف آپ کی نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپکے بعض جا درست کر دیا، بعض موقع پر منشائے اصلاح بھی لکھ دیا ہے، مجھکو یہ یارا نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں، بعنوائے الامر فوق الادب حکم بجا لایا ہوں، مرحبا آفریں بجز اخوب نثر لکھی ہے، اللہ سبحانہ آپ کو مدارج اعلیٰ کو پہنچائے اور سلامت رکھے۔

خوشنودی احباب کا طالب

غالب

غالب کا سنہ پیدائش ۱۷۹۷ء اور سنہ وفات ۱۸۶۹ء ہے۔ نورالدین فائق کا سنہ ولادت تو دستیاب نہیں ہو سکا لیکن سنہ وفات مولوی عبدالحق نے ۱۸۶۹ء لکھا ہے، اس طرح غالب اور فائق دونوں نے ایک ہی سال میں انتقال کیا۔ فائق نے چونکہ خوشتر احمد آبادی کے متعلق لکھا ہے کہ ان سے خوشتر کے تعلقات قائم تھے، اس بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غالب اور فائق کا زمانہ ہی خوشتر کا بھی زمانہ ہے۔ تذکرہ مخزن الشعرا کی ترتیب کی تاریخ سے متعلق اس تذکرہ کے آخیر میں بہت سے قطعات درج ہیں، جن میں اس تذکرہ کا

سنہ تصنیف ۱۲۸۵ھ نکلتا ہے، مثلاً ایک قطعہ یہ ہے:

چونکہ فائق بنام این مخزن   بست مملوز لولوے لالا
ملہم غیب گفت تاریخش   خوش کتابیست مخزن الشعرا

سنہ ۱۲۷۰ھ

مرزا فائق کے انتقال اور اس تذکرہ کی تالیف میں اٹھارہ سال کا فرق ہے، اس لیے بعید نہیں کہ خوشتر احمد آبادی نے بھی اسی سنہ کے قریب کسی سال میں وفات پائی جس سال میں غالب اور فائق نے انتقال کیا۔

خوشتر سے متعلق اس سے زیادہ حالات نہیں ملتے، اب غیر مطبوعہ مرثیہ ملاحظہ ہو:-

جو دل سے جان نثار پیغمبرِ خدا ہے   اے مجرئی وہ بیشک مقبولِ کبریا ہے
جو غم گزیں شاہِ مظلومِ کربلا ہے   حق اس سے راضی اور خوش سلطانِ انبیا ہے
ہے نورِ چشمِ احمد شبیر اس کی الفت   نورِ صراط ہے اور ایمان کا ضیا ہے
جس کے قدم سے تسکیں عرشِ عظیم پائے   کاندھے پر اس نبی کے شبیر جا چڑھا ہے
اللہ ہی جانتا ہے آلِ نبی کا رتبہ   روح الامیں کو پر کچھ اس کا پتہ چلا ہے
عیسیٰ اتر فلک سے مہدی کا مقتدی ہے   مریم سے فوق کتنا رتبہ بتول کا ہے
آنکھوں سے ہاتھ دھوئے رو رو کے دیکھو آخر   غم اک پسر کا ایسا یعقوب کو ہوا ہے
گر پاؤں ہاتھ آویں شبیر کے تو دھو دھو   پانی پئیں ہم اپنی چشموں سے یہ رجا ہے
احباب اقربا و فرزند تشنہ لب سب   سوئے عدن سدھا سے پانی نہیں کیا ہے
منظورِ حق یہ تھا کہ وہ تشنہ کام آئے   آنسو تک اس نے بھی پر ہرگز نہیں پیا ہے
فرمائے ملکہ ان کی وہ لاش دیکھ بے سر   سر دے کے ہم کیا سر تم نے مرا خدا ہے
اب کوئی دم ہو زندہ ہوں میں بھی پھر کسی کی   ہے تیغ آبدار اور سوکھا مرا گلا ہے

بن پانی جانِ اصغر یوں آرہی ہے لب پہ
پانی پہ جیسے حباب اور اس پہ فدا ہوا ہے

کر صبر آ بروئے شبیر بتول رکھ دے
پھر تیغ حیدری کا پانی دکھا دیا ہے

وہ برق وش جدھر جا کوندی ادھر برس کی
یکسر بجھری لگی جوں ساون برس رہا ہے

خون تشنگان خون سلطان تشنہ لب کا
ایسا پیا کہ اٹکا دم اس کا بھر گیا ہے

قطع کلام کاٹے سایہ تمک اشقیا کے
کیا سیف مرتضیٰ نے لوہا منا دیا ہے

جو بھاگے وہ تھے باقی اور حکم حق یہ پہنچا
شبیر اب وفا کر وعدہ جو کچھ کیا ہے

کر میان تیغ بولے تیغ آزمائی تھی یہ
ورنہ وفائے وعدہ تو اصل مدعا ہے

فلک شامیوں سے بن آئی اب تمہاری
مت بھاگو آؤ لو سر خالق کی یوں رضا ہے

ہر صبح و شام ہر دم درگاہ کبریا سے
یہ مقصد و تمنا یہ عرض و التجا ہے

خوشتر کے عقدے مشکل کل حل ہوں یا الٰہی
یہ بھی غلام آل و اصحاب مصطفےٰ ہے

دیگر

اے مجرئ کونین کا مختار ہے شبیرؑ
اور ناز الوہیت دادار ہے شبیرؑ

جس در کا گدا کشور عرفاں کا شہنشاہ
درباں ہیں ملک جسکے وہ سالار ہے شبیرؑ

اعدا کو دیا آب نہ کی آپ کی کچھ فکر
کیا بحر کرم ابر عطا بار ہے شبیرؑ

جب خیمہ زن خلد ہوئے غازی تو شامی
کہنے لگے اب بیکس و بے یار ہے شبیرؑ

ہر ایک ہوا لاف زن حوصلۂ رزم
یہ جان کے بے طاقت و ناچار ہے شبیرؑ

کہتا تھا کوئی دیکھ لو کچھ اسکے بھی جوہر
پھر دم میں ابھی جوہر تلوار ہے شبیرؑ

اکبر کے تو مرنے نے اسے مار رکھا ہے
عباس کے غم سے بھی دل افگار ہے شبیرؑ

کہتا تھا کوئی جائے ترحم ہے عزیزو	ہر گونہ اذیت میں گرفتار ہے شبیرؑ
گر قبضۂ اعدا میں تھا دریا کا کنارا	کوثر کا مگر ساقی و مختار ہے شبیرؑ

خوشتر ترا آقا ترا والی ترا مولیٰ
سبطِ نبی و سید ابرار ہے شبیرؑ

کم اختر فیروز سکندر تو نہیں ہے	پر شہ کی سلامی کا وہ ہمسر تو نہیں ہے
روشن ہے ضیا بخش جہاں مہر ہے لیکن	جوں عارضِ شبیر منور تو نہیں ہے
خوشبو میں اگر مشک ہوا شہرۂ آفاق	پر کاکلِ اکبر سا معطر تو نہیں ہے
اکبر ہے نہالِ چمنستانِ امامت	پھولا نہ پھلا کیوں وہ صنوبر تو نہیں ہے
والب تھے اور اصغر نے رکھا منہ میں	چلا کے کہا بانو نے محور تو نہیں ہے
مد الفِ قامتِ شہ تیغِ عدو ہو	یہ خارج از قامِ مقدر تو نہیں ہے
صاد اس نے کیا فردِ شہادت پہ ہی بالعین	اب زیر و زبر کچھ کرے یاور تو نہیں ہے
جوں نوکِ قلم ورنہ صفیں صاف ہی کٹ جائیں	شمشیرِ علی سطرِ مکرر تو نہیں ہے
تیغ ایک طرف ابرو کا اشارہ ہو تو دیکھو	لاشیں پڑی یکسر ہیں یہ یکسر تو نہیں ہے

سو جان سے ہو جاؤں میں شبیرؑ پہ قرباں
کوئی اس سے مراد اور مجھے خوشتر تو نہیں ہے

سلامی آوے پسند اس کو یاسمن کی بو	جو سونگھے خواب میں گاہے رخِ حسن کی بو
عرق سے اسکے کہاں عطرِ گل کو نسبت	ہے اسکے خوں میں تو محبوبِ ذوالمنن کی بو
وہ ہے بہارِ گلِ وحدت اس کے رکھتی ہے	زمینِ تحتِ قدم گلشنِ عدن کی بو
جو عندلیب کا ہو دشتِ کربلا میں گذر	نہ ہو قبول دماغ اس کو پھر چمن کی بو

گئے جو خلد میں اکبر تو رو کے زہرا نے ... جبیں کو چوم کے لی زلفِ پُرشکن کی بو
سکینہ بولی ہے اصغر کے غم نے غش آ کو ... سنگھاؤ اسکو کوئی اس کے پیرہن کی بو
کہا یوں شاہ سے ہمشیر نے کہ سونگھو گی ... ہیں کس کے جسم سے مادر کے اپلبن کی بو
کہا یوں لاشۂ اصغر پہ رو کے بانو نے ... سنگھا ئیں صدقہ ذرا غنچۂ دہن کی بو
گئی نہ خنجرِ قاتل سے ایک مدت تک ... وہ خون تشنۂ مظلومِ بے وطن کی بو
مہک رہی ہے گلستانِ دہر میں ہر سو ... ہر ایک گل سخن مدحِ پنجتن کی بو
جو ہوتے والبِ رنگیں تو لیتے جھڑتے پھول ... مہکتی بزم میں عطرِ گل سخن کی بو
ملے پروں پہ عرق جس کا اپنے رُوح القدس ... نصیب ایسے کے ہو تمر سگ بدن کی بو

کہاں نصیب وہ خوشتر کہ ہو نصیب تجھے
شمیم مرقدِ پاکِ شہِ زمن کی بو

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ

کی یادگاریں

نشانِ منزل بھوپال کا خاص نمبر

یہ خاص نمبر حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، الہلالی تقطیع پر اس کا حجم ۱۲۸ صفحے ہے، اس میں دار العلوم کے اساتذہ اور مقامی فضلا و اصحابِ قلم کے علاوہ مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر رفیع الدین صاحب جیسے مشاہیر اہلِ علم و اہلِ دل بزرگوں کے مضامین ہیں، جن سے شاہ صاحب موصوف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ عمر بذریعہ منی آرڈر بھیجکر اس کیمیائے سعادت کو فوراً حاصل کیجئے۔ پتہ :- دار العلوم، تاج المساجد، بھوپال۔

ادبیات

رفتارِ زمانہ بہ ترجمانی استادِ غالبؔ

بمناسبت تقریبِ جشنِ صد سالہ غالبؔ

از پروفیسر نکہت شاہجہانپوری

پیرِ مغاں کا جشن برنگِ دگر ہے آج ہر موجِ بادہ حاصلِ خونِ جگر ہے آج

سرمستی و نشاط کو اب ڈھونڈیئے کہاں ساقی کی چشمِ مست مگر بے اثر ہے آج

زاغ و زغن کے دور میں بلبل ہے بے نوا ہر گوشۂ چمن ہمہ تن شور و شر ہے آج

دنیائے نو کو حسنِ تمدن سے بیر ہے تہذیب مثلِ طائرِ بے بال و پر ہے آج

خوش فہمیاں ہیں دامنِ فرد لیے ہوئے ہر رشتۂ امید فریبِ نظر ہے آج

اب کس پہ اعتبار زمانے میں کیجئے واللہ راہزن ہی مگر راہبر ہے آج

اے ہم سفر نہ پوچھ غمِ دل کی داستاں خود مقصدِ حیات ہی زیر و زبر ہے آج

یہ انقلابِ نو کی نہ تمہید ہو کہیں کچھ تیز تر سی گردشِ شام و سحر ہے آج

اے منزلِ حیات کے رہرو سنبھل کے چل ہر گام رہگزار بہت پُر خطر ہے آج

غالبؔ کی اشکبار سی آنکھیں ہیں مضطرب بربادیٔ ہنر ہی متاعِ ہنر ہے آج

وہ نکتہ سنج و نکتہ شناس و سخن طراز
دیوان جس کا معدنِ لعل و گہر ہو آج

تھی جس کی سجدہ گہ حدِ ادراک سے پرے"
اس کا مزار قبلۂ اہلِ نظر ہو آج

ہاں ہاں! وہی جو بادۂ و ساغر کے تھا ثقہ
خود لذتِ "شہود" سے بھی بہرہ ور ہو آج

مائل تھا جو نہ طاعتِ زہد و ثواب پہ
تو بہ میں اس کی رحمتِ حق مستتر ہو آج

جو آبروئے اہلِ نظر کا تھا پاسباں
خود آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر ہو آج

غالب نواز کا شکوہ اردو نواز ہوں
"غالب محل" "تسلی" فکر و نظر ہو آج

سر پھوڑنے کو مل تو گیا کوئی آستاں
یوں بھی تو سنگ و خشت ہی بس جلوہ گر ہو آج

اردو ادب کو از سرِ نو زندہ کیجئے
غالب خود آپ کے لیے پیغامبر ہو آج

کل تک چراغِ دیر بھی شاید ہی جل سکے
شمعِ حرم برنگِ چراغِ سحر ہو آج

نکہت بہارِ گلشنِ اردو اداس ہے
ذوقِ ادب شہیدِ غمِ بال و پر ہے آج

غزل

از جناب رزم ردولوی

مرے ہوش و صبر و قرار دل شبِ انتظار چلے گئے
مرے حالِ غیر سے اوب کر مرے غمگسار چلے گئے

مری آن جان سے عزیز تھی ترے وضعدار چلے گئے
ترا نام لیکے پکارتے سرِ عرش و دار چلے گئے

مرے دل کی بات تری زباں مرا حرفِ شوق ترا بیاں
یہ قرینہ میل ملاپ کے کہاں میرے یار چلے گئے

یہ شباب اور یہ زندگی یہ غم و نشاط کے معرکے
نہ پلٹ کے آئیں گے پھر کبھی اگر ایک بار چلے گئے

یہی داغِ دل یہی زخمِ تن جو وفا کے باغ و بہار ہیں
یہی ہار پھول لیے ہوئے وہ حضورِ یار چلے گئے

جنھیں دستِ ظلم نے کھو دیا جنھیں تہ تو نے چھپا دیا
جنھیں ڈھونڈتی پھریں رحمتیں وہ گناہ گار چلے گئے

نہ قدم رکے رہِ تیغ پر نہ جھکایا سر کبھی دار پر
تری بات پر تری ذات پر کیے اعتبار چلے گئے

نئی بات کیا ہو دل کے لیے وہی جنگ تشِ جنوں کی ہے
نہ تو سست دستِ جفا پڑا نہ وفا شعار چلے گئے

جو سزا وفا کی لکھی گئی خطِ تیغ سے سر و سینہ پر
یہی عرض داشت سنبھال کے سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ ملال ہجر نہ اشک غم نہ خلش نہ رشک نہ وسوسہ
ترے آتے ہی دل و بزم سبھی اختیار چلے گئے

غزل

از جناب پروفیسر افتخار احمد صاحب فخرؔ دھولپوری، ایم، اے

گلشن بلا سے زد پہ ہے برق و شرار کی
لیکن چمن میں دھوم ہے جشنِ بہار کی

ساقی! سنا نوید نہ فصلِ بہار کی
تشنہ ہے روح جبکہ ہر اک بادہ خوار کی

ماہ و نجوم و کاہکشاں بھی ہیں گردِ راہ
پرواز سوئے عرش ہے مشتِ غبار کی

ہمت شکن تھی منزلِ دشوارِ عاشقی
اہلِ ہوس نے راہِ فرار اختیار کی

یہ کونسا مقام ہے اے جوششِ جنوں
دامن کی ہے خبر نہ گریباں کے تار کی

پھرتی ہے لے کے گردشِ دوراں مجھے کہاں
آخر یہ جستجو ہے، تجھے کس دیار کی

گلشن میں کھل رہے ہیں شگوفے نئے نئے
بعد خزاں ہوئی ہے جو آمد بہار کی

دامن میں کتنے پھول ہیں اے چشمِ خوں فشاں
درکار دل کو سیر تھی کب لالہ زار کی

کچھ مسکراؤ تاکہ مہک جائیں زخمِ دل
رہ جائے میرے دل میں نہ حسرت بہار کی

سنتے ہیں ہر غرور کا نیچا ہوا ہے سر
کرنا نہ فخرؔ، بات کبھی افتخار کی

مطبوعات جدیدہ

تفسیر مظہری جلد ہفتم ۔ تالیف مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ ترجمہ مولانا سید عبدالدائم الجلالی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۵۶، قیمت غیر مجلد ۱۳ر، پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

ندوۃ المصنفین دہلی نے بیہقیٔ ہند قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مشہور تفسیر مظہری کے اردو ترجمہ کی اب ساتویں جلد شائع کی ہے، جو سورۂ بنی اسرائیل تا سورۂ طٰہٰ کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس سے قبل پانچویں اور چھٹی جلدوں کا ان صفحات میں تذکرہ کیا جا چکا ہے، ان جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی مصنف نے آیات کی تشریح و تفسیر کے علاوہ کہیں کہیں کلامی، فقہی، تاریخی، نحوی اور لغوی مسائل سے بحث کی ہے، لائق مترجم نے جن کو خود بھی فن تفسیر کا ذوق ہے، سلیس، رواں اور معنی خیز ترجمہ کیا ہے، لیکن یہ تفسیر قدیم طرز کی ہے، اس لیے ظاہر ہے موجودہ زمانہ کے مسائل و رجحانات کا اس میں لحاظ نہیں ہے، تاہم اس ترجمہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، اور جو۔۔۔ قرآن مجید کے مطالعہ کا شغف رکھنے والے اردو خواں اصحاب کو موجودہ اردو تفسیروں کے ساتھ اس تفسیر کو بھی اپنے مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

تذکرہ روضۃ السلاطین و جواہر العجائب } تصحیح و تحشیہ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب، بڑی تقطیع کاغذ معمولی، خوبصورت ٹائپ، مجموعی صفحات ۲۲۶ قیمت ۲۰ عہ

پتہ: ادبی سندھی بورڈ، حیدرآباد سندھ، پاکستان۔

پاکستان کے مشہور مصنف اور نامور فاضل سید حسام الدین راشدی صاحب کو علمی و تحقیقی کاموں خصوصاً قدیم و نایاب مخطوطات کو ایڈٹ کرنے میں بڑی مہارت ہے، وہ ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابیں ایڈٹ کر چکے ہیں، اور اب انھوں نے دسویں صدی ہجری کے ایک صاحب کمال مصنف و شاعر سلطان محمد فخری کے دو تذکرے روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب اور دیوان ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، پہلے تذکرہ میں ان سلاطین و امرا کے حالات ہیں جنھوں نے فارسی یا ترکی زبان میں شاعری کی ہے، اس تذکرہ کو ابھی تک فخری کے بجائے دوسرے مصنف کی تصنیف خیال کیا جاتا تھا اور غیر مطبوعہ تھا، اس کے جن پانچ قلمی نسخوں کا پتہ چل سکا ہے، ان میں سے اکثر سے لائق مرتب نے تصحیح کے دوران مدد لی ہے، دوسرے تذکرہ میں ان خواتین کا ذکر ہے جنھوں نے فارسی زبان میں شعر کہے ہیں، یہ تذکرہ دو بار نولکشور پریس لکھنؤ اور سہ ماہی رسالہ اردو اورنگ آباد کے جولائی ۱۹۳۳ء کے شمارہ میں حکیم سید شمس اللہ قادری کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ چھپ چکا ہے لیکن راشدی صاحب نے اس کو مطبوعہ اور قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھکر بڑے اہتمام اور مزید صحت کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ دونوں تذکرے گو مختصر اور زیادہ پر از معلومات نہیں لیکن اپنی منفرد نوعیت اور مختلف وجہوں سے بڑے اہم ہیں، پہلے سے کئی امراء و سلاطین کی شعر گوئی کا علم ہوتا ہے اور دوسرے میں متعدد ایسی شاعرہ خواتین کا ذکر ہے جن کے ذکر سے دوسری کتابیں خالی ہیں،

فخری کا دیوان نایاب ہے، راشدی صاحب نے اس کی بعض کتابوں سے ایک سو ایک غزلیں جمع کرکے تذکروں کے آخر میں شامل کر دی ہیں، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک مبسوط اور پرمغز مقدمہ اور آخر میں محققانہ تعلیقات بھی ہیں، مقدمہ میں بڑی تلاش و تحقیق سے فخری کے حالات و واقعات، اس کے سندھ آنے اور یہاں کے امراء و سلاطین سے توسل اور اس زمانہ کے سندھ

کے سیاسی و معاشرتی حالات اور فخری کی تصنیفات کے متعلق مفصل معلومات اور اس کے اور اس کی تصنیفات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، تعلیقات میں ان اشخاص و مقامات کے متعلق ضروری معلومات دیے گئے ہیں، جن کے نام متن میں آئے ہیں، آخر میں اشخاص، اماکن اور کتب کا مکمل اشاریہ ہے، فاضل مرتب کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ان کی تلاش و تحقیق، حسن ترتیب اور حسن مذاق کا نمونہ ہیں، اور وہ اس مفید علمی خدمت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تاریخ کوکن ۔ مرتبہ ڈاکٹر مومن محی الدین ایم اے پی ایچ ڈی (اڈنبرا) متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۹۳ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۵/۹
پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ نزد جے، جے، ہسپتال بمبئی ۳

یہ کتاب دکن کے مغربی ساحلی علاقہ کوکن کی اشوک کے دور سے لیکر شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ تک کی سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ اور پندرہ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے تین ابواب میں کوکن کی قدیم تاریخ، اس زمانہ کے راجاؤں کے واقعات اور سیاسی و تمدنی حالات ہیں، پھر مسلمانوں کی آمد اور اس زمانہ کی نومسلم قوموں اور بیرونی ملکوں کے نوآباد مسلمانوں کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں اس دور کی کوکن کی علمی و دینی حالت اور زبان وغیرہ کا ذکر بھی ہے، پھر خلجی، تغلق اور بہمنی حکومتوں کی شکست و ریخت، مسلم عہد حکومت کے زرعی حالات، طرز معاشرت، اسلامی تہذیب و ثقافت کے خصوصیات و اثرات اور کوکن کے مختلف حصوں کے لوگوں کی تہذیب، معاشرت اور بول چال کا فرق دکھایا گیا ہے، چند ابواب میں پرتگیزیوں اور فرانسیسیوں کے کوکن پر تسلط، استبداد اور مظالم کی داستان اور مغلوں اور مرہٹوں کی معرکہ آرائیوں اور انگریزوں

کے ہندوستان پر ابتداءً قبضہ کرنے کی روداد بیان کی گئی ہے، آخر کے دو ابواب میں کوکن کے بعض مشہور اشخاص اور اہم مقامات کا تذکرہ ہے، یہ کتاب اگرچہ محنت سے لکھی گئی ہے اور کوکن کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مصنف نے اس میں لفاظی اور انشاپردازی کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ تاریخی اور تحقیقی کتابوں کے لیے موزوں نہیں ہے کہیں کہیں لسانی حیثیت سے بعض غلطیاں بھی ہیں، مثلاً "صنادید کوکن" کے زیر عنوان کوکن کی مشہور عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اس کو "آثار صنادید کوکن" ہونا چاہیے تھا "مشاہیر کوکن" کے زیر عنوان صرف شیواجی اور نواب معتبر خاں کا ذکر ہے، شیواجی اور مرہٹوں کی مدح سرائی اور مغلوں کی بربریت و سفاکی اور عالمگیر کی مذہبی عصبیت اور سخت گیری وغیرہ کے ذکر میں مصنف کا قلم جا بجا حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے

بنگال کا اردو ادب:۔ مرتبہ پروفیسر جاوید نہال صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۶۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے ناشر اردو رائٹرس گلڈ ۱۸/۱ فیرس لین، اسرار منزل کلکتہ ۱۲۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح بنگال بھی اردو زبان کے فیض و اثر سے محروم نہیں ہے، انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں وہ تنہا حکومت ہی کا نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کا بھی مرکز تھا، اور اردو میں سلیس نثر نگاری کی باقاعدہ ابتدا انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام ہی سے ہوئی، لیکن ابھی تک بنگال کی ان ادبی و لسانی خدمات کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی، اور نہ فورٹ ولیم کالج ہی کے متعلق کوئی مستقل کتاب موجود تھی، زیر نظر کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن اس میں صرف مغربی بنگال کے انیسویں صدی میں ادبی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اس لیے اس کا زیادہ حصہ فورٹ ولیم کالج

کے حالات و خدمات پر مشتمل ہے، اس میں کالج کی مختصر تاریخ، اس کی اہمیت اور اس سے وابستہ یورپین اور ہندوستانی مصنفین و مترجمین کے علاوہ ان مصنفین کے حالات، ادبی کمالات اور تصنیفات وغیرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جو کالج کے ملازم تو نہ تھے مگر انھوں نے بھی انعام حاصل کرنے کے لیے کتابیں تصنیف یا ترجمہ کی تھیں۔ آخر میں بنگال کے بعض ادبی مرکزوں مرشد آباد، ہوگلی، سیرام پور، مٹیا برج اور کلکتہ کی ادبی سرگرمیوں، مصنفوں اور شاعروں کے حالات اور ادبی کارنامے بیان کیے گئے ہیں، شروع میں بنگال میں اردو زبان کی ابتدا اور عہد بعہد ارتقا کا مختصر تذکرہ اور اسی ضمن میں بنگال کی سیاسی، تاریخی اور اخلاقی حالت اور بنگالی زبان کے متعلق بھی مفید معلومات دیے گئے ہیں، لیکن مصنف بعض تفصیل و تحقیق طلب مقامات سے بہت سرسری گذر گئے ہیں، اور کتابوں کے تعارف و تبصرے میں ان کی خامیوں سے بہت کم بحث کی ہے، تاہم کتاب چھان بین اور خوش سلیقگی سے لکھی گئی ہے، اور وہ اردو زبان کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے۔

نجوم رسالت حصۂ اوّل - مرتبہ ڈاکٹر علیم الدین صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۰۰، قیمت عہ، پتہ: (۱) مکتبہ اسلامی ادب اللہ پورہ (فاطمان) بنارس (۲) ڈاکٹر علیم الدین صاحب، [illegible] بنارس۔

چند سال پہلے بنارس میں بزم سیرت صحابہ کے زیر اہتمام ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی تھی، اس میں مختلف اصحاب شعر و سخن نے رسالت کے محرمان خاص کی بارگاہ میں نذرانۂ خلوص و عقیدت پیش کیا تھا، یہ گلدستۂ اشعار نعتیہ بزم مشاعرہ کے قصائد، نعت و منقبت سے سجایا گیا، اور شمع رسالت کے چالیس جان نثار پروانوں کے منظوم فضائل و مناقب پر مشتمل ہے، گو فنی حیثیت سے یہ قصائد زیادہ بلند نہیں ہیں اور اکثر شعرا غیر معروف ہیں تاہم ان میں صحابہ کرام اور صحابیات کے فضائل پر خلوص اور معتدل انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اور ان سے ان کی سیرت و کردار کے بعض دلکش پہلو سامنے آتے ہیں، اس لیے ان کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہے۔

قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان حصہ اول و دوم۔ مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب، تقطیع خورد،
کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات بالترتیب ۳۰ مجلد و ۴۰ غیر مجلد، قیمت ہر دو حصہ ۶؍م
پتہ: (۱) مسلمانوں کا سوشلسٹ سینٹر ڈی ۱۹۰۔ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۳ (۲) انسٹی ٹیوٹ
آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۰۰۷، کلاں محل، دہلی ۶۔

پہلا کتابچہ لائق مرتب اور ظفر امام صاحب کے دو فکر انگیز مقالوں اور دوسرا سولہ اصحاب علم و قلم کی ان تقریروں پر مشتمل ہے، جو نومبر ۶۸ء میں دہلی کے ایک سیمینار میں کی گئی تھیں، پہلے میں ہندوستان کے قومی کلچر کے بعض پہلوؤں کی وضاحت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے رول کا ذکر ہے، اور دوسرے میں اسی موضوع کے بارہ میں مولانا ابوالکلام مرحوم کے نقطۂ نظر کی مقررین نے توضیح کی ہے، دونوں کتابچوں میں مجموعی حیثیت سے معتدل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، تاہم بعض باتیں کھٹکتی ہیں، دوسرے کتابچہ میں فاضل مرتب نے موجودہ مسلم قیادت اور جماعتوں کا دلچسپ اور مبصرانہ تجزیہ کیا ہے لیکن مضمون کے آخر میں غیر معتدل باتیں بھی آگئی ہیں۔

صحرا میں اذان۔ از جناب گوپال متل صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ،
خوبصورت سرورق، صفحات ۱۱۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۷؍ پتہ: مکتبہ تحریک ع ۹
انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

جناب گوپال متل اڈیٹر تحریک اردو کے مشہور صاحب قلم اور مشاق شاعر ہیں، یہ انکا نیا مجموعۂ کلام ہے، کمیونزم کا انکا خاص مسلک ہے، اس مجموعہ میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے، موجودہ حالات سے وہ بددل ہیں اور انھوں نے صحرا میں اذان دینے کی کوشش کی ہے، انکو اصل مناسبت غزل سے ہے، اسلیے اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، اور انھوں نے غزل کے روایتی اسلوب و انداز کو اپنے مخصوص رنگ اور نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اس مجموعہ میں آزاد اور پابند نظمیں بھی ہیں، اور ان سے بھی شاعر کی فن پر قدرت، جذبات و احساسات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، مجموعی حیثیت سے متل صاحب کی شاعری کیفیت، جدت ادا، جوش بیان، طنز و ظرافت اور فکر و خیال کی رعنائی و تازگی سے معمور ہے، اور اس مجموعہ کی ظاہری صورت بھی نہایت پرکشش اور جاذب نظر ہے۔

"ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱. اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: [illegible]

۲. اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " [illegible]

۳. اسوۂ صحابیات: " [illegible]

۴. تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: [illegible]

۵. حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: [illegible]

۶. حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: [illegible]

۷. شعر الہند (حصہ اول) " [illegible]

۸. شعر الہند (حصہ دوم) " [illegible]

۹. انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کی ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: [illegible]

۱۰. سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱. امام رازی: امام فخر الدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت [illegible]

۱۲. ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳. اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفہ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت [illegible]

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و تحقیقی، تاریخی و تنقیدی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۶ قیمت: [illegible] منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تما
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس
مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا ا
نسل و رنگ و بلا لحاظ ادو یوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقش
مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب
انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابو
کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ
اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے
لئے جنت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں ک
درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت
پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں
غیر مسلم رعایا کے حقوق حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں
دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون
ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے، قیمت :- ۵۰/ روپے

مینیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)
اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

جلد ۱۰۶ ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

جمال عبدالناصر کی موت دنیائے عرب کا بہت بڑا حادثہ ہے، مدتوں کے بعد عربوں میں اتنا بڑا لیڈر پیدا ہوا تھا، ان کی پوری زندگی قوم و وطن کی راہ میں ایک جہد مسلسل تھی، اس راہ میں جان تک دیدی، انھوں نے عربوں میں آزادی کی روح پھونکی، مصر کو شخصی بادشاہت سے نجات دلائی، سامراجی طاقتوں سے ٹکرلی، برطانوی اثر و اقتدار سے سرزمین مصر کو آزاد کرایا، نہر سویز کو قومیانے کے انتقام میں فرانس، برطانیہ و اسرائیل کے متحدہ حملہ کو ذلت آمیز شکست دی اسوان بند تعمیر کرایا، ان کے علاوہ اور بہت سے تعمیری کام کئے، ان کارناموں نے اُن کو دنیا کے بڑے لیڈروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، وہ اپنی قوم میں اس قدر مقبول و محبوب تھے کہ اگر اُن کی جگہ کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو ۶۷ء کی شکست کے بعد اس کا زوال یقینی تھا، لیکن اس کے بعد بھی اُن کی مقبولیت میں فرق نہ آیا، اُن سے بعض سیاسی اور مذہبی غلطیاں بھی ہوئیں، جن سے عرب اتحاد اور خود اُن کے ملک اور اُن کی شہرت کو نقصان پہنچا، لیکن ان کی مذہبی غلطیاں، مذہب کی مخالفت یا اُس سے آزادی کے بجائے اس دور کی لادینی سیاست کا نتیجہ تھیں جس سے کوئی اسلامی ملک بھی محفوظ نہیں، خصوصاً جن کی سیاست میں غیر مسلم بھی دخیل ہیں، مگر ان غلطیوں کے مقابلہ میں اُن کے کارنامے زیادہ ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے اچھے اعمال کے طفیل میں اُن کی مغفرت اور اُن کی لغزشوں سے درگذر فرمائے، اُن کی زیر تعمیر مسجد میں اُن کی تدفین بھی اُن کے حسنِ خاتمہ کے لئے فال نیک ہے، اُن کی موت سے عرب دنیا ایک ایسے لیڈر سے محروم ہو گئی، جس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی،

....

اس وقت چند ملکوں کو چھوڑ کر انڈونیشیا سے لیکر افریقہ تک پوری اسلامی دنیا آپس کے اختلاف و انتشار کا شکار ہے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، اور سب سے زیادہ عرب ملک اس میں مبتلا ہیں جو اتحادِ اسلامی

اور وحدتِ ملی کے اولین حامل تھے، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چند لاکھ یہودیوں نے عربوں کی سرزمین پر قبضہ کرلیا، اور کروڑوں عرب اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکے، یہ صحیح ہے کہ یہودیوں کی پشت پر امریکہ کی قوت ہے لیکن وہ کب تک اُن کی پشت پناہی کرسکتا ہے، اگر عرب حکومتوں میں اتحاد ہوتا تو یہودیوں کو فلسطین میں پناہ نہ ملتی مگر اس سے بھی اُن کو سبق حاصل نہیں ہوتا، اُن کے اختلافات کا سب سے عبرت انگیز نمونہ اہل اردن اور فدائیوں کی برادرکشی ہے جس کا سلسلہ مصالحت کے بعد بھی ختم نہیں ہوا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، عربوں میں صرف ناصر کی شخصیت ایسی تھی جو اس قسم کی گتھیوں کو سلجھا سکتی تھی، ان کے بعد کوئی شخصیت نظر نہیں آتی، اس لئے اُن کی موت کا اثر پورے مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر پڑے گا، معلوم نہیں وہ آیندہ کیا رُخ اختیار کرتی ہے، اللہ تعالیٰ عربی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں سے انکو محفوظ رکھے۔

..... ✽ .....

ہندوستان کے سیکولر نظامِ حکومت کی خوبیاں اپنی جگہ مسلم ہیں، مگر کچھ مسلمانوں نے سیکولرزم کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ تصوف و صوفیہ کو بھی اُس کے حلقہ میں لے لیا ہے، اور اس کی کوشش مستقل جاری ہے کہ ہندوستان کے صوفیہ اور اُن کی تعلیمات کو سیکولر ثابت کیا جائے یعنی اُن کی نگاہ میں کفر و اسلام برابر تھے، اسلامی عقائد و عبادات کو وہ زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، وہ صرف انسانی محبت کے داعی و مبلغ تھے، اس سے زیادہ صریح بہتان ان نفوسِ قدسیہ پر نہیں ہو سکتا، ان متصوفین کا ذکر نہیں، جن کو حقیقۃً تصوف سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور وہ صرف صوفیوں کے لباس میں ہُو حق کے نعرے لگاتے تھے، اکابر صوفیہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کا زندہ پیکر، بلکہ ان کے سب سے بڑے معلم و مبلغ تھے، انہی کے بدولت ہندوستان میں اسلام پھیلا جس کا اعتراف غیر مسلم مورخین تک کو ہے، اُن کا قدم کتاب و سنت کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا تھا، وہ نہ صرف اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال بلکہ سنن و نوافل و مستحبات کی پابندی تک پر زور دیتے تھے، اُن کے اسلام کا معیار فقہی

معیار سے بہت اونچا تھا جس پر اُن کی تصانیف اور ملفوظات شاہد ہیں، اور جن سے ہر صاحب علم واقف ہے۔

....

البتہ ان میں فقیہانہ تشدد کے بجائے انسانی محبت میں وسعت اور رواداری تھی، ان کا دروازہ مسلم و غیر مسلم سب کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کھلا ہوا تھا، وہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی محبت سے پیش آتے تھے، جو ایک مبلغ کے لئے ضروری ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کی تالیف قلب کیلئے ان کے ساتھ بڑی نرمی اور رواداری برتتے تھے، جو غیر مسلم وفود آپ کے پاس آتے تھے، اُن کی میزبانی فرماتے اُن کو مسجد نبوی میں ٹھہراتے اور اس میں عبادت تک کرنے کی اجازت دیدیتے، حدیثوں میں بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم ہر انسان کے ساتھ رحم و کرم، لطف و مدارات اور احسان و سلوک کی تعلیم ہے، صوفیہ کا عمل بھی اسی پر تھا، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُن کی نگاہ میں کفر و اسلام برابر تھے اگر ایسا ہوتا تو وہ اسلام کی تبلیغ کیوں کرتے۔

....

دوسرے صوفیہ اتباع شریعت اور اس کے ظاہری احکام کی پابندی کے ساتھ اُس کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں یعنی اخلاص و احسان وغیرہ پر زیادہ زور دیتے تھے، جو دین کا مغز ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کو صوفیہ یا ان علماء نے زندہ رکھا جو صوفی بھی تھے، کامل اسلام اس کے ظاہری قوانین اور اس کی روح دونوں پر عمل کا نام ہے، اکابر صوفیہ کی تصانیف میں کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے، جو شریعت کے خلاف یا ان معنوں میں سیکولر ہو جن معنوں میں سیکولر مسلمان اس کو پیش کرتے ہیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد سے نام نہاد مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو غیر مسلموں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے نہ صرف تصوف و صوفیہ بلکہ اسلام کو غلط رنگ میں پیش کر رہا ہے، اور اس کی قیادت ان اداروں کے ذمہ دار کر رہے ہیں جن کے ساتھ "اسلامیت" کا دم چھلا لگا ہوا ہے لیکن دین سے واقف مسلمان اس کو ہفوات سے زیادہ وقعت نہیں دیتے،

مقالات

ادبی سرقات
کلامِ غالب کی روشنی میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

غالبؔ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جھنجھلا اٹھنے والوں میں مرزا واجد حسین یگانہؔ (المتوفی ۱۹۵۵ء) کا نام بہت نمایاں ہے، وہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۰۳ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول گلزار باغ پٹنہ سے انٹرنس پاس ہوئے، ان کا خود بیان ہے کہ استاد المکرم فخرالمتاخرین جناب خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاؔد کی آغوش میں تربیت پائی، شروع میں یاسؔ تخلص کرتے تھے، اسلیے ایک عرصہ تک یاسؔ عظیم آبادی کے نام سے چھپتے رہے، ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تو یہیں منتقل ہوگئے، یہاں مرزا انیسؔ کے پوتے حضرت رشید رضا صاحب سے مشورۂ سخن کرنے لگے، اور اپنے کو یاسؔ عظیم آبادی ثم لکھنوی کہنے لگے، یاس سے یگانہ ہوگئے، پھر یگانہ کے آگے علیہ السلام بڑھا دیا، پھر یگانہ چنگیزی ہوگئے، اپنی کتاب "غالب شکن" کو چنگیز خاں کے نام سے ان الفاظ میں معنون کیا:۔

بجناب ہیبت مآب، دیوتائے جلال وعتاب پیغمبر قہر وعذاب، دشمن تہذیب پرفن

حق شناس، باطل شکن مرد میدان، گبیر و بزن شہنشاہ بنی آدم سرتاج سکندر دوم حضرت چنگیز خاں اعظم قہراللہ

اور اپنی چنگیزیت میں خوش تھے کہ "وہ ارگھونسوں کے داد وصول لیتے ہیں"۔ (غالب شکن ص ۴)

لکھنؤ کے شعرا، مثلاً صفی، عزیز، ثاقب اور محشر وغیرہ سے ان کی بڑی معرکہ آرائی ہوئی، انھوں نے ان کا بائیکاٹ کیا۔ تو اس کو وہ اپنی فتح و کامرانی سمجھتے رہے، جیسا کہ لکھتے ہیں:

تمام شعرائے لکھنؤ عاجز آکر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہوئے، سامنے آنا منہ دکھانا چھوڑ دیا، ذرہ غور تو کیجئے، اس سے بڑھ کر داد اور کیا ہوگی۔ بائیکاٹ کا فلسفہ تو یہی ہے کہ روز دا جوا دشمن جب ہر طرف سے عاجز آجاتا ہے، کوئی کاٹ نہیں کر سکتا، تو بائیکاٹ کے حربہ پر اتر آتا ہے۔ (ص)

اپنی اس خود پرستی میں خوش تھے کہ "انھوں نے غوغائیان لکھنؤ کے منہ کیل دیے بولتی مار دی"۔ (ص ۱۳) لیکن اس دعویٰ کے باوجود ان کو لکھنؤ کے غوغائیوں سے پریشانیاں بھی اٹھانی پڑیں، وہ خود ہی لکھتے ہیں:۔

عزت کو میں نے لکھنؤ میں ...... قربان کر ڈالا، کیا کیا گالیاں کھائیں، مغلظات، کیا کیا ہجو یں سنیں، کیا کیا مادی نقصان اٹھائے، لگی لگائی روزی، اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑی .... آجکل اپنے وطن میں ساٹھ روپئے کی ملازمت ایک صاحب اہل و عیال کے لیے بڑی قیمتی چیز ہے، ایسی ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کر دینا پڑا، اس زمانہ میں (کہ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں، کیونکہ شاعری ایک سند سمجھی جاتی ہو، نکمے پن کی شاعری گویا عقل و خرد سے بالکل بےگانہ ہے، دنیا کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا) کوئی آسان کام نہیں۔" (ص ۱۱ - ۱۰)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان جھگڑوں میں جن کو وہ آرٹ کے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کی

کوشش تصور کرتے رہے، ان کو پورب پچھم اتر دکھن کے کٹے کنکوے کی طرح تپاتے پھرنا پڑا،
یہاں تک کہ لاتور دکن کے رجسٹرار ہو گئے۔

لیکن معلوم نہیں کس اصول اور ضمیر پرستی کی بنا پر اپنے تخلص کے ساتھ علیہ السلام لکھنا
شروع کیا، اور دوسروں سے اپنے کو A living mind of The east کہلوایا،
ان کے کلام کے مجموعہ آیات وجدانی کے شروع میں مرزا مراد بیگ شیرازی نے
"محاضرات" لکھا ہے، اس میں غالباً یگانہ ہی نے ان سے یہ لکھوایا،

"بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان نے تین افراد کامل پیش کیے ہیں، جنکے
نام ایشیا کے سخنوران علی الاطلاق کی فہرست میں آب زر سے لکھے جائیں گے، .....
اول دو شخصوں سے میری مراد مولانا شاید اکبر آبادی؟ اور حضرت مرزا یگانہ لکھنوی
المعروف بہ مرزا یگانہ یاس عظیم آبادی سے ہے، اور تیسری شخصیت سر رابندر ناتھ ٹیگور
کی ہے، جو ذی کمال ہونے کے علاوہ مادی زندگی اور شہرت عامہ کے اعتبار سے خلاف
معمول کامیاب ثابت ہوئے" (آیات وجدانی ص ۴۴)

یہ تحریر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی، لیکن مرزا یگانہ کا جو انجام ان کی وفات سے پہلے ہوا،
وہ ناظرین بھولے نہ ہوں گے، وہ لاتور دکن سے پنشن پاکر لکھنؤ واپس آئے، تو انکی دریدہ ذہنی
اور دشنام طرازی اتنی بڑھ گئی کہ وہ آخر میں شاتم رسولؐ بھی ہو گئے، غالباً ۱۹۵۲ء
کا سال تھا کہ ایک روز وہاں کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ باہر آئے
تو کسی بہانے سے ان کو ایک گدھے پر بٹھا دیا، جوتوں کا ہار پہنایا، ان کے منہ پر سیاہی لگا دی گئی،
ان پر تھوکا، بازار میں گھمایا، اور "شاتم رسول پر لعنت ہو" کے نعرے لگائے، وہ ایک زمانہ میں
خوش تھے کہ انھوں نے غوغائیانِ لکھنؤ کے منہ کیل دیے، بولتی مار دی تھی لیکن ان ہی غوغائیان

حق شناس، باطل شکن مرد میدان، گیرد و زن شہنشاہ بنی آدم، سرتاج سکندر، وجم حضرت چنگیز خاں اعظم قہراللہ

اور اپنی چنگیزیت میں خوش تھے کہ "وہ ار گھونسوں کے داد وصول لیتے ہیں"۔ (غالب شکن ص ۴)

لکھنؤ کے شعرا، مثلاً صفی، عزیز، ثاقب اور محشر وغیرہ سے ان کی بڑی معرکہ آرائی ہوئی، انھوں نے ان کا بائیکاٹ کیا، تو اس کو وہ اپنی فتح و کامرانی سمجھتے رہے، جیسا کہ لکھتے ہیں:

"تمام شعرائے لکھنؤ عاجز آکر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہوئے، سامنے آنا منہ دکھانا چھوڑ دیا، ذرہ غور تو کیجیے، اس سے بڑھ کر داد اور کیا ہوگی، بائیکاٹ کا فلسفہ تو یہی ہے کہ روندا ہوا دشمن جب ہر طرف سے عاجز آجاتا ہے، کوئی چوٹ نہیں کرسکتا، تو بائیکاٹ کے حربہ پر اتر آتا ہے۔"

اپنی اس خود پرستی میں خوش تھے کہ "انھوں نے غوغائیان لکھنؤ کے منہ کیل دیے بولتی مار دی"۔ (ص ۱۳) لیکن اس دعوی کے باوجود ان کو لکھنؤ کے غوغائیوں سے پریشانیاں بھی اٹھانی پڑیں، وہ خود ہی لکھتے ہیں:۔

"عزت کو میں نے لکھنؤ میں...... قربان کرڈالا، کیا کیا گالیاں کھائیں، مغلظات، کیا کیا ہجویں سنیں، کیا کیا مادی نقصان اٹھائے، لگی لگائی روزی، اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑی..... آجکل اپنے وطن میں ساٹھ روپے کی ملازمت ایک صاحب اہل و عیال کے لیے بڑی قیمتی چیز ہے، ایسی ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کر دینا پڑا، اس زمانہ میں (کہ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں، کیونکہ شاعری ایک سند سمجھی جاتی ہے، نکمے پن کی شاعری گویا عقل و خرد سے بالکل بے گانہ ہے، دنیا کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا) کوئی آسان کام نہیں"۔ (ص ۱۱-۱۰)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان جھگڑوں میں جن کو وہ آرٹ کے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کی

کوشش تصور کرتے رہے، ان کو پورب پچھم اتر دکھن کٹے کنکوے کی طرح تپاتے پھرنا پڑا، یہانتک کہ لاتور دکن کے رجسٹرار ہو گئے۔

لیکن معلوم نہیں کس اصول اور ضمیر پرستی کی بنا پر اپنے تخلص کے ساتھ علیہ السلام لکھنا شروع کیا، اور دوسروں سے اپنے کو A living mind of The east کہلوایا، ان کے کلام کے مجموعہ آیات وجدانی کے شروع میں مرزا مراد بیگ شیرازی نے "محاضرات" لکھا ہے، اس میں غالباً یگانہ ہی نے ان سے یہ لکھوایا،

"بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان نے تین افراد کامل پیش کیے ہیں، جنکے نام ایشیا کے سخنوران علی الاطلاق کی فہرست میں آب زر سے لکھے جائیں گے،..... اول دو شخصوں سے میری مراد مولانا شاید اکبر آبادی؟ اور حضرت مرزا یگانہ لکھنوی المعروف بہ مرزا یگانہ یاس عظیم آبادی سے ہے، اور تیسری شخصیت سر رابندر ناتھ ٹیگور کی ہے، جو ذی کمال ہونے کے علاوہ مادی زندگی اور شہرت عامہ کے اعتبار سے خلاف معمول کامیاب ثابت ہوئے" (آیات وجدانی ص ۴۴)

یہ تحریر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی، لیکن مرزا یگانہ کا جو انجام ان کی وفات سے پہلے ہوا، وہ ناظرین بھولے نہ ہوں گے، وہ لاتور دکن سے پنشن پا کر لکھنؤ واپس آئے، تو انکی دریدہ دہنی اور دشنام طرازی اتنی بڑھ گئی کہ وہ آخر میں شاتم رسولؐ بھی ہو گئے، غالباً ۱۹۵۲ء کا سال تھا کہ ایک روز وہاں کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ باہر آئے، تو کسی بہانے سے ان کو ایک گدھے پر بٹھا دیا، جوتوں کا ہار پہنایا، ان کے منہ پر سیاہی لگا دی، ان پر تھوکا، بازار میں گھمایا، اور "شاتم رسول پر لعنت ہو" کے نعرے لگائے، وہ ایک زمانہ میں خوش تھے کہ انھوں نے غوغائیان لکھنؤ کے منہ کیل دیے، بولتی مار دی تھی، لیکن ان ہی غوغائیان

نے ان کی آخری زندگی میں ان کی بولتی اور ادی؟ اور شاید اسی غم میں وہ ۱۹۵۶ء میں اس دنیا سے چل بسے۔

ان کو یہ رسوائی ان کے خیال میں حق پرستی، فرض شناسی اور اصول پرستی کی خاطر اٹھانی پڑی، ان کا دعویٰ رہا کہ ان کی تخریب میں تعمیر مضمر رہی، لیکن اس تخریب سے وہ خود پرست ضرور ہو گئے، انھوں نے اپنے کو رابندر ناتھ ٹیگور کی صف میں لا کر ضرور کھڑا کر دیا تھا، مگر ان کو احساس رہا کہ ان کی وہ قدر نہیں ہوئی جو رابندر ناتھ ٹیگور کی ہوتی رہی، اس لیے وہ اس یاس میں باغی بلکہ چنگیزیت پر اتر آئے، اور گو لوگ ان کو سڑی، سودائی، پریشان روزگار، آوارۂ کوچہ و بازار سمجھتے رہے لیکن وہ اپنے کو یکتائے زمانہ، شیر دل، بات کا دھنی، سخور بالا دست اور نشۂ کمال میں مست تصور کرتے رہے۔

اسی نشۂ کمال کی مستی میں غالب شکنی کا بیڑا اٹھایا، گو ان کے مداح مرزا مراد بیگ شیرازی نے ان کی زندگی ہی میں لکھا تھا کہ مرزا صاحب خواجہ آتش کے فدائیوں میں اور غالب کے بھی بڑے معتقد تھے، مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے حریف جو غالب کے مرتبے سے ناآشنا ہیں، جھوٹ موٹ غالب کی تعریفیں کیا کرتے ہیں، اور خواہ مخواہ خواجہ آتش کے منہ آیا کرتے ہیں، تو پھر مقامی ضرورتوں نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ غالب کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے، یہیں سے غالب پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور یہیں سے مرزا یاس کی خود پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ (آیاتِ وجدانی ص ۱۳-۱۲)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس ادبی ریفارمر نے غالب پر نکتہ چینی لکھنؤ والوں کی فرعونیت کی سرکوبی کی خاطر کی (ص ۲۱) مگر لکھنؤ والوں کی "حماقت اور فرعونیت" کے لیے غالب کو تختۂ مشق بنانا کہاں تک درست تھا؟ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے بیس سال تک (غالب شکن ص ۱۵)

جو لب و لہجہ اختیار کیا، وہ کسی استاد فرزانہ، یکتائے زمانہ اور باکمال سخنور کے شایان شان نہیں ہو سکتا۔

غالب کے خلاف ان کا پہلا مضمون غالباً ۱۹۱۵ء میں ہاپوڑ کے ایک رسالہ خیال میں شائع ہوا جس میں انھوں نے آتش اور غالب کی ایک غزل کا موازنہ کرکے آتش کی برتری ثابت کی ہے، یہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا، ۶۰-۱۹۵۹ء اور ۶۱-۱۹۶۰ء کے علی گڈھ میگزین میں یگانہ کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ شائع ہوا تھا، یہ خود نوشت سوانح عمری ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی ہو جو غالباً نامکمل رہی، اس پر انھوں نے غالب کے ایک شعر پر بہت ہی فاضلانہ تنقید کرکے آخر میں آتش کو اونچا دکھایا ہے، اس تنقید کے کچھ حصے یہاں درج کرنے کے لائق ہیں، اگر اس سے طوالت پیدا ہو جائے تو ناظرین اس کو دلچسپ اور پُر مغز سمجھ کر معاف کریں، غالب کا ایک شعر ہے:

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

یگانہ جو اس خود نوشتہ سوانح عمری کے وقت یاس تھے، لکھتے ہیں، جناب حسرت موہانی اس شعر کی شرح بس اس قدر کرتے ہیں کہ یہ شعر ویسا ہی ہے جیسے غالب کا ایک دوسرا شعر ہے:

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

جناب حسرت کے اس اختصار کی داد نہیں دی جا سکتی، غالباً جناب موصوف اس شعر کے اصل معنی سمجھ نہ سکے اور نہ کوئی دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی، ایک دوسرا شعر نقل کرکے ٹال دیا ہے، مگر حیرت تو یہ ہے کہ تشریح و توضیح کے لیے جو شعر نقل کیا گیا ہے اس کی نوعیت مضمون بالکل جداگانہ ہے، کیونکہ

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا۔

یہاں پری رو یعنی معشوق کا خود عاشق ہونا دکھایا گیا ہے، اور گلہائے تازہ والے شعر میں معشوق کا عاشق ہونا نہیں بلکہ عاشق کے رنگِ شکستہ کو دیکھ کر معشوق کا محوِ ناز ہونا ثابت ہوتا ہے، جناب حسرتؔ موہانی نے جو شعر اس کی شرح میں نقل کیا ہے، وہ مقتضائے مقام کے خلاف ہے۔

حسرتؔ پر یہ تنقید کرکے یاسؔ یگانہ: اس شعر کی جو شرح مولانا سید حیدر علی طبا طبائی نے کی ہے، اس کو نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں،

طباطبائی: نظارہ اس کا یعنی معشوق کا موسمِ بہار ہے، اور اس کے نظارے سے میرا (عاشق کا) رنگ اڑ جاتا ہے، طلوعِ صبحِ بہار ہے، پھولوں کے کھلنے کا وقت ہے، غرض یہ ہے کہ ہر وقت نظارہ منہ پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر وہ (معشوق) سرگرمِ ناز ہوگا، یعنی میرا رنگ اڑنا وہ صبح ہے جس میں گلہائے ناز شگفتہ ہوں گے۔

یاسؔ: اگر اس شعر کے یہی معنی لیے جائیں تو بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر کی بندش بے ڈھنگی ہے، بات وہ کہنی چاہیے جو کہنے کے قابل ہو، اور اس طرح کہنا چاہیے جسے سن سکیں، ورنہ خاموشی بہتر ہے، اس شعر کا اور اس کی شرح کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ نظارۂ جمال سے عاشق کا رنگ اڑتے دیکھ کر معشوق کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے، اس بات کو صاف اور سلجھے ہوئے الفاظ میں بیان کرنا مشکل نہ تھا مگر غالبؔ نے اندازِ بیان میں وہ سنجیدگی اختیار کی یعنی رنگ اڑنے کو صبح سے استعارہ کرنا اور صبح کونسی صبحِ بہار، اور بہار کیسی بہارِ نظارہ اور پھر اس صبحِ بہارِ نظارہ کے لیے پھولوں کا کھلنا، پھول کونسے گلہائے ناز اور گلہائے ناز کے لیے شگفتن کی سی نامانوس لفظ (نامانوس باعتبارِ زبانِ اردو) جس سے سخن فہموں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ آیا یہ شعر کسی وہبی شاعر کا ہے یا اکتسابی شاعر کا، کیونکہ اس قسم کی بندشیں

وہی شاعر کی شان سے بعید ہیں، اور غالب کا دیوان ان ہی پیچیدہ بندشوں سے بھرا پڑا ہے کہ ذہن کو بجائے انبساط اُلٹا تکلیف سی محسوس ہوتی ہے، سیدھی طرف سے ناک نہ چھوٹی الٹی چال چلے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعر اکثر سیدھی راہ سے قطع نظر کر کے دوسری راہ اختیار کرتا ہے، اور اس کی یہ رفتار بعید دل پسند بھی ہوتی ہے، مگر اس رفتار خاص کے محل اور موقع ہوتے ہیں، ہر جگہ یہ روش پسندیدہ نہیں ہوتی ...... شاعر کو دیکھنا چاہیے کہ جو نئی راہ اختیار کی گئی ہے، وہ پسندیدہ اور مناسب مقام بھی ہے یا نہیں، غالب نے اس شعر میں اپنے مفہوم ذہنی کے ادا کرنے کے لیے جو استعارے پیدا کیے ہیں (یعنی رنگ اڑنے کے لیے صبح بہار نظارہ اور ناز کے لیے گل اور گل کے لیے شگفتن وغیرہ) وہ اس مقام خاص پر مذاق سلیم کے نزدیک بالکل مضحک ہیں، شاعر کو حسن کلام پر نظر رکھ کر سادگی و تکلف کی مختلف صورتوں میں امتیاز کرنا چاہیے، رنگ شکستہ اور بہار نظارہ وغیرہ یہ سب ترکیبیں اپنی اپنی جگہ فصیح و خوش آئین ہیں، مگر اس شعر میں ان کی ترکیب باہمی سے جو مصرعے پیدا ہوتے ہیں، وہ ذہن کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں ...... غالب کے اس شعر میں یہی عیب ہے کہ یہ سب الفاظ اپنی اپنی جگہ فصیح ہیں، مگر ترکیب باہمی سے مصرعے غیر فصیح ہو گئے ہیں۔ مولانا نظم طباطبائی نے جو اس شعر کی شرح کی ہے بالکل الگ ہے، یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ شعر مہمل ہے، ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق ایک معنی گڑھ لیتا ہے ورنہ اختلاف کیوں ہوتا، شعر وہی ہے جس کا ایک رخ کم از کم سب کی نظروں میں یکساں دکھائی دے، ہاں اس ایک معنی کے علاوہ اور بھی نزاکتیں پائی جائیں تو سبحان اللہ! اور اگر ایک رخ بھی صاف نظر نہیں آتا تو شعر مہمل ہے، خواہ مخواہ بھی استقرار معنی میں اختلاف واقع ہوگا، یہی الفاظ (رنگ شکستہ، صبح بہار، بہار نظارہ) اور لوگوں کے یہاں

بھی ملیں گے، مگر یہاں جس طرح سے صرف ہوئے ہیں اہل نظر کے نزدیک مضحک ہیں، مذاق سلیم کے دربار میں یہ الفاظ بزبان حال فریاد کر رہے ہیں کہ ہماری ذات میں صانع نے وہ قوت بخشی تھی کہ اگر صحیح مصرف لیا جاتا تو ہم دلوں کو مسخر کر لیتے، مگر کیا کریں مجبور ہیں، شاعر نے ہمارا صحیح مصرف نہ لیا، ہم کو ایسی ذلیل اور پست جگہ پر بٹھا دیا ہے، جہاں سے ہمارا حسن عیب نظر آتا ہے۔ زبان اردو الگ فریاد کرتی ہے کہ رنگ شکستہ کے بعد فارسی کا دوسرا ٹکڑا صبح بہار نظارہ اور پھر اسی کے بعد شگفتن کی اضافت کلہائے ناز پر وغیرہ نے مل کر میری مٹی خراب کر دی ہے، اس شعر کی شرحیں لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق کی ہیں۔

اس کے بعد یاس نے شوکت میرٹھی، واجد دکنی، فراغ دیوبندی وغیرہ کی شرحیں نقل اور ان کو رد کرکے آخر میں غالب کے شعر کے مقابلہ میں خواجہ آتش کا یہ شعر پیش کیا ہے:-

کیونکر وہ ناز میں نہ کرے بے نیازیاں اندازسے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا

اس پر یاس نے اپنی رائے لکھی ہے کہ زبان اردو کی نفاست کے ساتھ شعر میں اعلیٰ درجہ کی معرفت بھر دی ہے، حق یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا یہ شعر باعتبار معنی و لفظ عرش اعلیٰ کو پہنچا ہوا ہے، اور ایسا ہے کہ اہل حال کی صحبتوں میں پڑھا جائے تو لوگ وجد کرنے لگیں، غالب کے شعر میں معنوی خوبی اگر تسلیم بھی کر لیجائے تو الفاظ کا جامہ اتنا مضحک ٹھہرتا ہے کہ اردو زبان کے لیے باعث ننگ ہے، خواجہ صاحب چونکہ شاعر ہیں، اہل دل ہیں، اہل زبان ہیں، شاعری کا پورا پورا حق ادا کر دیا، خواجہ آتش کا شعر سو میں سو نمبر پانے کا مستحق ہے، اور غالب کا یہ شعر سو میں دس نمبر بھی مشکل سے پا سکتا ہے،

یگانہ کی مذکورۂ بالا رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن وہ غالب شکنی میں یہی طرز اختیار کرتے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بہت تو نہیں، مگر تھوڑا بہت کامیاب

ہو سکتے تھے لیکن وہ اپنے مقتضائے طبیعت سے مجبور ہو گئے، اور سنجیدہ تحریر لکھنے کے بجائے غالب پر مضحک رباعیاں لکھنے لگے، جو انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام ترانہ (۱۹۲۷ء) اور پھر بعد میں "غالب شکن" میں شائع کیں، ان میں سے کچھ رباعیاں یہ ہیں :-

دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سنے (۱) نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر غالب سے چچا چور نہ دیکھے نہ سنے

غالب کو میر سے بڑھانے والے (۲) چوروں کو بانس پہ چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے دنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

چنگیزی لہو ہے اپنی رگ رگ میں رچا (۳) مجھ سے جو تنے تو منہ کی کھاؤ گے بچا
غالب کو چچا بنا کے چھوڑا میں نے غالب میرے چچا، میں غالب کا چچا

شہزادے بڑے فرنگیوں کے پالے (۴) مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ غالب کو وطن پرست کہنے والے

غالب بھی ہے واللہ انوکھا صوفی (۵) انگریز کے دربار کا بھوکا صوفی
پنشن جو ہوئی بند تو بھوک اور کھلی ہے ایسا کوئی پیٹ کا بندہ صوفی

اللہ ری ہوا و ہوسِ خلعت و زر (۶) مرزا کا سر ہے اور انگریز کا در
ہاں کیوں نہ ہوں مورکھوں کے دیوتا غالب ہے باؤلے گاؤں اونٹ بھی پرمیشر

بعض رباعیاں تو ایسی ہیں کہ سنجیدہ تحریروں کے ساتھ نقل نہیں کیجا سکتی ہیں، انھوں نے اپنی نثری تحریروں میں بھی غالب کو برا بھلا کہنے میں غیر سنجیدہ انداز اختیار کیا ہے، پروفیسر مسعود حسن رضوی کو ایک خط لکھا تو اس کو اپنی کتاب غالب شکن میں بھی منسلک کر دیا ہے، اس میں وہ کہتے ہیں :-

"غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال، وقت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اونٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیوں میں گم ہوجایا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سرا بھی ہے، پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے، مضمون چرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کرسکتا، تصرف کی قدرت نہیں رکھتا، چوری کھل جاتی ہے، زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کرسکتا، ٹھونس کے تک بندی کرلیتا ہے"۔ (ص ۳)

"غالب کی لنگڑی شاعری کو بکی ہوئی ذہنیتیں حسن کمال پر محمول کرنے لگی ہیں" ص ۳

"غالب کو اردو زبان کا واحد نمایندہ ٹھہرانا اس کے کلام کو سراسر الہامی اور ایکل کہنا، حاشیہ نویسی و شرح نگاری کا دھندا اختیار کرنا مصنوعی پروپیگنڈا ادبی تجارت ہے"۔ (ص ۹)

"غالب شاعروں میں شاعر، رئیسوں میں رئیس، درباریوں میں درباری، صوفیوں میں صوفی، رندوں میں رند، فلاسفروں میں فلاسفر، سپاہیوں میں سپاہی، وطن پرستوں میں وطن پرست، آخر یہ ہے کیا بلا اس"۔ (ص ۱۶)

"غالب کا فلسفہ کیا بلا ہے، سوا اس کے کہ مرزا بیدل، مرزا صائب وغیرہ کے یہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اڑا لیتا ہے اور بس"۔ (ص ۱۹)

ان جملوں کے ساتھ ان کے قلم سے غالب کے کلام کے لیے کچھ تعریفی کلمات بھی نکل گئے ہیں، جن کی خبر شاید ان کو نہ ہوئی ہو، وہ پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ "غالب کی شاعرانہ چوری اور بھٹی کے علاوہ ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فطری جوہر اور اپنی اعلیٰ دماغی استعداد کا صحیح مصرف نہ لے سکے"۔ ان جملوں میں کم از کم غالب کے فطری جوہر اور اعلیٰ دماغی استعداد کا اعتراف تو کیا گیا، غالب کی شاعری کا جادو کسی نہ کسی طرح سر پر چڑھ کر بول ہی دیتا ہے، اسی کے بعد

وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گذر گیا۔ آج وہ مرزا جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے، کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں، کبھی نظیری کی، کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں، کبھی صائب کا، کبھی کسی کا، کبھی کسی کا۔ یہ شعر ان کے تلون کی چغلی کھاتا ہے

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اس کے بعد ان کے تعریفی کلمات یہ ہیں کہ "خدا بھلا کرے نکتہ چینوں کا جن کے تشدد سے تنگ آکر اخیر عمر میں میر تقی میر کو اپنا امام بنایا، جب کہیں راہ راست پر آئے، چنانچہ اپنے مکتوب میں خود اس امر کا اقرار کیا ہے کہ میں تو میر کے رنگ میں در آیا اور مومن خاں اپنی راہ چل پڑے، وہی آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کیا گیا ہے، غالب کی شاعری کی جان اور اردو لٹریچر کا سرمایۂ ناز ہے"۔ (ص ۲۱)

یگانہ نے اوپر جو کچھ کہا ہے، اس کا لب ولہجہ شائستہ اور مہذب ہوتا تو ممکن ہے ان کی باتیں توجہ سے سنی جاتیں۔ ان کی رباعیاں اور اس قسم کی نثری تحریریں شائع ہوئیں، تو کچھ لوگ کہتے کہ ان کے دماغ کا توازن درست نہیں، وہ ان کو جواب دیتے کہ دماغ تو اتنا صحیح ہے کہ دور سے بیٹھے بیٹھے اک ذرہ سی چونچ بتا دی اور ہزاروں غلچیوں کو سڑی بنا کر جامے سے باہر کر دیا (ص ۲۹)۔ اور اگر کوئی یہ کہتا کہ وہ یہ سب شہرت طلبی کیلئے لکھتے ہیں تو ان کو وہ یہ جواب دیتے کہ مرزا یگانہ تو وہ شخص ہیں کہ حصول شہرت و شوق ہر دلعزیزی تو کجا اپنے اعزاز عرفی کو گذشتہ بیں پچیس سال سے مسلسل نقصان پہنچا رہے ہیں، دونوں ہاتھوں سے اپنے اعزاز و وقار کو لٹاتے رہتے ہیں، دوستوں کو بھی دشمن بنا لینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ (ص ۲۷)۔ وہ غالب شکنی کو ادبی خدمت سمجھتے رہے

جیسا کہ لکھتے ہیں "غالب کی شان میں میری مزاحیہ رباعیاں اور غالب شکن گل افشانیاں بظاہر ادبی معصیت سہی، مگر وہ دن دور نہیں جب یہی معصیت ایک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے گی۔" یہ دعویٰ انھوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کے ایک مکتوب میں کیا تھا، جس کو لکھے ہوئے ۳۶ سال ہو گئے، اس درمیان میں غالب شکنی کیا ہوتی کہ غالب پرستی کا سیلاب اتنا بڑھا کہ مرزا یگانہ کا رسالہ غالب شکن اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتا نظر آتا ہے۔

انھوں نے اپنے اس رسالہ میں غالب پر چوریوں اور نقالیوں کے بھی الزامات رکھے ہیں، جس تلخ لب و لہجہ میں ان کو پیش کیا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ کیا واقعی وہ غالب کی شان میں گستاخی مقصود ہے، لیکن میں ایسا سڑی نہیں کہ مردوں پر طعن اور وہ اس دنیا میں موجود نہیں، میری آواز ان کے کانوں تک پہنچ نہیں سکتی، تو یہ طعنہ زنی کوئی مردانگی نہیں، محض دیوانگی ہوگی۔ ہاں غالب کے دل چلے جو غالب کو ایک آسانی دیوتا بنا کر پیش کیا کرتے ہیں، ان کی بہکی ہوئی ذہنیتوں کو قلم کے زور سے کچل ڈالنا ایک ادبی فرض ہے۔" (ص ۳۹)۔ اس تحریر سے بظاہر تو یہی مراد ہے کہ وہ غالب کے مخالف نہ تھے، بلکہ غالب کے دل چلے کو قلم کے زور سے کچلنا چاہتے تھے، جب قلم کا زور ہی دکھانا مقصود ہے تو اعتراضات کا جواب دینا بھی بیکار ہوگا، لیکن اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے تو کچھ ادبی ہلچل پیدا ہوئی، پھر دب گئی لیکن پھر بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اس لیے انکا ازالہ ہو جائے تو اچھا ہے۔

یگانہ نے غالب کے کل اٹھاون اشعار کو تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی ہے، نسخۂ حمیدیہ میں ایک ہزار، چار سو اٹھاسی اشعار ہیں، ان میں صرف اٹھاون اشعار کو چیدہ اور

نقالی ثابت کر کے پورے دیوان پر پانی پھیرنا ہوا ابھی ہے، پھر بھی اٹھاون اشعار میں چونتیس اشعار پر زور قلم دکھانے میں یگانہ جو تعریف کر گئے ہیں، اس کا خلاصہ ان کی تلخ اور ناروا باتوں کو حذف کر کے اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے،

(۱) غالب :۔ پڑھتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز   لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
عرفی :۔ عشق می گیرم و می گریم زار   طفل نادانم و اول سبق است
یگانہ : شعر اگر مسروقہ نہیں تو اوریجنل بھی نہیں ہے۔

(۲) غالب :۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
صائب :۔ در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو   عالم پر است از تو و خالی ست جائے تو
یگانہ : مطلب نہایت پاکیزہ و روشن، معانی کے لحاظ سے بہت بلند، انداز بیان کے اعتبار سے بھی بے عیب ہے، مگر اسے اوریجنل کہنا نادانی ہوگی۔ پرانا فلسفہ ہے، جسے غالبؔ نے نہایت صفائی سے اردو میں بیان کر دیا ہے۔

(۳) غالب :۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
نامعلوم :۔ لذت ز درد بسکہ دل زار من گرفت   ناخن زدم بہ داغ اگر بستہ دن گرفت
یگانہ :۔ صاف ظاہر ہے کہ غالبؔ نے اس کی نقل اتاری ہے، مگر کامیابی کے ساتھ، ناخن بڑھ آنے کا اشارہ نہایت بلیغ ہے۔

(۴) غالب :۔ اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے   تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر
حزیں :۔ بہ لذت بود از قاتل حزیں نیم بسمل را   کہ در خوں می تپید و آفریں می گفت بر دستش
یگانہ :۔ بڑا اچھا شعر ہے، مگر خیال حزیں کے ایک شعر سے پیدا ہوا ہے، جسے ترقی دیکر غالبؔ نے نقل کو اصل سے بڑھا دیا ہے۔

(۵) غالب:- پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم   ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حزیں:- گراں جانِ تو از شبنم نیست جانِ ناتوان ما   اگر می بود دامن روے گرمی آفتابش را

یگانہ:- دوسرا مصرع کتنا پیارا ہے، مگر پرتوِ خورشید کی جگہ پرتوِ خور اردو میں کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ شبنم و خورشید کا مضمون نہایت پامال ہے۔

(۶) غالب:- نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

قمی:- ہر کس کہ زخمِ کاری ما را نظارہ کرد   تا حشر دست و بازوے او را دعا کند

یگانہ:- شعر اگرچہ اوریجنل نہیں ہے، مگر اصل سے بڑھ گیا ہے۔

(۷) غالب:- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خسرو:- اے گل چو آدمی نہ زمیں گو چگونہ اند   آں روے ہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

یگانہ:- خوب شعر ہے، مگر اوریجنل نہیں ہے، امیر خسرو کے شعر میں بڑی قابلیت سے تصرف کیا ہے۔

(۸) غالب:- انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی:- باوجودیں ہمی رسم آسودہ می شوم از دور   ندید حال مرا وقتِ بے قراری حیف

یگانہ:- غالب کا یہ شعر نہایت مکمل ہے، فسونی نے جس مشاہدہ کو قلم بند کیا ہو، غالب نے اسی کو کمالِ شعریت کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

(۹) غالب:- بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی   وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ظہوری:- تو نظر باز نئی ورنہ تغافل نگہ است   تو زباں فہم نئی ورنہ خموشی سخن است

یگانہ:- نہایت لطیف شعر ہے، مگر تغافل میں نگاہ کا پایا جانا پرانا مضمون ہے۔

(۱۰) غالب:- خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے   آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

یگانہ:- نہایت تازہ شعر معلوم ہوتا ہے، شبِ ہجر میں موت کی دعا مانگا کرتے تھے قسمت

کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی دعا آگے آئی، شب وصل میں شادی مرگ ہوئی، غالبؔ کے بہترے مایۂ ناز اشعار میں سرقہ ثابت ہوچکا ہے، اس وجہ سے بدگمانی (؟) ہوتی ہے کہ یہ بھی کہیں پرایامال نہ ہو،

(۱) غالب:۔ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

عاقل خاں رازی:۔ نہ مرا کردہ رقیب از سر کوئے تو جدا　　اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگزشت

یگانہ:۔ شعر اپنی حدود میں پورا ہے، زبان زد خاص و عام ہے، مگر پرایامال ہے،

(۲) غالب:۔ زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نامعلوم:۔ زیں نام چو تر کنم زبان را　　جاں بوسہ دہد سر زبان را

یگانہ:۔ خوب شعر ہے، مگر اوریجنل نہیں ہے، کہنے والا پہلے کہہ گیا ہے۔

(۳) غالب:۔ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

جمال الدین اصفہانی:۔ آں راکہ توئی یار چہ بے یارکس است　　واں راکہ توئی دوست چہ دشمن کام است

یگانہ:۔ واللہ مرزا غالب کا یہ شعر اتنا قیامت خیز ہے کہ جس کا جواب نہیں

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

نفس مطلب صرف روح شعر سے ہے، وہ دونوں جگہ واحد ہے، غالبؔ نے بھی وہی کہا ہے مگر پہلے مصرع میں دوست کی فتنہ انگیزی کی طرف اشارہ کرکے شعر کو بہت ترقی دی ہے۔

(۴) غالب:۔ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

یگانہ:۔ شعر بجائے خود مکمل ہے، جام جم پر جام سفالیں کی ترجیح نہایت لطیف ہے، خدا کرے یہ شعر غالبؔ ہی کا ہو، کسی کی نقل نہ ہو۔

اوپر غالبؔ اور فارسی شعرا کے اشعار غور سے پڑھے جائیں تو ان میں بعض تو بہت زیادہ

(۵) غالب:- پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حزیں:- گراں جانیِ ترِ شبنم نیست جانِ ناتوان من اگر می بود دامن روئے گرمیِ آفتابش را

یگانہ:- دوسرا مصرع کتنا پیارا ہے، مگر پرتوِ خورشید کی جگہ پرتوِ خور اردو میں کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ شبنم و خورشید کا مضمون نہایت پامال ہے۔

(۶) غالب:- نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

قمی:- ہر کس کہ زخم کاریِ ما را نظارہ کرد تا حشر دست و بازوئے او را دعا کند

یگانہ:- شعر اگرچہ ادبی تحلیل نہیں ہے، مگر اصل سے بڑھ گیا ہے۔

(۷) غالب:- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خسرو:- اے گل چو آدمی ز زمیں گو چگونہ اند آں روئے ہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

یگانہ:- خوب شعر ہے، مگر ادبی تحلیل نہیں ہے، امیر خسرو کے شعر میں بڑی قابلیت سے تصرف کیا ہے۔

(۸) غالب:- ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی:- با وجودیکہ می رسم آسودہ می شوم از دور ندید حالِ مرا وقتِ بے قراری حیف

یگانہ:- غالب کا یہ شعر نہایت مکمل ہے، فسونی نے جس مشاہدہ کو قلم بند کیا ہے، غالب نے اسی کو کمالِ شعریت کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

(۹) غالب:- بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ظہوری:- تو نظر باز نئی ورنہ تغافل نگہ است تو زباں فہم نئی ورنہ خموشی سخن است

یگانہ:- نہایت لطیف شعر ہے، مگر تغافل میں نگاہ کا پایا جانا پرانا مضمون ہے۔

(۱۰) غالب:- خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

یگانہ:- نہایت تازہ شعر معلوم ہوتا ہے، شبِ ہجر میں موت کی دعا مانگا کرتے تھے قسمت

کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی دعا آگے آ ئی، شب وصل میں شادی مرگ ہوئی، غالب کے بہترے مایۂ ناز اشعار میں سرقہ ثابت ہو چکا ہے، اس وجہ سے بدگمانی (؟) ہوتی ہے کہ یہ بھی کہیں پرایا مال نہ ہو۔

(۱۱) غالب:- نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

عاقل خاں رازی:- نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگزشت

یگانہ:- شعر اپنی حدوں میں پورا ہے، زبان زد خاص و عام ہے، مگر پرایا مال ہے،

(۱۲) غالب:- زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نامعلوم:- زیں نام چو تر کنم زباں را جاں بوسہ دہد سر زباں را

یگانہ:- خوب شعر ہے، مگر اوریجنل نہیں ہے، کہنے والا پہلے کہہ گیا ہے۔

(۱۳) غالب:- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

جمال الدین اصفہانی:- آں را کہ توئی یار چہ بے یار کس است واں را کہ توئی دوست چہ دشمن کام است

یگانہ:- واللہ مرزا غالب کا یہ شعر اتنا قیامت خیز ہے کہ جس کا جواب نہیں

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

نفس مطلب صرف روح شعر سے ہے، وہ دونوں جگہ واحد ہے، غالب نے بھی وہی کہا ہے مگر پہلے مصرع میں دوست کی فتنہ انگیزی کی طرف اشارہ کرکے شعر کو بہت ترقی دی ہے۔

(۱۴) غالب:- اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

یگانہ:- شعر بجائے خود مکمل ہے، جام جم پر جام سفالیں کی ترجیح نہایت لطیف ہے، خدا کرے یہ شعر غالب ہی کا ہو کسی کی نقل نہ ہو۔

اور پر غالب اور فارسی شعرو کے اشعار غور سے پڑھے جائیں تو ان میں بعض تو بہت زیادہ

متحد المعانی نہیں ہیں، جن سے سرقہ کا الزام عائد ہو، اس کے باوجود وہ اگر پاکیزہ اور روشن ہیں، معانی کے لحاظ سے بہت بلند ہیں، انداز بیان کے اعتبار سے بے عیب ہیں، نہایت بلیغ ہیں، بانکے ہیں، پیارے ہیں، اصل سے بڑھے ہوئے ہیں، خوب ہیں، نہایت مکمل ہیں، نہایت لطیف ہیں، تازہ ہیں، قیامت خیز ہیں، تو یہ کسی سارق شاعر کا کارنامہ نہیں ہو سکتا ہے، یہ داد تو ایک قادر الکلام شاعر ہی اپنی مہارت ہی کی بدولت حاصل کر سکتا ہے، جامی نے اپنی مشہور تصنیف بہارستان میں سلمان ساوجی کے ذکر میں لکھا ہے

"سلمان ساوجی رحمۃ اللہ علیہ ایک فصیح شاعر اور بلیغ سخن گو ہیں، عبارات کی سلاست اور استعارات کی دقت میں بے نظیر ہیں، ان کے قصائد استادوں کے جواب میں ہیں، ان میں سے بعض اصل سے خوب تر اور بعض برابر ہیں، ان کے یہاں مخصوص معانی بہت ہیں، اور اپنے اشعار میں بہت سے معانی استادوں خصوصاً کمال اصفہانی سے ایراد کیے ہیں لیکن وہ بظاہر خوب تر ہیں، اور اسلوب میں مرغوب تر ہو گئے ہیں، اسلیے وہ طعن و ملامت کے قابل نہیں۔" (بہارستان ص۲)

اسی کے بعد وہ تین اشعار لکھتے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے :-

ہنر است ایں کہ کہن خرقۂ پشمیں ز برش
بدر آرند و در و اطلس و اکسوں پوشند

اسی شعر کے معنی کے لحاظ سے اگر غالب نے کسی خیال کو لے کر اس کو اپنے خوب تر اسلوب اور مرغوب تر طرز ادا سے ریشم و اطلس کا خلعت پہنا دیا ہے، تو وہ طنز کے بجائے داد کے مستحق ہیں، غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی (مآثر الکرام جلد دوم ص ۷۷) جامی کی بہارستان سے مذکورۂ بالا عبارت نقل کی ہے، اور جامی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حسب ذیل شعر لکھا ہے :-

شاہد معنی اگر باشد جامہ لفظش کہن		نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش است

اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کسی شاہد معنی کو اس پرانے جامہ کے بجائے کوئی نکتہ داں نیا حریر کا لباس پہنا دے تو یہ خوبی ہے، آزاد بلگرامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علماء کا قول ہے کہ اگر کسی شاعر کا شعر پہلے کسی شاعر کے مضمون سے بلاغت میں بڑھا ہوا ہے تو یہ محمود ہے اور اگر گھٹیا ہے تو یہ مذموم ہے۔ اور اگر برابر ہے تو پہلے کی فضیلت اپنی جگہ پر درست ہونے کے باوجود دوسرے کا شعر مذمت کا مستحق نہیں، بشرطیکہ کھلا ہوا سرقہ نہ ہو، (مآثر الکرام ص ۷۷)

اب ۷۵ اشعار میں سے مذکورۂ بالا اشعار نکال دیے جائیں تو پھر ان میں سے دس اشعار کی مذمت یگانہ نے جن الفاظ میں کی ہے، ان کو تو پھر مسروقہ کہنا غلط ہوگا، یہ اشعار ان کی رائے کے خلاصے کے ساتھ یہ ہیں:-

(۱) غالب:- شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا		تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

صائب:- ز مکر سبحہ شماراں خدا نگہدارد		کہ صد سر است بہ یک حلقہ و کمند اینجا

یگانہ:- غالب کا شعر نہایت ذلیل ہے، ٹھونس ٹھانس کے سوا کچھ نہیں، اردو میں بہ یک کف بردن صد دل خاص دیوزادوں کی زبان ہے، جو شعر کا نسخہ ہے وہ اتنا بھدا اور ایسا عجیب الخلقت ہے کہ توبہ ہی توبہ۔

(۲) غالب:- ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا		کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

پیامی:- ہیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من		از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

یگانہ:- غالب کا شعر بفردا نمی رسم کی شان بلاغت کو نہیں پہنچ سکتا، اس کے علاوہ پیامی کے شعر میں بیم از وفا مدار کے فقرہ سے جو معنوی خوبیوں میں اضافہ ہوگیا ہے، وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے، آمادہ کیا ہے، اس مفہوم کا غالب کے شعر میں پتا تک نہیں۔

(۳) غالب :۔ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ـــ غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

عرفی :۔ غم نعمتے است خوردنی از خوانِ عشق ـــ اے اہلِ روزگار غمِ روزگار چیست

یگانہ :۔ عرفی کے شعر کی بلندی کو غالب نہ پہنچ سکے۔

(۴) غالب :۔ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں ـــ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

حزیں :۔ پر شد اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی ـــ پیشِ ابر کرم پیرِ مغاں ایں ہمہ نیست

یگانہ :۔ غالب کا شعر کوئی شعر نہیں ہے، کلام موزوں ہے۔

(۵) غالب :۔ بد گمانی نے چاہا اسے سرگرم خرام ـــ رخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھی

بیدل :۔ حیا را ہم نقاب معنی نازش نمی خواہم ـــ کرمی ترسم عرق بر جبہہ بندد چشم غماز ے

یگانہ :۔ غالب کا شعر نہایت ناقص ہے، کاٹ کے پھینک دینے کے قابل۔

(۶) غالب :۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ ـــ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

نامعلوم :۔ یاد ایامِ جنوں بر سرمی بارد سنگ ـــ کودکاں را چو ز مکتب کسے آزاد کند

یگانہ :۔ غالب کا شعر جتنا مشہور ہے، اتنا ہی مہمل، مہملیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے، دوسرا کچھ کہتا ہے، کوئی ایک مرکزِ خیال قائم ہی نہیں رہتا۔

(۷) غالب :۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ـــ بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

خیام :۔ گر میل تو با بے خرد و نا اہل است ـــ من نیز چناں اہل و خردمند نیم

یگانہ :۔ چونکہ یہ مضمون عامۃ الورود ہے، اس لیے غالب کے اس شعر پر توارد کا حکم لگانا زیادہ صحیح ہے۔

(۸) غالب :۔ حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز ـــ دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

شفائی :۔ گفتن دعا بہ لعلِ تو تحصیلِ حاصل است ـــ با خضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

یگانہ: غالب کا شعر تو گھٹا ہی لیکن گورکھ دھندا بھی کر رہ گیا،

(۹) غالب: جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی: نہ فروغ آفتابم نہ بود خبر کہ بے تو — چو دو زلف تست یکساں شب و روزم ہمیشہ

یگانہ: غالب کا یہ شعر بے معنی اور مہمل ہے۔

(۱۰) غالب: بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

نعمت خاں عالی: دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے — آں قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

یگانہ: غالب کے شعر کی بندش ایسی پھس پھسی ہے کہ فرفر پڑھنا چاہو تو زبان الجھتی ہے، یہ شعر ناقص الخلقت، کاٹ کے پھینکنے کے قابل تھا۔

اوپر یہ دعویٰ ہے کہ غالب نے صائب، پیامی، عرفی، حزیں، خیام اور شیدا وغیرہ کے اشعار سے چوری کی ہے، جب غالب کے اشعار ان کے پرستاروں کے نزدیک تو نہیں، لیکن یگانہ کے خیال میں ذلیل، بھدے، عجیب الخلقت، مہمل، گورکھ دھندا، پھس پھسے اور کاٹ کے پھینکنے کے قابل ہیں، تو ان کو نقالی کیسے کہی جا سکتی ہے، چوری تو جب ہوتی کہ مذکورۂ بالا اساتذ کے مقابلہ کے اشعار ہو جاتے،

کبوت عار بود باز پسیں خلعت او — گر نہ در خور بیش از بیش ترا فزوں پوشند

ان دس اشعار کو نکال دیا جائے تو پھر ۳۳ اشعار رہ جاتے ہیں، جن میں سے پانچ کو تو بیدل کی نقالی بتائی گئی ہے۔

(۱۱) غالب: میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

بیدل: ہم چو عنقا بے نیاز عرض ایجادیم ما — یعنی آں سوئے عدم یک عالم آبادیم

(۱۲) غالب: گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدل :۔ دل آسودۂ ما شور امکاں نفس دارد　　گہر خوابیدہ است اینجا عناں ضبط دریا را

(۳) غالب :۔ صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر　　تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

بیدل :۔ در طینت فسردہ صفاہا کدورت است　　آئینہ می کند ہمہ زنگار آب را

(۴) غالب :۔ نہ کی سامان عیش جاہ نے تدبیر وحشت کی　　ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

بیدل :۔ منزل عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست　　چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است اینجا

〃 :۔ از وحشت این بزم بعشرت نتواں زیست　　ہر چند چراغانش کنی پشت پلنگ است

(۵) غالب :۔ نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک　　آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

بیدل :۔ ہیچ پرواز نہ خاکستر خود بالا است　　بیدل این ہفت فلک بیضۂ یک فاختہ است

(۶) غالب :۔ ز بسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے　　کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے

بیدل :۔ دیدۂ ما کہ بہ نظارہ دل محرم نیست　　مژہ باہم از دست ندامت کم نیست

حسب ذیل بارہ اشعار حزیں، نظیری، ظہوری، عرفی اور میر کے اشعار کے چربے بتائے گئے ہیں:

(۱) غالب :۔ تماشا کر اے محو آئینہ داری　　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

حزیں :۔ جلوہ در خانہ آئینہ بہ خود منمائی　　گریہ ای کابین حسرت دیدار چہ کرد

(۲) غالب : فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

نظیری :۔ نشاط رفتہ ز دوراں بہ صبر بستانم　　کہ بہ معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

(۳) غالب :۔ کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نظیری :۔ راز دیرینہ زرہ رخ پردہ برانداخت دریغ　　حال ما شہرہ با فسانۂ غزل ساخت دریغ

(۴) غالب :۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر :۔ بے خودی لے گئی کہاں ہم کو　　دیر سے انتظار ہے اپنا

(۵) غالب:- تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی — لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکل

میر:- سخت کافر تھا جن نے پہلے میر — مذہبِ عشق اختیار کیا

(۶) غالب:- عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

ظہوری:- شد طبیب ما محبت منتش بر جان ما — محنت ما، راحت ما، درد ما، درمان ما

(۷) غالب:- غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے — غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

عرفی:- غم نعمتے است خوردنی اما ز خوانِ عشق — اے اہلِ روزگار غمِ روزگار چیست

(۸) غالب:- بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

عرفی:- وقت عرفی خوش کہ نگشودند چوں در بر رخش — بہ درِ نگشودہ ساکن شد درِ دیگر نزد

(۹) غالب:- وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

عرفی:- بکیشِ برہمناں آنکس از شہیدان است — کہ در عبادتِ بت روے بزمیں می زد

عنایتِ صمدی رو بکفرِ ما نہ کند — اگر کمال پذیرد صنم پرستیِ ما

(۱۰) غالب:- جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی:- نہ فروغ آفتابم نہ بود خبر کہ بے تو — چو دو زلفِ تست یکساں شب و روزم از سیاہی

(۱۱) غالب:- پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عرفی:- بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید — ہزار زمزمہ از دل بہ یک پیالہ برآید

(۱۲) غالب:- بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلا — قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

عرفی:- ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق — روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

غالب کے ان تمام اشعار پر سرقہ کا الزام رکھنا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ اگر ان کے معانی و مطالب پر غور کیا جائے تو ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور نظر آئے گا، اس کے علاوہ یہ [illegible]

بات نہیں کر غالب نے اپنی مہارت فن کے ارتقائی مدارج طے کرنے میں بیدل، حزیں، عرفی، نظیری، ظہوری اور میر کا رنگ اختیار کیا، گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختیار کی تھی، اسی پر غالب نے چلنا اختیار کیا، لیکن پھر اس رنگ کو یہ کہکر چھوڑ دیا :

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس لیے بیدل کے رنگ میں غالب کے جو اشعار نکل گئے ہیں، ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے ابتدائی دور کی شاعری میں بیدل کے رنگ کے اشعار بھی ہیں، حزیں کی تقلید میں ان کے فارسی اور اردو دونوں دواوین میں اشعار ملتے ہیں، مومن خاں کا تو خیال یہ تھا کہ ہم کسی طرح غالب کو علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ غالب نے اپنی فارسی شاعری کا تجزیہ کرکے یہ بتایا ہے کہ "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھکو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا، اس کو فنا کر دیا، ظہوری نے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا، اور نظیری نے اس خاص روش پر چلنا سکھایا،

یہی باتیں وہ اپنے فارسی اشعار میں مختلف طریقوں سے کہتے رہے۔

وہ عرفی کا بار بار حوالہ دیتے ہیں :

چوں نماز دشمن از مرحمت دہر بخویش کر برد عرفی و غالب بعوض باز دہد

قافیہ غالب چو نیست پس ز عرفی گر من فرہنگ بود سے چہ غمستے

کہتے ہیں کہ عرفی کی کیفیت غالب ہی کے یہاں ملے گی، دوسروں کے یہاں یہ بادۂ شیراز نہ ملے گا۔

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب — جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

ایک جگہ تو شاعرانہ تعلی میں عرفی کو اپنے برابر نہیں سمجھا ہے۔

عرفی کہ است لیک نہ چوں من ودیں نمط — او جستہ جستہ غالب ومن دستہ دستہ ام

ظہوری کا ذکر بھی بہت کیا ہے، ایک جگہ تو کہتے ہیں کہ ظہوری انکی رگ جاں بنکر رہے ہیں،

رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را — بہ نظم و نثرِ مولانا ظہوری زندہ ام غالب

اس کی جادو بیانی کے فیض کا بھی اظہار کیا ہے۔

اگر جادو بیاں راز من وابستہ می باشد — بیاید ہم زمن انچہ ظہوری یافتم غالب

اور یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ظہوری کا شیوہ نطق اور تفس ان ہی کی وجہ سے زندہ ہے۔

از نواجاں درتن سازِ بیانش کردہ ام — غالب از من شیوہ نطقِ ظہوری زندہ گشت

سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم — غالب از اوراق ما نقشِ ظہوری دمید

اور جن لوگوں نے ان پر طنز کیا تھا کہ وہ ظہوری کے زلہ ربا ہیں، ان کو یہ کہکر جواب دیا:

در سخن درویشی باید نہ دکاں داری — زلہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث عیبت

ان کو اس کا بھی دکھ رہا کہ ان کا کلام نظیری کے رنگ کا نہ ہو سکا۔

در کاسۂ ما بادۂ سرجوش نکردند — غالب ز تو آں بادہ کہ خود گفت نظیری

غالب نظیری کے رنگ کے لیے تڑپتے ہیں تو کہتے ہیں

با قطرہ دریاسے گوہر آور — اے ساختہ غالب از نظیری

اور جب نظیری کے رنگ میں کوئی غزل کہہ دیتے تو اس پر یہ کہہ کر ناز کرتے

سزد ایں چنیں غزل را بہ سفینہ ناز کردن — ہلہ تازہ گشتہ غالب روشِ نظیری از تو

اگر غالب کے فارسی دیوان کی چھان بین کیجائے تو اس میں ان اساتذہ کے قوافی اور

ردیف میں غالب کی بہت سی متوازی نظمیں اور قصائد ملیں گے۔

غالب کے بیانات اور اعترافات کے بعد ان پر یہ کہاں الزام آتا ہے کہ وہ اساتذۂ فن کے اشعار کے چور تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ وہ ان سے استفادہ کر کے ان کے رنگ میں اشعار کہتے رہے، اور شاعرانہ بے راہ روی، آوارگی اور مطلق العنانی کے بجائے ان ہی کی بدولت گیرائی اور خاص روش پیدا کی، لیکن مرزا یگانہ غالب کے اس اعتراف کو یہ رنگ دیتے ہیں کہ وہ اپنی تلون مزاجی، شاعرانہ بوالہوسی اور سرگشتگی میں کبھی مرزا جلال کے مقلد رہے، کبھی شوکت بخارائی کے، کبھی عرفی کی نقالی کرتے، کبھی نظیری کی، اور کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے اور کبھی صائب کا، جس کو یگانہ غالب کی تلون مزاجی، شاعرانہ بوالہوسی، حیرانی، اور سرگشتگی پر محمول کرتے ہیں، وہ دراصل ایک بے قرار ذہن، ایک مضطرب شاعرانہ عبقریت کی حیرانی اور سرگشتگی تھی، جن کی بدولت انھوں نے یگانہ سے نہ سہی لیکن اوروں سے یہ داد حاصل کر لی کہ انھوں نے اپنی طراحی فکر سے کاغذ کو رشک رنگ اور رنگینیٔ معنی سے صفحہ کو گلزار بنا دیا، انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں نہ صرف بیدل، حزیں، نظیری، ظہوری بلکہ طالب آملی، صائب، شوکت بخارائی، اسیر، غنی، ناصر علی، اور ناسخ کے اثرات قبول کیے، بلکہ میر، سودا اور درد کی زمینوں میں بھی غزلیں کہیں، یہ ان کی نقالی یا چوری سمجھی جائے، لیکن اساتذہ کے رنگ میں رنگنے کے بعد انھوں نے اپنا جو انفرادی رنگ پیدا کیا، وہ اردو شاعری کے لیے بیش قیمت سرمایہ بن گیا، خود یگانہ کو اعتراف ہے کہ غالب کے آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے، وہ نہ صرف ان کی شاعری کی جان ہے، بلکہ اردو لٹریچر کا سرمایہ ناز ہے (ص ۲۰) لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان کے آخر عمر کا کلام سراسر میر کے رنگ کا ہے، میر کے رنگ میں انھوں نے کچھ دنوں تک کچھ اشعار ضرور کہے لیکن اسکے

بعد ان کا جو امتیازی رنگ قائم ہوا، اس کے ترنگ میں انھوں نے ایسے اشعار کہے جن میں سے بعض اشعار کو یگانہ بھی پاکیزہ، روشن، بلند، بے عیب، بلیغ، بانکے، پیارے، لطیف، تازہ، مکمل، اور قیامت خیز کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں،

غالبؔ کے فارسی شعراء کے اتباع اور تقلید کا دور ختم ہوا تو پھر ان کا جو اپنا استادانہ رنگ پیدا ہوا، اس کے متعلق وہ کہتے ہیں:

نظم و نثر شورش انگیزی کر می باید بخواہ — اے کہ می پرسی کہ غالبؔ در سخن یکتاست ہست

اور یہی وہ اپنی اردو شاعری کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی میں بھی ان پر سرقہ کا الزام رکھا گیا، ایک قطعہ میں پہلے تو اپنے حاسدوں کو مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں:

منکران شعر من ہاں تا نگوئی حاسد اند — کایں قیاس از بہر شان سامان نازے بودہ است

رشک از کالا شناسی خیزد و آں مایہ نیست — کاش باشد رشک کاں را ہم جوازے بودہ است

اور پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری ہزار معنوں پر مشتمل ہے، جو اہل ذوق کے نزدیک شہد سے بھی بہتر ہے، اگر کہیں توارد ہو گیا ہے تو اس سے ان کی غزل کی آرائش ختم نہیں ہو سکتی ہے، دوسروں کے لیے تو کسی اور شاعر کے خیال کی بلندی تک پہنچنا فخر کی بات ہو گی، لیکن ان کے لیے یہ ننگ ہے، اور پھر چڑھ کر یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر ان کے شعر میں توارد پیدا ہو گیا ہے تو اس کو چوری نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے نہاں خانہ ازل میں جو چیز پوشیدہ تھی، اس کو دوسروں نے خود چرا لیا ہے،

ہزار معنی سرجوش خاص نطق من است — کہ اہل ذوق دل و گوئی از عسل بردہ است

ز رفتگان بیکے گر توارد م رو داد — مداں کہ خوبی آرایش غزل بردہ است

مرا ست ننگ وہلے فخر او ست کاں بسخن — بسعی فکر رسا جا بداں محل بردہ است

مبر گمان توارد یقین شناس کہ دزد
متاع من ز نہانخانۂ ازل بردست

ان کے ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں سرقہ کرنا عام تھا، بلکہ خود انکے اشعار کے خیالات کی چوری ہوتی، کہتے ہیں کہ آجکل شاعر کی زبان پر گذشتہ اور موجودہ دور کے شاعروں کے خیالات ہوتے ہیں، اور ان پر اس طرح ناز کرتے ہیں کہ جیسے یہ تمام ان کے اصلی خیالات ہیں، اور چونکہ وہ ان خیالات کو خوبی سے ادا کرنہیں پاتے، اس لیے وہ اندرونی طور پر خوف زدہ رہتے ہیں، اور میں ان کی چوری سے واقف ہوجاتا ہوں، گو دوسرے انکی مدح خوانی کرتے ہیں، غالب پھر یہی کہتے ہیں کہ شاعری کوئی چک یا تمسک تو نہیں جس پر کسی خاص آدمی کا دستخط یا مہر یا نام ہو، یہ ایک نوٹ ہے کہ جس کے ہاتھ میں آجائے، اسی کی ملکیت ہے،

غالب دریں زمانہ بہر کس کہ وارسی
مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اوست

زیں مایہ از کجا کہ بنالد بخویشتن
بر گنج شایگاں کہ بود رایگان اوست

کس را ز دست برد خیالش نجات نیست
گر پیش از گذشتہ وگر در زمان اوست

مضمون ہر کرا خوش ادا می کند بناز
گوئی بہ بزم اہل سخن ترجمان اوست

اما بہ کنہ حسن ادا نارسیدہ است
می لرزد از نہیب دلم راز دان اوست

جز من کسے بدزد سخن وانمی رسد
گو خوش بخواں کہ انجمنے مدح خوان اوست

آرے نہ چک بود نہ تمسک ز ہر کہ ہست
نے دستخط نہ مہر نہ نام و نشان اوست

مضمون شعر نوٹ بود فی زماننا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

اس قطعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار کی بھی چوری جاری تھی

(باقی)

بانی درس نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی، استاد شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۴)

ملا بحر العلوم | مولانا بحر العلوم اپنے والد ماجد سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس میں دو تین سال کے بعد مشغول ہوئے، جبکہ ان کے نامور والد کا وصال ہو چکا تھا، تقریباً دس سال تک والد ماجد کی مسند درس کو زینت بخشنے کے بعد وہ حافظ رحمت خاں روہیلہ سردار کے پاس شاہجہاں پور چلے گئے، جہاں کم و بیش بیس سال تک تصنیف و تالیف و درس و تدریس میں مصروف رہے۔ شاہجہاں پور میں ان کے تلامذہ کے حلقے میں فرزندان حافظ رحمت خاں شہید بھی تھے، جن میں نواب محبت خاں محبتؔ قابلِ ذکر ہیں، جو دوسرے وجوہ سے تو تاریخی شخصیت بن چکے ہیں، لیکن ان کی علمیت اور بحر العلوم سے تلمذ پر مورخین کی خصوصی نظریں نہیں پڑیں، نواب محبت خاں کے پیر طریقت حضرت خواجہ علی اکبر مودودیؒ کے ملفوظ میں (جو ان کے خلیفہ خواجہ حسن مودودی لکھنوی نے ترتیب دیا ہے، اور جس کا نام لطائف اکبری ہے) ایک واقعہ درج ہے، جس کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دریں میان بجامع علوم منقول و فنون معقول نواب محبت خاں بہادر دامت ثروتہ دربارۂ مولوی محمد نافع بن مولوی عبد العلی	خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ نے اثنائے گفتگو میں علوم منقول و فنون معقول کے جامع نواب محبت خاں دامت ثروتہ سے ملا

(بحر العلوم) بن ملا نظام الملۃ والدین لکھنوی
قدس سرہ سفارشے فرمودند وارشاد نمودند
کہ ہم چناں کہ حقوق والد شریف شما یعنی حافظ
الملک الشہید حافظ رحمت خاں بہادر رحمہ اللہ
سبحانہ بر والد شریف ایشاں یعنی مولوی
عبد العلی سلمہ اللہ بسیار اند ہم حقوق
ایشاں ہم بر شما بسیار اند بلکہ اقوی و
اعلیٰ از اں چہ آنچہ از شما بہ ایشاں رسیدہ
از فوائد دنیاویہ است وآنچہ از ایشاں
بشما رسیدہ از فوائد دینیہ است بسبب
خدمات درسیہ وتعلیمات دینیہ کہ از استاذ
نسبت بشما واقع شدہ، آنچہ از حسنات وخیرات
وآنچہ بر آں مترتب شود از حق سبحانہ
در جزاء آں بشما رسیدہ پس آں از
سبب ایشاں باشد وایں معنی اقوی
واعلیٰ باشد از وے، اگرچہ از خدمات شما
کہ در بارۂ ایشاں واقع شد فوائد
دینیہ وفوائد اخرویہ نیز مندرج است
چہ ایں معنی سبب رفع تشتت خواطر فضلاء

نظام الدین لکھنوی قدس سرہٗ کے پوتے
مولوی محمد نافع بن مولوی عبد العلی (بحر العلوم)
کے بارے میں سفارش کرتے ہوئے فرمایا
"جس طرح تمہارے والد ماجد حافظ الملک
شہید حافظ رحمت خاں رحمۃ اللہ علیہ
کے حقوق ان کے (مولوی محمد نافع کے)
والد ماجد (ملا بحر العلوم سلمہ اللہ) پر بہت ہیں
اسی طرح انکے (ملا بحر العلوم کے) حقوق بھی تم پر
بہت ہیں، بلکہ اس سے زیادہ اور بلند درجے
کے حقوق ہیں، اس لیے کہ ملا بحر العلوم کو تم
لوگوں کے ذریعہ جو فوائد حاصل ہوئے
وہ دنیاوی ہیں اور ان کے ذریعہ تم سب کو
جو فوائد حاصل ہوئے وہ دینی ہیں یعنی وہ
فوائد جو تدریس و دینی تعلیم کے ذریعہ استاد
سے تم کو پہنچے اور اس دینی تعلیم سے جو اچھائیاں
اور نیکیاں تم کو نصیب ہوئیں اور ان نیکیوں
اور اچھائیوں پر اللہ تعالیٰ سے جو اجر و ثواب
تم کو پہنچے گا وہ سب ان ہی کے سبب سے
(استاد کے سبب) ہے، اس بنا پر استاد کے

گردیدتا مشغول با افاضۂ امور دینیہ
بردم گردیدند اما حقوقِ آخذ
بر معطی زیادہ تر از حقوق معطی
بر آخذ ست

(لطائف اکبری (قلمی) مملوکہ مولانا
محمد میاں فرنگی محلی جانشین مولانا
عبد الباری فرنگی محلی)

حقوق بلند درجہ اور زیادہ قوی ہیں بہ نسبت
دنیاوی فوائد کے، اگرچہ تم لوگوں کی طرف سے
ملا بحر العلوم کی جو خدمت ہوئی اسکے تحت
بھی فوائد دینی اور اخروی آتے ہیں، کیونکہ
امرا، جو خدمتیں علما، کی کرتے ہیں وہ علما، و
فضلا، کی پریشان حالی رفع کرنے کا سبب
ہوتے ہیں اور (معاش کی فکر سے) یکسو ہونے
کے نتیجے میں یہ علما، دینی باتوں کو عامۃ الناس
میں پھیلانے میں منہمک ہو جاتے ہیں اور پھر بھی
یہ حقیقت ہے کہ لینے والے کے حقوق دینے والے
پر اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے دینے والے
کے حقوق لینے والے پر ہوتے ہیں۔

اس واقعہ سے نواب محبت خاں محبت کے بارے میں جو محض اردو شاعر اور رئیس زادے کی حیثیت سے تاریخ میں مذکور ہیں، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ فارغ التحصیل عالم، "جامع علوم منقول و فنون معقول" تھے، اور ان کے استاد ملا نظام الدین فرنگی محلی کے نامور فرزند ملا بحر العلوم تھے،

ملا بحر العلوم شاہجہاں پور میں غلغلۂ درس بلند کرنے کے بعد نواب فیض اللہ خاں کی استدعا پر ریاست رام پور تشریف لے گئے، جہاں چار برس تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، نواب رام پور بحر العلوم اور ان کے شاگردوں کے پوری طرح کفیل رہے،

لیکن یہاں شاگردوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ایسی کثرت ہوئی کہ اس وقت کی ریاست کے بجٹ پر ان سب کی کفالت بار بننے لگی، اور ریاست کی طرف سے محدود رقم مقرر ہونے کی بات آنے پر مولانا بحرالعلوم دل برداشتہ ہوئے۔ اس کی اطلاع بوہار ضلع بردوان کے علم پرور رئیس منشی صدرالدین (میر منشی گورنر جنرل بہادر) کو ہوئی، انھوں نے درخواست کرکے اور انگریزی اثرات سے کام لے کر ریاست رامپور کو مجبور کر دیا کہ وہ ملا بحرالعلوم کو "مدرسۂ منشی صدرالدین" میں درس و تدریس کی رونق بڑھانے پر بہر قیمت آمادہ کر دے،

مولانا بحرالعلوم بوہار تشریف لے گئے، وہاں تلامذہ کی کثرت اور دور دور سے طالبان علم کی آمد منشی صدرالدین کے ذرائع آمدنی کے لیے بھی وجہ آزمایش بن گئی، اس صورت حال کی شہرت ہوتے ہی نظام حیدرآباد، سلطان ٹیپو اور نواب ارکاٹ (مدراس) تینوں نے بیک وقت درخواستیں اور عرضداشتیں مولانا بحرالعلوم کی خدمت میں قدم رنجہ فرمانے کی بھیجیں، مولانا نے نواب آرکاٹ کی عرضداشت کو شرف قبولیت اس لیے بخشا کہ وہ اصلاً قصبۂ گوپامئو (ضلع ہردوئی، اودھ) کے رہنے والے تھے، اور ان کو حق جوار حاصل تھا،

مولانا کے اس فیصلے پر نواب والاجاہ (آرکاٹ، مدراس) کو کتنی مسرت ہوئی اور ہم چشموں میں اپنے کو کتنا سربلند انھوں نے محسوس کیا۔ اس کا اندازہ اس انداز پذیرائی سے کیا جاسکتا ہے جو ملا بحرالعلوم کے وہاں پہنچنے میں نواب والاجاہ نے اختیار کیا،

"مدراس پہنچے تو بیرون شہر کے علما و اعیان دولت نے استقبال کیا، آپ (ملا بحرالعلوم) پالکی پر سوار اور تمام اعیان دولت پاپیادہ ہمراہ۔ اس شان سے نواب کے دولت خانے پر پہنچے، نواب دروازے تک مع شاہزادوں کے استقبال کو آئے، آپ نے پالکی سے اترنے کا ارادہ فرمایا، نواب نے کسی طرح اترنے نہ دیا اور خود پالکی کو کاندھا دیکر صدر مقام تک گیا،

مولانا کو صدر میں بٹھایا اور خود مؤدبانہ سامنے بیٹھا۔ ("تذکرۂ علمائے فرنگی محل" از مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی)

یہ تو نواب کے انداز استقبال کی شان تھی، جو بیان ہوئی، اور بحرالعلوم کی تشریف آوری کی شان کیا تھی، اس کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

"فسافر الیہا مع ست مأۃ نفس من رجال العلم" یعنی بردوان ضلع کے قصبۂ بوہار سے جب مولانا مدراس کے لیے آمادہ بسفر ہوئے تو ان کے ساتھ طالبانِ علم کا ایک بڑا گروہ تھا، جس کے افراد کی تعداد چھ سو تھی، مولانا بحرالعلوم مدراس پہنچے تو ان کے ہمراہ چھ سو طلبہ پر مشتمل پورا ایک جامعہ (یونیورسٹی) تھا، عالی ظرف نواب آرکاٹ نے جس شان انکسار سے بحرالعلوم اور ان کے چھ سو تلامذہ کا خیر مقدم کیا، ویسی ہی عالی حوصلگی سے اس نے بحرالعلوم کے لیے ایک الگ مدرسہ تعمیر کرایا، بحرالعلوم کے لیے گراں قدر مشاہرہ ان کے داماد وں ملا علاء الدین فرنگی محلی اور مولانا اظہار الحق فرنگی محلی کے لیے جداگانہ وظیفۂ تدریس اور جتنے طلبہ ہمراہ تھے سب کے لیے وظیفۂ تعلیم مقرر کردیا۔

ایک جدید تصنیف "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" کے مصنف افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری (مدراس یونیورسٹی) نے قدیم دستاویزوں، تاریخی تحریروں اور سرکاری ریکارڈوں سے نواب والاجاہ محمد علی والی آرکاٹ (کرناٹک) کی دعوت پر ملا عبد العلی بحرالعلوم فرنگی محلی کے مدراس پہنچنے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک اہم خط کو بھی نقل کیا ہے، جس کا ذکر اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے:

" نواب محمد علی والاجاہ نے اپنے مدرسۂ کلاں کی صدر مدرسی کے لیے مولانا عبد العلی بحرالعلوم کو دعوت بھیجی، وہ ۲۴ ذی حجہ ۱۲۰۶ھ کو بہار (بوہار، ضلع بردوان) سے مدراس پہنچے، ان کے ساتھ ان کے فرزند مولوی عبد الرب اور مولوی امام بخش اور

دوسرے بہت سے لوگ تھے، مولانا کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ مقرر ہوئی، مدراس اور آس پاس کے طلبہ ان کی خدمت میں بیٹھ کر استفادہ کرنے لگے۔ مولوی محمد غوث (مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر) نے بھی تبرکاً کچھ پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر وہ کسی وجہ سے انکی درسگاہ میں شریک ہونے پر متردد تھے، آخر انھوں نے اپنے دادا قاضی نظام الدین احمد صغیر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق استخارہ کیا، اس رات خواب میں دیکھا، تو انھیں دلی مسرت ہوئی، وہ خود مولانا عبد العلی بحر العلوم سے مل کر اپنا خواب بیان کرنا چاہتے تھے لیکن حجاب دامنگیر ہوگیا۔ انھوں نے اپنے پھوپھیرے چچا مولوی غلام عبد القادر فرزند مولوی محمد صادق فرزند محمد عبد الرشید شہید کے نام حسب ذیل خط لکھا:۔

قبلۂ من! الحمد للہ والمنۃ کہ بہ برکت
درود اجازت دادۂ آنحضرت شب را
بعجیب نعمت عظمیٰ فائز شدم تفصیلش اینکہ
بعد نماز تہجد استخارۂ کہ از جد مرحوم برد اشدائند
معظمۂ رسیدہ بود بعمل آوردم ونیت کردم
کہ استفادہ از حضرت مولانا افادہ اللہ علیٰ
من برکاتہ نماید یانہ ومرا فیض از ایشان
حاصل خواہد شد یا نہ تا دیر خواب نیامد
آخر نعاسی مستولی شد خود را در مجلس
جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یافتم
و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را نشستہ بمولانا مدظلہ

قبلۂ من! خدا کی حمد اور اس کا شکر ہے کہ
آنجناب کے اجازت دادہ درود کی برکت
سے رات عجیب نعمت عظمیٰ سے فائز ہوا، اسکی
تفصیل یہ ہے کہ میں نے تہجد کی نماز کے بعد
اس طریقے سے استخارہ کیا جو کہ مجھکو دادا مرحوم
سے (خدا انکی خوابگاہ کو ٹھنڈک سے بھر دیے)
ملا تھا، اور نیت یہ کی تھی کہ حضرت مولانا سے
(مولانا عبد العلی بحر العلوم سے) خدا انکی برکتوں
سے مجھے فائدہ پہنچائے) استفادہ کرنا چاہیئے
یا نہیں، اور ان سے مجھے کوئی فیض حاصل ہوگا
یا نہیں، دیر تک نیند نہیں آئی اور آخر جب مجھ پر

بدیدم حضرت امیرالمومنین ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ و ارضاہ باشارۂ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم قرابۂ چرمی یعنی ڈولچی
پُر از آب زمزم آوردند و از دست خود
مرا نوشانیدند ہرچند در اثنائے نوشیدن
خواستم بس کنم لیکن خود دست نکشیدند
تا آنکہ شکم من از آب تا گلو پر شد در آں
وقت حدیث تضلّع از آب زمزم بیاد
آمد و اشک از چشمہا رواں شد
بیدار گشتم در حالیکہ اشک جاری
بود و لذت آب زمزم در دہن
الحمد للہ علی ذالک وصلی اللہ علی نبینا
وآلہ واصحابہ وتابعیہ الی یوم الدین

اونگھ غالب ہوگئی تو اپنے آپ کو جناب
رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پایا،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مولانا مظلا سے
زیادہ مشابہ پایا تھا حضرت امیرالمومنین
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وارضاہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے
ایک قرابۂ چرمی یعنی ڈولچی زمزم کے پانی سے
بھر کر لے آئے اور اپنے دست مبارک سے
مجھے پلانا شروع کیا، پینے کے درمیان میں
ہرچند اشارہ کرتا رہا کہ بس کریں مگر انھوں نے
اپنا ہاتھ نہیں کھینچا، یہاں تک کہ میرا پیٹ
حلق تک بھر آیا، اس وقت آب زمزم کے
بدولت علم سے بھرپور ہونے کی حدیث یاد آئی،
اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اسی
حالت میں جبکہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے بیدار
ہوا، زمزم کے پانی کی لذت ابھی تک منہ میں
تھی، الحمد للہ علی ذالک وصلی اللہ علی نبینا
وآلہ واصحابہ وتابعیہ الی یوم الدین۔

خواستم کہ خود رسیدہ التماس کنم لیکن

میں چاہتا تھا کہ خود ہی پہنچ کر عرض کروں،

چونکہ برا امیر باغ جہت فاتحۂ امیر مرحوم
رفتہ بودم تاب آمدن آنجا نماند بجناب
حضرت مولانا رفتن وعرض این رویا
بسیار ضرور لیکن بسبب عدم ارتباط
ظاہری محجوب می شوم لہذا بخدمت
مصدع است کہ بخدمت مولوی
وجیہ اللہ صاحب سراپا اشتیاق
این ماجرا ظاہر فرمودہ بہر عنوان کہ
مناسب دانند اجازت از نواب صاحب
گرفتہ امروز در بہار روانہ
فرمایند یا آنحضرت تکلیف
کشیدہ تشریف آرند و بندہ را فائز
جناب مولانا کنند چندان قلق و
مستولی حال است کہ مہلت فردا ہمین
قیامت است زیادہ چہ التماس نماید

لیکن چونکہ امیر مرحوم کی فاتحہ کے لیے
امیر باغ گیا ہوا تھا، اس لیے آنے کی
سکت نہ رہی، حضرت مولانا کی خدمت
میں پہنچکر اس خواب کا بیان کرنا ضروری
ہے لیکن ظاہری ارتباط نہ ہونے کی
بنا پر حجاب محسوس ہو رہا ہے، اسی لیے
آنجناب کو تکلیف دیجاتی ہے کہ مولانا
وجیہ اللہ سراپا اشتیاق سے یہ ماجرا
بیان کر کے یا کسی اور صورت سے
جس کو آپ مناسب سمجھتے ہوں نواب صاحب
کی اجازت لیکر آج ہی مجھے مولانا کی
خدمت میں لے چلیں یا آپ خود تکلیف
اٹھا کر یہاں تشریف لے آئیں اور مولانا
کی خدمت میں لیجائیں، اتنا قلق اور
اشتیاق مجھ پر غالب ہو گیا ہے کہ کل تک
کے لیے انتظار کرنا عین قیامت ہے،
اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے۔

اس خط پر لکھنے کی تاریخ نہیں ہے۔ مگر خط میں امیر مرحوم کی فاتحہ کا ذکر ہے، ان سے مراد نواب امیر الامرا مرحوم ہیں جو نواب محمد علی والا جاہ کے دوسرے فرزند تھے، اور جن کا

۲۴ر محرم ۱۲۰۳ھ کو انتقال ہوا تھا، چونکہ مولانا عبد العلی ۲۴ر ذی حجہ ۱۲۰۲ھ کو مدراس تشریف لائے تھے، اس لیے قیاس کہتا ہے کہ ۲۴ر محرم ۱۲۰۳ھ کا واقعہ ہے۔"

(خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" ص ۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱ مطبوعہ ۱۹۶۳ء)

نواب محمد علی والاجاہ کا انتقال ۱۲۱۰ھ (۱۳ر اکتوبر ۱۷۹۵ء) کو ہوا، اور ان کے بڑے بیٹے عمدۃ الامراء جانشین ہوئے اور چھ سال تک حکمرانی کی، نواب عمدۃ الامراء کا ۱۲۱۶ھ میں انتقال ہوا، اور سلطان ٹیپو سے سازباز کے الزام میں انگریزوں نے ولیعہد نواب تاج الامراء علی حسین خان بہادر پر زور ڈالا کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو جائیں، اور گرانقدر وظیفے پر قناعت کریں، تاج الامراء کے انکار پر انگریزوں نے نواب والاجاہ کے مرحوم بیٹے امیر الامراء کے فرزند عبد العلی خان کو گدی نشین کرنا چاہا تو ملا بحر العلوم اور دوسرے علماء نے فتویٰ جاری کیا کہ نواب عمدۃ الامراء کے حقیقی وارث تاج الامراء کے ہوتے کسی دوسرے کو گدی نشین کرنا شرعاً و قانوناً ناجائز ہے۔ مگر انگریزوں نے زور و زبردستی کر کے عبد العلی خان (فرزند نواب امیر الامراء مرحوم) کو گدی نشین کر ہی دیا، اختیارات لے لیے اور تنخواہ جاری کر دی، عبد العلی خان نواب عظیم الدولہ کے لقب سے تخت نشین ہوئے اور مولوی محمد غوث ان کے دیوان (وزیر اعظم) مقرر ہوئے، اور شرف الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے، ریاست کے ملازمین بے روزگار ہو گئے، جنہوں نے انگریزوں کے حکمران ادارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو درخواستیں گزارنا شروع کیں، مولوی محمد غوث شرف الملک ان پر سفارشیں کرتے تھے، اکثر کی درخواستیں منظور ہو گئیں، یہ سب تفصیل خانوادۂ قاضی بدر الدولہ کے مصنف نے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس کے لیے ایک مستقل دفتر قائم ہوا جس کا نام "کرناٹک انسٹی ٹیوشن پے ماسٹر آفس" تھا، اور یہ دفتر آج تک قائم ہے، یہ تمام اپیلیں اب تک اصل صورت میں حاجی ابو احمد محمد عبد القدیر

کے پاس موجود ہیں، ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ملا بحرالعلوم عبدالعلی ہی ایک شخص تھے جنہوں نے انگریزوں کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا۔" (ص ۱۵۰)

۱۲۱۶ھ سے لیکر ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ تک پورے دس سال تک ملا بحرالعلوم اس کے بعد بقید حیات رہے، اور مدراس ہی میں قیام بھی رہا، لیکن انگریزوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا، حالانکہ ان کا مشاہرہ ایک ہزار روپیہ تھا، اور دو گاؤں بھی جاگیر میں عمدۃ الامراء کے وقت میں دیئے گئے تھے،

ملا بحرالعلوم کی وفات کے بعد ان کے ورثا فرزند ملا عبدالرب، دوسرے فرزند کے بیٹے ملا عبدالواحد اور داماد وجانشین ملک العلماء، ملا علاء الدین بن ملا انوارالحق فرنگی محلی نے اپیلیں کیں اور ملا بحرالعلوم کی تنخواہ کمپنی بہادر سے جاری ہوکر ورثا میں تقسیم ہونے لگیں،

مولوی محمد غوث شرف الملک نے خواب دیکھنے کے بعد ملا بحرالعلوم سے استفادہ کیا اور بہت فیض اٹھایا، یہاں تک کہ بڑی شہرت کے عالم اور صاحب تصانیف ہوئے، عربی، فارسی میں ان کی علمی تصانیف آج بھی پائی جاتی ہیں، اور فارسی، اردو میں ان کی شاعری آج بھی قابلِ ذکر ہے۔

مولوی محمد غوث کی سب سے اہم تصنیف "نثر المرجان فی رسم نظم القرآن" سات جلدوں میں آج سے ساٹھ سال قبل حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے جس کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

ان الاستاذ النحریر ملاذ الصغیر	استاذ فاضل، چھوٹوں بڑوں کی پناہ گاہ
والکبیر راقی مراقی العلم والحکم	علم اور حکمت کے درجوں کو طے کرچکنے والے
حامی مراسم الحلم والکرم حائل	نیک نفسی اور شرافت کے مراسم کا پشت پناہ
العلوم معقولا ومنقولا کاملا	علوم معقول ومنقول کے کامل، اصول و

العلوم فروعاً واصولاً صاحب	فروع کی خوب سمجھ رکھنے والے، ذکر واذکار
الذکر والتقوی صاحب الفکر	اور تقویٰ و پرہیزگاری کے حامل، غور و فکر
والفتوی مولانا و موئلنا	اور فتویٰ نویسی میں صائب الرائے ہمارے
منبع الفیض الجاری ابا العیاش	آقا اور مرجع امید، دریائے فیض کے سرچشمہ
عبد العلی محمد بن نظام الملۃ	ابو العیاش عبد العلی محمد بن نظام الملۃ
والدین الانصاری متعہ اللہ	والدین انصاری نے (ان کے گلستاں کے
بنعیم جناتہ ولاحرمنا من	ثمرات سے اللہ تعالیٰ خلق کو متمتع کرے
فیوضہ وبرکاتہ قد شافہنی	اور ان کے فیض سے ہمیں محروم نہ فرمائے)
یوما بلطیف مقالہ وحرضنی	ایک دن مجھ سے اپنی پاکیزہ گفتگو میں فرمایا
باوعظ اقوالہ علی انفاق الانفاس	اور اپنے دلنشین جملوں سے مجھے آمادہ
فی تصنیف کتاب لیکون تذکرۃ	فرمایا کہ ایک کتاب کی تالیف میں اپنے
حسنۃ عند الاحباب فان الکتاب	اوقات صرف کروں تاکہ احباب کے لیے
صدقۃ جاریۃ والی انظار	ایک اچھی یادگار رہ جائے، اس لیے کہ
الرجال ساریۃ فاشربت	تصنیف ہمیشہ رہنے والا کار خیر ہے اور
فی قلبی نصح موعظتہ	لوگوں کی نگاہوں میں رہنے والی چیز ہے۔
ولما کان امر الاستاذ احری	انکی مخلصانہ نصیحت میرے دل میں رچ بس گئی
بالانقیاد وقد عاضدہ	..... اور چونکہ استاد کا حکم یوں بھی لائق
ــــ نجل الرئیس الاجاہ الکبیر المحسان	تعمیل ہوتا ہے پھر اس حکم کی تائید .....
ثابت جنگ بہادر عبد الغفار خاں .... فلم	نواب والا جاہ کے بیٹے محسن کبیر و رئیس
اجد للعدول مناصاً	ثابت جنگ بہادر عبد الغفار خاں نے بھی کی

[illegible] (… ص ٥)

شرف الملک مولوی محمد غوث مدراس کے نامور علمی خانوادے کے ممتاز فرد تھے، اور ان کے بڑے فرزند مولوی عبد الوہاب مدار الامرا نے بھی تبرکاً میزان الصرف (عربی صرف کی پہلی کتاب) ملا بحر العلوم عبد العلی سے پڑھی اور عربی کی انتہائی کتابیں ملک العلما مولانا علاء الدین احمد ابن (اللہ) فرنگی محلی سے پڑھیں، شرف الملک کے دوسرے فرزند قاضی صبغۃ اللہ بدر الدولہ نے بھی تبرکاً میزان الصرف ملا بحر العلوم سے پڑھی، اور انتہائی کتابیں ملک العلما، ملا علاء الدین احمد بن شیخ احمد انوار الحق فرنگی محلی سے پڑھیں، ملا علاء الدین احمد ملا بحر العلوم کے برادر عم زاد کے پوتے تھے، اور ملا بحر العلوم کے داماد اور شاگرد تھے اور مدراس میں ملا بحر العلوم کے جانشین ہوئے، ان کا انتقال مدراس ہی میں ۱۲۴۲ھ میں ہوا۔

"خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" کے مصنف نے ملا بحر العلوم اور ان کے ہمراہی اعزہ و اقارب کے سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

"نواب محمد علی والاجاہ کا جب ۱۲۱۰ھ میں انتقال ہوا اور نواب عمدۃ الامراء بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے ملا عبد العلی بحر العلوم کو ملک العلماء کا خطاب دیا اور نذر کی پہلی تھالی ان کے دامن میں ڈالدی، نواب عمدۃ الامرا نے ضلع چنگل پیٹھ میں چینور اور جعفرا پیٹھ کے دو قریے بطور جاگیر عنایت کیے تھے، جو نواب کی وفات ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء کے بعد ضبط ہو گئے تھے، ان کے بدلے ماہوار رقم مقرر کر دی گئی تھی، بحر العلوم نے انگریزوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، اور جب ۱۳ رجب ۱۲۲۵ھ کو بحر العلوم کا انتقال ہو گیا تو دو دن بعد ۱۵ رجب کو انکے داماد مولوی علاء الدین احمد کو "ملک العلما" کا خطاب دیکر مدرسہ کلاں کا صدر مدرس بنا دیا تھا، اس مدرسہ میں سلطان العلما مولوی عبد الرب بن ملا بحر العلوم اور قطب العلما مولوی عبد الواجد بن مولوی عبد الاعلیٰ (بن بحر العلوم) کے علاوہ اور کئی اساتذہ کام کرتے رہے تھے"۔ (ص ۴۰۸)

ملک العلما، ملا علاء الدین احمد بھی مدراس میں آخر عمر تک مقیم رہے اور ملا بحر العلوم کی جانشینی کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی مدراس میں آخر عمر تک قیام پذیر رہے، اور رد وہابیت کے معرکۂ عظیم میں جو وہاں تقویۃ الایمان (مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی) کے سلسلے میں ہوا تھا، بہت پیش پیش رہے۔ مولوی میر محمد علی واعظ رام پوری نے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ، مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ اور اس گروہ کے دیگر علماء کے عقائد کی بہت ترویج کی تھی جس نے مدراس میں دو گروہ پیدا کر دیے تھے۔ یہ قاضی بدر الدولہ کا زمانہ تھا، سخت نزاع پھیل گئی، جس میں نواب آرکاٹ اور انگریزوں کو دخل دینا پڑا۔ ملا جمال الدین احمد (نواسہ ملا بحر العلوم) نے اس میں یہاں تک دلچسپی لی کہ میر محمد علی سے مسئلۂ شفاعت پر مناظرہ کیا، اور میر محمد علی کو مجبور کیا کہ تقویۃ الایمان کی قابل اعتراض عبارتوں سے اپنی برأت ظاہر کریں، میر صاحب نے مسجد والاجاہی میں بعد نماز جمعہ برأت نامہ تحریری پیش کیا جو حاضرین کو سنایا گیا، مگر اس مجمل برأت نامہ سے ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی اور ان کے ہم خیال مطمئن نہیں ہوئے، دوسرا برأت نامہ میر صاحب نے پیش کیا، مگر ایک طرف برأت نامہ دوسری طرف ایسی تقریریں جن سے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ کی تعریف و توصیف نکلتی ہو، میر صاحب کرتے رہے، آخر کار ملا جمال الدین احمد اور ان کے ہم خیال علماء نے میر محمد علی واعظ رامپوری کے کفر کا فتویٰ دے دیا، اور انھیں واجب القتل قرار دیا گیا قتل کا اختیار نواب آرکاٹ کو نہ تھا، اس لیے ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی نے ایک اور اشتہار تیار کر کے مسجد والاجاہی میں سنایا اور معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ شہر مدراس کے چیف مجسٹریٹ نے میر صاحب کو بحفاظت تمام بذریعہ بحری جہاز مدراس سے

کلکتہ روانہ کردیا۔ ملا جلال الدین احمد فرنگی محلی نے اس کے بعد میر صاحب کے ایک ایک مرید سے فرداً فرداً توبہ کرانا شروع کر دی اور اصرار کیا کہ یہ لوگ اپنے گھروں میں نہیں، مسجد والا جاہی میں عام لوگوں کے سامنے توبہ کریں، نواب محمد علی والا جاہ مرحوم کی ایک بیوہ بھی میر صاحب کے مریدوں میں تھیں، ان کو بھی مجبور کرکے توبہ کرائی گئی، ملا جلال الدین احمد کسی طرح ان کو مستثنیٰ کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔

نزہتہ الخواطر کے فاضل مؤلف علامہ سید عبد الحیٔ الحسنی رائے بریلوی نے ملا جلال الدین احمد کے ذکر میں لکھا ہے:

ثم رحل الی مدراس وولی التدریس فی المدرسة الوالاجاهیة مقام والدہ ونال منزل ابیہ	(ملا جلال الدین احمد فرنگی محلی نے لکھنؤ میں اپنے چچا ملا نور الحق سے تکمیل درس کیا) پھر مدراس چلے گئے، جہاں مدرسۂ والا جاہی میں مدرس ہوئے اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے، اور اپنے والد (ملک العلماء ملا علاء الدین احمد) کا مرتبہ پایا اور ان کے جانشین ہوئے۔

صاحب نزہتہ الخواطر کا خصوصی رجحان سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک کی طرف تھا جس کا اثر ان کی غیر جانبدار تاریخ نویسی پر برابر رہا ہے، اس لیے وہ ملا جلال الدین احمد پر آگے چلکر معترض ہوتے ہیں:-

وکان شدید الرغبة فی المباحثة شدید التعصب علی من خالفه	بحث و مباحثہ کے بڑے شوقین اور جو ان کے خلاف ہو اس سے سخت تعصب رکھتے تھے

طویل اللسان بالتکفیر والتضلیل | کافر اور گمراہ قرار دینے میں بڑے زبان دراز تھے،

مصنف نزہتہ الخواطر نے سخت الفاظ میں اعتراض جو کیا ہے تو اس کی وجہ بھی مخفی نہیں رہنے دی، اس کے فوراً ہی بعد لکھتے ہیں :۔

کان یکفر الشیخ اسماعیل بن	وہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کی ان کی کتاب
عبد الغنی الدهلوی علی ما	تقویۃ الایمان کی بعض منسوب عبارتوں
ماانسب الیہ من عبارۃ فی	کی بنا پر تکفیر کرتے تھے۔ اور ان عبارتوں
کتابہ تقویۃ الایمان یستدلون	سے لوگ حضرت رسالت مآب (صلی اللہ
بھا علی اساءۃ ادبہ فی مقام	علیہ وسلم) کی شان میں سوء ادب کا پہلو
النبوۃ۔ اعاذنا اللہ منھا۔	نکالتے تھے۔ خدا ہم سب کو ایسے سوء ادب
والحق ان الشیخ ساعتہ بریئۃ	سے بچائے۔ حق یہ ہے کہ مولوی اسمٰعیل
من ھذا القبیح وقد افرط	اس قبیح حرکت سے بالکل بری تھے، جمال
الجمال فی ذالک وکان یکفر	(یعنی ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی) اس
من یستحسن تقویۃ الایمان	معاملے میں حد سے گزر گئے تھے۔ وہ اس
فضلا عن مصنفہ حتی نال منہ	شخص تک کی تکفیر کرتے تھے جو تقویۃ الایمان
السید محمد علی الواعظ احد	کو اچھی کتاب سمجھتا تھا، مصنف تو رہے الگ
اصحاب سیدنا احمد بن عرفان	یہاں تک کہ سید محمد علی واعظ کو جو سید احمد
الشھید البریلوی اذی کثیرا	شہید بریلوی کے گروہ کے ایک فرد تھے، ان کے
ببلدۃ مدراس	ہاتھوں سخت ایذائیں، شہر مدراس،
	میں پہنچیں۔

"یہ سخت ایذائیں" وہی ہیں جن کی تفصیل "خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کے مصنف" کے حوالے سے اوپر نقل ہو چکی ہیں، مگر اس کی تنہا ذمہ داری ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی پر نہ تھی، قاضی بدرالدولہ اور دوسرے علما بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ اس کے علاوہ تقویۃ الایمان پر یہ مباحثہ تنہا مدراس ہی تک محدود نہ تھا، پورے ہندوستان میں تقویۃ الایمان نے دو حریف گروہ پیدا کر دیے تھے، اور دونوں اسی قوت سے متصادم بھی تھے، اول تو حد سے گذرنے کا گناہ اکیلے "جمال" (ملا جمال الدین احمد) نے نہیں کیا، ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کتاب کے خلاف یہی سب کچھ کرنے والے موجود تھے، دوسرے ایک ہی فریق حد سے نہیں گذرا، دوسرا فریق بھی اس مباحثے کے دوران بلکہ اس کے تذکرے کے وقت بھی توازن قائم رکھنے پر قادر نہیں رہ سکا، یہی اس عہد کا مزاج تھا، اس سلسلے میں کسی ایک کو مورد الزام قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

بہرحال ۱۲۷۱ھ میں ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی کے انتقال کے بعد مدراس میں ملا بحرالعلوم کی مسند تدریس ان کے گھرانے کے افراد سے خالی ہو گئی، لیکن ملا بحرالعلوم کے ذریعہ بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی کا دریائے فیض جو جاری ہوا تھا وہ جنوبی ہند میں شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعہ پھیلتا رہا۔

ملا نظام الدین کے دریائے فیض سے جو چشمے پھوٹے ان میں سے ایک بحر زخار بن کر شاہجہانپور، رامپور اور بہار ہوتا ہوا تک شمال مغرب اور مشرق میں پھیلنے کے بعد دکن تک وسیع ہو گیا، یہی وہ چشمہ تھا، جسے آج تک بحرالعلوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، دکن میں دینی علوم کے استاد اول یہی ملا بحرالعلوم ہوئے، جن کی جانشینی ان کے داماد ملا علاء الدین (حفید ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی) نے کی، انکے بعد انکے بیٹے ملا جمال الدین ملا علاء الدین فرنگی محلی نے

درس و تدریس، وعظ و افتا و مناظرہ وغیرہ میں خاصا بلند درجہ مدراس میں حاصل کیا، یہ تینوں فرنگی محلی بزرگ مدراس ہی میں مدفون ہیں، اور ان کی علمی سرگرمیوں کی تاریخ نیز انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے تحت ریاست آرکاٹ کے حقوق میں دخل اندازیوں کے خلاف عوامی بیزاری کے سلسلے میں ملا جمال الدین اور ان کے والد اور نانا (بحر العلوم) کے برملا اقدامات کے تذکرے ریاست مدراس کے سرکاری کاغذات اور اس زمانے کے قلمی مخطوطات میں محفوظ ہیں۔

ملا احمد حسین فرنگی محلی | ملا نظام الدین کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا کے بیٹے ملا احمد حسین ان نامور تلامذۂ ملا نظام الدین میں تھے جنھوں نے ملا نظام الدین کے سامنے درس دینا شروع کردیا تھا، اور ان کے بعد فرنگی محل میں ان کی مسند درس کی رونق گھٹنے نہیں دی تھی، ملا صاحب نے ان کو متبنی بھی بنایا تھا، سوائے درس و تدریس کے ان کی زندگی کا اور کوئی مشغلہ نہ تھا، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی کے الفاظ میں :۔

کان من اکابر العلماء واعاظم	بڑے علما اور زبردست دانشوروں
الاذکیاء ولم یزل مشتغلا	میں تھے، ساری زندگی درس و تدریس
بالافادة واشاعة مراسم	اور شعار دین کی ترویج میں گزاری
الدین الی ان توفی	(خیر الجمل قلمی، منقول از تذکرہ الاولین علمائے فرنگی محل ... تذکرہ علمائے فرنگی محل)

لیکن ملا احمد حسین زیادہ مشہور نہ ہو سکے، اس کی وجہ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کی قلمی یادداشت میں انکے دیکھنے والوں کی زبانی اس طرح منقول ہوئی ہے ،

زبانی مولوی نعیم اللہ صاحب بسماعت	مولوی نعیم اللہ فرنگی محلی (برادر زادہ و شاگرد
رسید کہ مولوی محمد مبین تلمیذ ایشان بودند	ملا مبین فرنگی محلی) کی زبانی میں نے سنا ہے کہ

بسیار مدح و ثنا می فرمودند و می
گفتند کہ در تبحر علمی زیادہ از مولوی
محمد حسن مرحوم بودند لیکن بہ باعث
بے تصنیفی دریں وقت شہرت آفاقی
نمی آرند در زمان حیات خود بسیار
نامور بودند و چنانچہ تفضل حسین[1]
خاں صاحب ہم تلمیذ ایشاں بودند

ملا محمد مبین فرنگی محلی ملا احمد حسین کے
شاگرد تھے (ملا حسن فرنگی محلی کے شاگرد
تو تھے ہی) اور ان کی بے حد تعریف و
توصیف کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ جہاں تک
تبحر علمی کا تعلق ہے ملا احمد حسین میں ملا محمد حسن
(ملا حسن) سے زیادہ تھا لیکن چونکہ ملا
احمد حسین کی کوئی تصنیف نہیں ہے اسلئے

---

[1] علامہ تفضل حسین خان (شاگرد ملا احمد حسین فرنگی محلی (ملا حسن فرنگی محلی) حکومت اودھ کے ایک نامور رکن تھے، اور غالباً پہلے آدمی ہیں جو "علامہ" کے نام سے اودھ میں یاد کیے جاتے ہیں، بڑے عالم، منطقی، فلسفی، منجم اور مغربی زبانوں کے جاننے والے اور حکومت انگریزی میں معزز تھے، یہی وہ علامہ تفضل حسین ہیں جن کے ایک شاگرد کی روزمرہ کی گفتگو کو دریائے لطافت میں نقل کرکے انشاء نے دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔ علامہ کا ایک شاگرد ایک شخص باوام سنگھ کے دہقانی اور ان پڑھ خادم سے اس طرح بات چیت کرتے انشاء نے دکھایا ہے:-

"اس رئیس الاشقیا، باوام سنگھ نے خود کو کیا قرار دیا ہے کہ رؤس و عظارف سے دم تساوی مارتا ہے اور عواقب امور سے بے اندیشہ محض ہوکر طوالت تقاریر سے صماخ سامعین پریشان کرتا ہے، زمانے کا احوال علی انحاء شتی ہے، یہ بات عقل سلیم اور ذہن مستقیم کے نزدیک استحسان نہیں رکھتی ہے، غایۃ مافی الباب یہ کہ سفہائے دہاقین کے اذہان قاصرہ میں مرتسم ہوکے یہ شخص اپنے اکفاء و اماثل واقران میں بڑا طلیق و ذلیق لوذعی الحق اللسان فی الکلام ہے، لو فرض وسلم کہ کوئی اسکے مزخرفات پر افراط اخلاق سے مراد نہ ہو تو بھی اسکی مساوات ان اشخاص منیع القدر کے ساتھ امون کے ذا ویتین کی طرح ساقین کی تساوی کے سبب ثابت نہ ہوگی۔"

وہم چناں بسیارے از اکابر آں وقت
خود را در سلک تلمذ ایشاں درج
بودند وہم بسماعت رسید کہ مولوی
حبیب اللہ ہم تلمیذ ایشاں بودند
چنانچہ در مرض الموت از بلدہ فیض آباد
ہمراہ شاں بودند، مولوی صاحب
ایشاں وصیت کردہ بودند کہ
در جانب شرقی مزار عم مکرم من
مولوی نظام الدین محمد قدس سرہ
بالاتصال مرا دفن خواہند نمود
چنانچہ مولوی حبیب اللہ مرحوم
شب عاشورہ باعانت ......
و نبودن ...... بہ باعث ایام
محرم الحرام ...... دفن نمودند

اس زمانے میں وہ عالمگیر شہرت نہیں
رکھتے ہیں، اپنے زمانے میں وہ بہت
مشہور تھے، چنانچہ تفضل حسین خاں صاحب
(علامہ تفضل حسین خاں استاذ نواب
سعادت علی خاں وزیر الممالک) بھی
ملا احمد حسین کے شاگرد تھے (علامہ تفضل حسین
ملا حسن فرنگی محلی کے بھی شاگرد تھے) اور
ان کے زمانے کے بہت سے بڑے بڑے
لوگ ملا احمد حسین کے سلسلۂ تلمذ میں داخل
تھے، یہ بھی ان سے (مولوی نعیم اللہ سے)
سنا ہے کہ مولوی حبیب اللہ (انکے والد)
بھی ملا احمد حسین کے شاگرد تھے، اور ملا احمد حسین
فرنگی محلی جب فیض آباد سے (جو اس زمانے میں
اودھ کی راجدھانی تھی) واپس آنے
مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، تو انھوں نے
اپنے شاگرد اور برادر عم زاد کے پوتے (مولوی
حبیب اللہ) کو وصیت کی کہ عم محترم ملا
نظام الدین محمد قدس سرہ کے مزار کے مشرق
میں بالکل انکے برابر مجھے دفن کرنا، چنانچہ مولوی حبیب اللہ نے عشرۂ محرم کی رات کو مرد سے ..... باوجودیکہ ..... نہ تھے، کیونکہ محرم کے ایام تھے وہیں دفن کیا۔

نوٹ:-
(معین قلمی تحریر کے الفاظ بالکل پڑھے نہ جا سکے اور کچھ مشکوک نظر آئے اسلئے غیر واضح الفاظ کی جگہ نقطے بنا دیئے گئے ہیں)

قرطاس اور کاغذ تاریخ کی روشنی میں

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے. پی. ایچ. ڈی (لندن) سابق پروفیسر عربی

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

عالم اسلام میں کتابت کے لیے بالعموم دو چیزیں مستعمل رہی ہیں، اول قرطاس اور دوسرے کاغذ۔ ان کے علاوہ رق یعنی چمڑا بھی تحریر کے لیے استعمال میں رہا ہے لیکن مقابلۃً بہت کم اکثر لوگوں نے اور خصوصاً متاخرین نے قرطاس اور کاغذ کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا ہے، چنانچہ قرآن پاک کے اردو تراجم میں قرطاس کا ترجمہ کاغذ کیا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصلیت، ترکیب و ساخت اور تاریخ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، قرطاس تو قدیم زمانے میں مصر میں فافیر (Papyrus) یعنی بردی کے پودے کے گودے سے تیار ہوتا تھا اور مسلمان اپنے دور حضارت میں نوشت و خواند کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسی چیز سے آشنا ہوئے اور اسے دو تین سال تک کام میں لاتے رہے، لیکن اس کے برعکس مروجہ کاغذ چین میں پہلی صدی عیسوی میں ایجاد ہوا اور پھر آٹھویں صدی (یعنی دوسری صدی ہجری) میں کاغذ کی صنعت چینی قیدیوں کے ذریعہ سے سمرقند (ترکستان) میں جاری ہوئی، اور بعد ازاں خراسان اور بغداد کے راستے سے تمام اسلامی ملکوں میں پھیل گئی، اور کاغذ کے روز افزوں استعمال سے قرطاس رفتہ رفتہ ہر جگہ متروک ہوگیا، اور اس کی جگہ کاغذ نے لے لی، مقالہ ہذا کے

پہلے حصہ میں قرطاس اور دوسرے حصہ میں کاغذ کے متعلق چند ضروری معلومات ہدیۂ ناظرین ہیں، چونکہ قرطاس کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے، اس لیے امید ہے کہ یہ مقالہ علم تفسیر کے لحاظ سے بھی ناظرین کرام کی توجہ اور دلچسپی کا مستحق ہوگا۔

(۱) قرطاس | قرطاس مصر کی خاص پیداوار تھی، اس لحاظ سے کہ وہ مصر ہی میں تیار ہوتا تھا، اور وہاں لکھنے کے کام میں آتا تھا، چنانچہ ابن الندیم بغدادی نے لکھا ہے کہ کتب اهلُ مصر فی القرطاس المصری ویُعملُ من قصَب البردی[۱]، یعنی اہل مصر مصری قرطاس پر لکھتے تھے، اور وہ بردی کے پودے سے بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) نے کتاب الہند میں تحریر کیا ہے کہ "انّ القرطاس معمولٌ بمصر من لُبّ البَردی یُبری فی لحمہ وعلیہ صدرت کتبُ الخلفاء الی قریبٍ من زماننا"[۲] یعنی قرطاس مصر میں بردی کے گودے کو کاٹ کر بنایا جاتا اور ہمارے قریبی زمانہ تک خلفاء کے فرامین اسی قرطاس پر صادر ہوتے رہے ہیں۔

اہل مصر کے برعکس بابل اور اشور (Assyria) کی قدیم مملکتوں کے باشندے لکھنے کے لیے مٹی کی چوڑی چوڑی لوحیں یا تختیاں استعمال کرتے تھے، جب یہ تختیاں ابھی گیلی ہوتیں تو جو کچھ لکھنا مقصود ہوتا، نے کے قلم سے ان پر نقش کر دیتے تھے، اور پھر ان کو سکھا کر تنور میں پکا لیتے، اس طرح سے یہ تحریر ایک پائیدار صورت اختیار کر لیتی تھی۔ لوح پر نوک قلم کے دبانے سے حروف کی جو شکل بنتی تھی وہ فانہ یا میخ کی مانند نظر آتی ہے، اس لیے اس بابلی خط کو آجکل خط میخی یا مسماری (Cuneiform) کہتے ہیں، گذشتہ صدی میں مغربی علماء نے قدیم آثار کی تلاش میں جب بابل اور اسکے گرد و نواح

---

[۱] کتاب الفہرست لابن الندیم صفحہ ۳۱، مطبوعہ مصر۔

میں کھدائی کی تو ان کو وہاں کے کھنڈروں میں اس قسم کی ہزاروں تختیاں ملیں، ان میں سرکاری فرمان، نجی خطوط، بیع نامے، رسیدیں، حساب کی یادداشتیں، غرضکہ ہر قسم کی دستاویزیں پائی گئی ہیں، جن سے اس قدیم زمانہ کی زندگی پر نہایت دلچسپ روشنی پڑتی ہے، شہر نینوی کے شاہی محلات کے کھنڈروں میں اشور بنی بعل (Assur banipal) کے عہد کا ایک پورا کتب خانہ دریافت ہوا ہے جو بائیس ہزار تختیوں پر مشتمل ہے اور اب لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، ایک دستاویز میں یہ مشہور بادشاہ فخریہ لہجہ میں لکھتا ہے کہ "میرے باپ نے مجھے نہ صرف تیراندازی اور شہسواری سکھائی بلکہ گیلی تختیوں پر لکھنے کی تعلیم دی اور اپنے زمانے کی تمام حکمت کی تلقین کی۔"

ظاہر ہے کہ کتابت کا یہ طریقہ بڑا بھدا تھا، اس لیے لوگوں کو کسی ایسے سامان نوشت کی ضرورت تھی جو اینٹ کی طرح بھاری اور بھدا نہ ہو، چنانچہ مصر کے قدیم لوگوں نے بردی کے پودے سے از قسم ورق ایک ایسی چیز تیار کی جو لکھنے کے لیے مٹی کی الواح کے مقابلہ میں بہت زیادہ موزوں تھی، اس ورق کو یونانیوں نے Papyrus اور عربوں نے قرطاس کہا ہے، بعض قدیم مصنفوں نے لکھا ہے کہ یہ پودا مصر کے علاوہ شام، دریائے فرات اور دریائے نائجر کے کناروں پر بھی پایا جاتا تھا، لیکن اس سے ورق تیار کرنے کی ترکیب اہل مصر کے سوا اور کسی قوم کے ذہن میں نہیں آئی، اور قرطاس کی ایجاد سے اہل مصر نے نہ صرف اپنی ضرورتوں کو پورا کیا بلکہ دساور کو برآمد کرکے دوسری قوموں کی بھی بیش بہا خدمت انجام دی۔

بردی کا بیان بردی کا پودا قدیم زمانے میں مصر میں دلدلوں اور تالابوں کے کنارے بکثرت پیدا ہوتا تھا، اور اب بھی مصری امراء کے باغات کی زینت ہے، یہ پودا

آٹھ دس فٹ کی بلندی تک بڑھتا ہے، اور اس کے سر پر خوبصورت شگوفے پھوٹتے ہیں، اس کا تنا تکون شکل کا اور موٹائی میں انسان کی کلائی کے برابر ہوتا ہے، اس میں بانس کی طرح گرہیں نہیں ہوتیں، بلکہ سرکنڈے کی مثل نرم گودا ہوتا ہے، اسی گودے کو کاٹ کر اس سے ورق بناتے تھے جس کی کیفیت اور ترکیب آیندہ صفحات میں بیان ہوگی۔

بردی کا صحیح بیان ہمیں سب سے پہلے ارسطو کے شاگرد ثاؤفرسطس کے ہاں ملتا ہے[1]، چنانچہ وہ اپنی کتاب النبات میں لکھتا ہے کہ پودا تقریباً دو ہاتھ گہری دلدل میں اگتا ہے، اس کی سب سے بڑی جڑ انسان کی کلائی کے برابر ہوتی ہے، اور دس ہاتھ کی لمبائی تک بڑھتی ہے، یہ جڑ افق کے متوازی ہوتی ہے، اور اس سے چھوٹی چھوٹی اور جڑیں پھوٹتی ہیں، اور دلدل کی مٹی میں دھنس جاتی ہیں، اس پودے کا تنا چار ہاتھ کی بلندی تک پہنچتا ہے اور شکل میں تکون اور گاؤدم ہوتا ہے۔

ابن البیطار نے کتاب الجامع لمفردات الادویہ میں بردی کا قدیم مصری نام فافیر لکھا ہے، مگر ابن حوقل نے اس کا نام بابیر یا بیبر یا بتایا ہے، دراصل یہ وہی قدیم مصری نام ہے جس کو یونانیوں نے (Papyros) اور رومیوں نے (Papyrus) کی صورت میں لکھا تھا، قیاس چاہتا ہے کہ اصل مصری نام میں غالباً "پ" ہوگی، جسے یونانیوں نے P سے ادا کر دیا، مگر عربی حروف ہجاء میں پ مفقود ہے، اس لیے عربی املا میں اس کی جگہ ب یا ف نے لے لی، اور عربوں نے اسے بابیر یا فافیر کی صورت میں لکھا۔

---

[1] ثاؤفرسطس (Theophrastos) متوفی ۲۸۶ قبل مسیح ارسطو کا شاگرد اور جانشین تھا، اس نے ارسطو کے بعد اس کی تعلیم کو جاری رکھا اور اس کے دبستان فلسفہ کی تنظیم کی، ابن الندیم بغدادی اس کے نام اور کام سے بخوبی واقف تھا، ملاحظہ ہو کتاب الفہرست صفحہ ۳۵۲، مطبوعہ مصر۔

یونانی کلمہ (Papyrus) کے اخیر میں جو s ہے وہ اس کے حروف اصلیہ میں سے نہیں ہے بلکہ زائد ہے، اور یونانی زبان کے قواعد کی رو سے اسم کی حالت فاعلی کو ظاہر کرتا ہے۔ Papyrus دراصل پودے کا نام تھا، پھر یہی لفظ اس ورق کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو اس سے بنایا جاتا تھا، انگریزی زبان کا لفظ Paper اسی کلمہ سے ماخوذ ہے۔

عربوں نے فافیر کے پودے کو بردی کہا ہے، اور صاحب تاج العروس نے بذیل مادہ برد تصریح کر دی ہے کہ بردی کا تلفظ فتحہ کے ساتھ ہے، جب اس پودے کا نام بردی ٹھہرا، لہذا عربوں کے ہاں قرطاس کا دوسرا نام ورق البردی ہے، اختصار کے خیال سے کبھی ورق البردی کو محض بردی کہہ دیتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کَتَبَ علی البردی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاں شخص نے ورق البردی یعنی قرطاس پر لکھا۔

چونکہ قرطاس ایک ایسے پودے سے تیار ہوتا تھا جو نے کی قسم سے تھا، اور نے کو عربی میں قَصَب کہتے ہیں، اس لیے عرب مصنفوں نے قرطاس کو وَرَقُ القَصَب بھی لکھا ہے۔

جب عربوں نے مصر فتح کیا تو اس کے بعد بھی مصری لوگ بردی کی کاشت کرتے رہے، اور اس سے قرطاس بدستور بناتے رہے، یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں کاغذ نے رفتہ رفتہ اس کی جگہ لے لی، اور چوتھی صدی ہجری میں قرطاس بالکل متروک ہوگیا۔

تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں جب عربوں نے صقلیہ (سسلی) فتح کیا تو انہوں نے

وہاں بردی کی کاشت کو رواج دیا، چنانچہ ابن حوقل جب چوتھی صدی میں وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کے صدر مقام بَلَرمْ (Palermo) کے نواح میں بردی بکثرت اگتا ہے، شہر سرقوسہ (Syracusa) کے نزدیک یہ پودا اب بھی پایا جاتا ہے، اور بعض لوگوں نے اس سے ازراہ تفنن ورق تیار کرنے کی کوشش کی ہو جو قدیم زمانے کے قرطاس سے ملتا جلتا ہے، اسکندریہ میں بھی مقامی بردی سے قرطاس سازی کا تجربہ کیا گیا ہے۔

قرطاس بنانے کا طریقہ بردی سے ورق تیار کرنے کا جو طریقہ قدیم مصریوں کے ہاں رائج تھا، اس کا ذکر رومی مصنف پلینی (Pliny) متوفی ۷۹ء نے اپنی نیچرل ہسٹری میں کیا ہے، لیکن اس کا بیان قدرے مبہم ہے، اور علماء نے اس کی تفسیر و تفہیم میں بڑی دماغ سوزی کی ہے، نیز ابو العباس نباتی کی زبان سے بھی ابن البیطار کی "مفردات" (صفحہ ۸۰) میں یہ طریقہ مذکور ہے، ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصری اس پودے کے تنے سے ایک ایک فٹ لمبے ٹکڑے کاٹ لیتے اور ان کو لمبائی کے رخ دو حصوں میں شق کرکے پانی میں ڈال دیتے تھے، نرم ہونے پر تیز چھری کے ساتھ ان کے پتلے پتلے قتلے کاٹتے جن کی چوڑائی ایک انچ کے قریب ہوتی تھی، اور پھر ان کو لکڑی کی ایک صاف تختی پر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بچھا دیتے تھے، پھر ان پر پتلی سی گوند پھیلا کر اسی قسم کے قتلوں کی ایک اور تہ ان کے عرض میں بچھا دیتے، اگر موٹا ورق درکار ہوتا تو قتلوں کی ایک تیسری تہ چڑھا دیتے، مرطوب ہونے کے بعد بردی کے گودے سے ایک قدرتی لزوجت نکلتی تھی، اور یہ لیسدار مادہ بھی ان قتلوں کو باہم پیوست ہونے میں مدد دیتا تھا، اس طرح سے ایک ورق تیار ہو جاتا اور

جب قدرے سوکھ جاتا تو لکڑی کے ہتھوڑے سے اس پر ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے جس سے ورق پیوستہ اور ہموار ہو جاتا، اور اس کا کھردراپن بھی دور ہو جاتا، یا اسے شکنجہ میں دبا کر ہموار کر لیتے اور مہرہ یا ہاتھی دانت کے ٹکڑے سے گھونٹ کر ملائم بنا لیتے تھے،

جو ورق مہرہ سے گھونٹ کر ملائم کیا جاتا، اسے عرب مصنفوں نے مُہرق کہا ہے اور فارسی میں ایسے ورق کو مہرہ دار کہتے ہیں، ابن البیطار متوفی ۶۴۶ھ نے اپنی کتاب "مفردات" میں سلیمان بن حسان کی روایت سے بردی کے ذیل میں یوں لکھا ہے:۔

ان اهل مصر تعرفه باسم	اہل مصر کے ہاں بردی فافیر کے نام سے مشہور
الفافیر وهو نبات یوجد فی	ہے، اور یہ ایک پودا ہے جو پانی میں پایا جاتا
الماء له ورق کخوص النخل	ہے، اس کے ورق کھجور کے پتوں کے مانند
وله ساق طویلة خضراء	ہوتے ہیں، اس کا ایک لمبا تنا ہوتا ہے
مائلة الی البیاض و یُتخذ	جس کی رنگت سفیدی مائل سبز ہوتی ہے،
من هذا النبات کاغذ ابیض	اس پودے سے سفید رنگ کا کاغذ بنایا
یقال له قرطاسٌ فمتی قیل	جاتا ہے جس کو قرطاس کہا جاتا ہے جب
فی الطبِ قرطاسٌ مُحرقٌ	علم طب میں قرطاس محرق کا ذکر آئے
فانّما یُرادُ به القرطاسُ	تو اس سے وہی قرطاس مراد ہے جو بردی
الذی یکون من البردی	کے پودے سے بنتا ہے۔

مندرجۂ بالا عربی عبارت کتاب مذکور کے مطبوعہ اڈیشن سے منقول ہے، مگر اس نسخہ میں دو لفظ غلط چھپ گئے ہیں، اول غافر کی بجائے فافیر پڑھنا چاہیے اور دوسرے میرا

خیال ہے کہ قرطاس محرق غالباً قرطاس مہرق کی تصحیف ہے، اس عبارت سے بہرحال زیر بحث مطالب کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب میں ۱۹۳۰ء میں برلن میں وارد ہوا، تو مجھے وہاں آثار قدیمہ کے سرکاری میوزیم میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، اس کا ایک بڑا ایوان قدیم مصری آثار کے لیے مخصوص تھا، اس کی ایک دیوار پر میں نے ایک نقشہ یا چارٹ آویزاں دیکھا، جو ایک شیشہ کے چوکھٹے کے اندر بڑے قرینہ سے آراستہ تھا، اس نقشہ میں تصاویر کے ذریعہ سے قرطاس سازی کے طریقہ کو دکھایا گیا تھا، اور اس صنعت کے تمام مراحل کو تصاویر کے ذریعہ سے واضح کیا گیا تھا، جن کو کسی چابک دست ہنرور (آرٹسٹ) نے تیار کیا تھا، پہلی تصویر بردی کے پورے پودے کی تھی، جو ایک جوہڑ کے کنارے ہوا میں لہلہا رہا تھا۔ اس کے بعد دیگر تصاویر میں اس کے مختلف حصوں یعنی اس کے تکون تنے، اس کی شاخوں اور اس کے خوبصورت شگوفوں کو الگ الگ تفصیلاً دکھایا گیا تھا، اس کے بعد ورق سازی کے مختلف مراحل کی وضاحت تھی، میرا خیال ہے کہ یہ نقشہ قدیم کتابوں کے بیانات کی روشنی میں تیار کیا گیا تھا، کیونکہ اس میں قرطاس سازی کا جو طریقہ دکھایا گیا تھا وہ تقریباً وہی تھا جو سطور بالا میں مذکور ہوا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے حاکم المنذر بن ساوی کے نام جو تبلیغی مراسلہ بھیجا تھا، اور جس کی عبارت بعض کتب سیرت میں محفوظ ہے، اس کا اصل گذشتہ صدی میں منظر عام پر آیا تھا، اس کا فوٹوگراف جرمن اورینٹل سوسائٹی کے مجلہ بابت ۱۸۶۳ء میں چھپا تھا اور اس کی نقل ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی فرانسیسی سیرت نبویہ میں بھی مندرج ہے، اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مراسلہ قرطاس پر لکھا گیا تھا،

کیونکہ اس میں بردی کے ریشے اور اس کی پٹیاں یعنی قطعے جن کے باہم جوڑنے سے قرطاس کا ورق تیار ہوتا ہے، صاف دکھائی دیتے ہیں، عمودی پٹیوں کا عرض ۳/۴ انچ ہے، اور افقی پٹیاں عرض میں ۱ ۱/۵ انچ کے قریب ہیں، مراسلہ کے کونے بوسیدہ ہوکر گر چکے ہیں، قرطاس اور عام کاغذ میں یہ فرق ہے کہ کاغذ کی بافت اور بناوٹ یکساں ہوتی ہے، لیکن قرطاس کے بوسیدہ ہونے کے بعد بردی کے گودے کے ریشے اور اسکی پٹیاں اکثر اوقات صاف نظر آتی ہیں، بہرحال اس فوٹوگراف سے قرطاس کی ساخت پر بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ہے، اور قدیم کتابوں میں قرطاس کی بناوٹ کی جو کیفیت لکھی ہے، اس کی تشریح و تصدیق ہوتی ہے۔

عربی قرطاسوں کی بہت سی عکسی نقلیں ان کتابوں میں شائع ہو چکی ہیں جو پروفیسر مارگولیتھ اور پروفیسر گرومان نے عربی قراطیس کے بارے میں تالیف کی ہیں، اور جن کا ذکر اس مقالہ میں آئے گا، ان نقول میں قرطاس کی بافت اور ساخت کی کیفیت کم و بیش ویسی ہی ہے جیسی کہ مذکورہ بالا مراسلہ کی نقل میں مشاہدہ میں آئی ہے۔

قرطاس دیارِ عرب میں فافیر یا بردی سے جو ورق تیار ہوتا تھا، وہ نہ صرف مصر میں لکھنے کے کام آتا تھا، بلکہ بیرونی ملکوں میں بھی بکثرت برآمد ہوتا تھا، قدیم عرب بھی اس سے بخوبی واقف تھے اور اسے قرطاس کہتے تھے، قرطاس کے قاف پر تینوں حرکات آئی ہیں، یہ لفظ اعشیٰ اور دوسرے جاہلی شعراء کے کلام میں ملتا ہے، اور قرآن پاک (سورۂ انعام آیہ ۷) میں بھی اس کا یوں ذکر آیا ہے:-

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَاباً فِيْ	یعنی اگر ہم تجھ پر (اے نبی) قرطاس پر
قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ	لکھی ہوئی کتاب اتارتے اور یہ لوگ

كَمَا قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔

اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب بھی جو لوگ کافر ہیں، یہی کہتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔"

پھر آگے چل کر اسی سورت کی ۹۱ ویں آیت میں یہی لفظ بصیغۂ جمع یعنی قراطیس کی صورت میں استعمال ہوا ہے

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا

(اے نبی) کہدے کہ کس نے اتاری تھی وہ کتاب جو موسیٰ لایا تھا اور جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی جس کو تم صحیفے بنا کر رکھتے ہو۔ اس کے کچھ حصے تم (لوگوں پر) ظاہر کرتے ہو اور بہت سے حصے کو چھپاتے ہو۔"

مندرجۂ بالا پہلی آیت میں قرطاس ورق کے معنی میں آیا ہے، جو کتابت کے لیے استعمال ہوتا تھا اور دوسری آیت میں قراطیس سے مراد وہ صحیفے ہیں جو قرطاس پر لکھے جاتے تھے، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت بلادِ عرب میں یا کم از کم حجاز میں لوگ قرطاس سے بخوبی آشنا تھے، اور یہود اپنی مذہبی کتابیں اسی قرطاس پر لکھتے تھے، البیرونی نے اس سلسلہ میں صراحت کر دی ہے کہ قراطیس سے مراد طوامیر (یعنی Rolls) ہیں، اور قرطاس کے بارے میں بھی یہ کہہ کر مزید وضاحت کر دی ہے کہ اِنَّ القرطاس معمول بمصر من لُبّ البردی۔ یعنی قرطاس مصر میں بردی کے گودے سے بنتا ہے۔ (کتاب الہند، ص ۸۰)

لفظ قرطاس کی لغوی تشریح ابو منصور جوالیقی بغدادی نے کتاب المعرب میں اور امام جلال الدین

سیوطی نے الاتقان میں اور شہاب الدین خفاجی نے شفاء الغلیل میں قرطاس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لفظ ٹھیٹھ عربی نہیں بلکہ معرّب ہے، اس کے علاوہ لسان العرب میں اس لفظ کی پانچ مختلف صورتیں لکھی ہیں، یعنی قَرطاس، قِرطاس، قُرطاس، قِرطس اور قَرطس۔ چنانچہ اس کے املاء اور تلفظ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ بھی اس کے غیر عربی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اگرچہ مذکورۂ بالا علماء نے قرطاس کو معرّب تسلیم کیا ہے لیکن انھوں نے اسکے اصلی ماخذ پر روشنی نہیں ڈالی یعنی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے اور اسکی اصل صورت کیا تھی۔

پروفیسر زخاؤ نے جب جوالیقی کی کتاب المعرّب من الکلام الاعجمی ۱۸۶۷ء لائپزگ سے شائع کی تو انھوں نے اس پر حواشی بھی لکھے تھے، چنانچہ قرطاس کے بارے میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ یونانی لفظ (Xartes) (چارٹ) کا معرّب ہے، اور اکثر علماء نے اس قول کو قبول کر لیا ہے۔ قرطاس کا لفظ آرامی زبان میں بھی پایا جاتا ہے، ممکن ہے کہ عربوں نے اسے آرامی کے واسطے سے لیا ہو جو ظہور اسلام کے وقت شام اور فلسطین میں بولی جاتی تھی، یا اسے براہ راست یونانی سے اخذ کیا ہو۔

اس موقع پر ناظرین کرام کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عربوں نے اس سامان نوشت کے لیے جس کا ماخذ و مصدر مصر تھا، یونانی نام کیوں اختیار کیا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب اسکندر یہ اعظم نے مصر فتح کیا اور اس کی وفات کے بعد اسکے سپہ سالار بطلیموس نے وہاں اپنی حکومت قائم کی تو بہت سے یونانی اسکندریہ اور مصر کے دوسرے شہروں میں کثرت سے آباد ہو گئے، اور یونانی نے مصر میں سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت اختیار کر لی، اور ہر طرف یونانی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہو گیا، یونانیوں کے بعد جب رومیوں نے مصر پر قبضہ کیا تو ان کے عہد میں بھی یونانی زبان کا علمی اور

ثقافتی تسلط بدستور قائم رہا، اندریں حالات اگر عربوں نے مصری ورق کے لیے یونانی لفظ اختیار کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ بہت سے یونانی الفاظ مصر میں رواج پا چکے تھے۔

مغربی علمائے لغت کی تحقیق کے مطابق Xartes سے جو متعدد الفاظ مشتق ہوئے ہیں وہ ذیل کے نقشہ سے واضح ہیں:۔

یونانی Xartes (تلفظ کھارتیس)

آرامی:۔ قرطاس — لاطینی Charta

عربی: قرطاس — فرانسیسی Carte — انگریزی Chart

ہسپانی Alcartaz — انگریزی Chard

پرتگالی Chartaz

ہسپانی لفظ کی ابتداء میں جو al آیا ہے وہ عربی کا کلمۂ تعریف ال ہے، یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ لفظ اسپین کی زبان میں عربی ہی کے واسطہ سے مروج ہوا ہے۔

واقعۂ قرطاس | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے دوران میں واقعۂ قرطاس پیش آیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کے لیے سامان نوشت طلب فرمایا تھا، متاخرین نے اس موقع پر قرطاس کا ذکر کیا ہے، لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے اور شیخینؓ[1] نے بھی اس سلسلہ میں محض کتاب کا لفظ استعمال کیا ہے، بہرحال اس امر میں کچھ شک

---

[1] جب صحابۂ کرام کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب ہیں، جب محدثین کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ہیں، اور جب فقہاء کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ ہیں۔

نہیں کہ عہد رسالت میں عربوں کے ہاں قرطاس ایک معروف چیز تھی، جیسا کہ قرآن پاک کی مذکورۂ بالا دو آیتوں سے ثابت ہے، جن میں قرطاس کا لفظ ایک مرتبہ بصیغۂ واحد اور دوسری مرتبہ بصیغۂ جمع استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جب ان کے ارشاد پر حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن مجید کو صحیفوں کی صورت میں جمع کیا، تو وہ بھی ایک روایت کے مطابق قرطاس ہی پر لکھے گئے تھے، قلقشندی کا بیان ہے کہ ان کے لیے چمڑا استعمال ہوا تھا، لیکن سیوطی نے اس بیان کو مستند نہیں سمجھا۔

طومار | قرطاس کے ورق کا عرض عام طور پر ۹ انچ اور اس کا طول زیادہ سے زیادہ ۱۵ انچ ہوا کرتا تھا، لمبی تحریر کے لیے ایک ورق کے ساتھ دوسرا ورق گوند سے جوڑ دیتے تھے، اور اس طرح سے بیس بیس ورق کا ایک لمبا سلسلہ تیار ہو جاتا تھا، جسے طومار کہتے تھے، اور جس کی جمع طوامیر آتی ہے، طومار کو انگریزی میں Roll یا Scroll کہتے ہیں۔

طومار کو عربوں نے دَرْج یا دَرَج بھی کہا ہے (صحاح جوہری)۔ ہمارے ہاں "دَرْج کرنا"، "اندراج پانا" یا "مندرج ہونا" کے جو کلمات مستعمل ہیں، وہ تمام اسی لفظ درج سے مشتق ہیں۔

طومار کے اندر کی تحریر عمود یعنی کالم (Column) کی صورت میں ہوتی تھی، ایک کالم کے بعد دوسرا کالم لکھا جاتا تھا، اور یہ کالم آجکل کی مروجہ کتابوں کے صفحات کے مترادف تھے، طومار کی ایک جانب لکڑی کا باریک سا بیلن جوڑ دیتے تھے، اور اس پر طومار کو لپیٹے تھے، اس بیلن کے دونوں کناروں پر لکڑی کے دو

چھوٹے لٹو بھی لگا دیتے، تاکہ بیلن کو گھمانے اور طومار کو لپیٹنے میں آسانی ہو۔ قاری پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے طومار کو کھولتا اور دوسرے ہاتھ سے لپیٹتا جاتا تھا۔ طومار کے لیے انگریزی میں Roll کا جو لفظ آیا ہے اس میں اسی لپیٹنے کے عمل کی طرف اشارہ مضمر ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی سورۃ الانبیاء میں جہاں قیامت کے دن آسمان کے سجل کی طرح لپیٹے جانے کا ذکر آیا ہے، وہ بیان بھی طوماروں پر صادق آتا ہے، يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ یعنی جس دن ہم آسمان کو لکھے ہوئے طومار کی مانند لپیٹ لیں گے۔" ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ ہماری مروجہ کتابوں پر درست نہیں بیٹھتی، جو اوراق کی شیرازہ بندی سے بنتی ہیں اور جن کے مطالعہ کے لیے ہم کو ان کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، بلکہ یہ تشبیہ صرف طوماروں پر صادق آتی ہے، جو لپیٹا جاتا تھا، چنانچہ علامہ زمخشری، قاضی بیضاوی اور امام خازن نے اس آیت کی تفسیر میں سجل سے طومار یا صحیفہ ہی مراد لیا ہے۔

کراسہ کبھی قرطاس کے اوراق کو اوپر تلے رکھ کر ایک پلندہ سا تیار کر لیتے، اور اس میں سے ڈوری گزار کر تمام اوراق کو یکجا کر لیتے تھے، اس قسم کے پلندے کو کراسہ کہتے تھے، کراسہ آرامی زبان کا لفظ ہے۔

صحیفہ اور مصحف محمد بن اسحٰق نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کے قبول اسلام کے بارے میں جو روایت بیان کی ہے اس میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ آپ کو جس وقت بتایا گیا کہ آپ کی ہمشیرہ اور بہنوئی دونوں اسلام کے حلقہ بگوش بن چکے ہیں اور آپ دریافتِ حالات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے تو اس وقت خبابؓ بن الارت ان کے ہاں موجود تھے، اور حضرت خبابؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورہ طٰہٰ مرقوم تھی

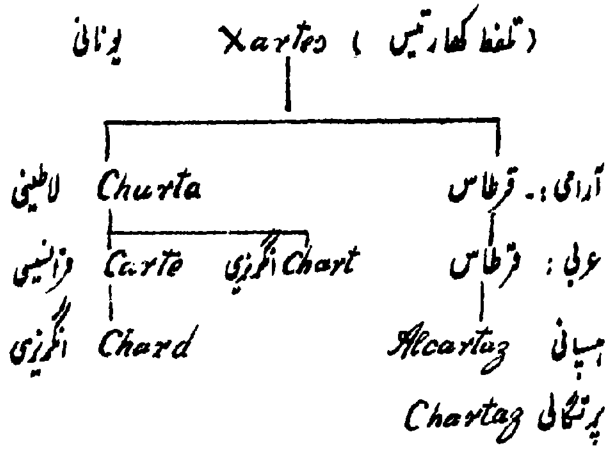
سیوطی نے الاتقان میں اور شہاب الدین خفاجی نے شفا الغلیل میں قرطاس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لفظ ٹھیٹھ عربی نہیں بلکہ معرب ہے، اس کے علاوہ لسان العرب میں اس لفظ کی پانچ مختلف صورتیں لکھی ہیں، یعنی قَرطاس، قِرطاس، قُرطاس، قِرطس اور قَرطس۔ چنانچہ اس کے املا، اور تلفظ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ بھی اس کے غیر عربی ہونے کی ایک دلیل ہے، اگرچہ مذکورۂ بالا علماء نے قرطاس کو معرب تسلیم کیا ہے لیکن انھوں نے اسکے اصلی ماخذ پر روشنی نہیں ڈالی یعنی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے، اور اسکی اصل صورت کیا تھی۔

پروفیسر زخاؤ نے جب جوالیقی کی کتاب المعرّب من الکلام الاعجمی ۱۸۶۷ء لائبزگ سے شائع کی تو انھوں نے اس پر حواشی بھی لکھے تھے، چنانچہ قرطاس کے بارے میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ یونانی لفظ (Xartes) (چارٹ) کا معرب ہے، اور اکثر علماء نے اس قول کو قبول کر لیا ہے، قرطاس کا لفظ آرامی زبان میں بھی پایا جاتا ہے، ممکن ہے کہ عربوں نے اسے آرامی کے واسطہ سے لیا ہو جو ظہور اسلام کے وقت شام اور فلسطین میں بولی جاتی تھی، یا اسے براہ راست یونانی سے اخذ کیا ہو۔

اس موقع پر ناظرین کرام کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عربوں نے اس سامان نوشت کے لیے جس کا ماخذ و مصدر مصر تھا، یونانی نام کیوں اختیار کیا، اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جب اسکندر یہ اعظم نے مصر فتح کیا اور اس کی وفات کے بعد اسکے سپہ سالار بطلیموس نے وہاں اپنی حکومت قائم کی تو بہت سے یونانی اسکندریہ اور مصر کے دوسرے شہروں میں کثرت سے آباد ہوگئے، اور یونانی نے مصر میں سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت اختیار کر لی، اور ہر طرف یونانی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہو گیا، یونانیوں کے بعد جب رومیوں نے مصر پر قبضہ کیا تو ان کے عہد میں بھی یونانی زبان کا علمی اور

ثقافتی تسلط بدستور قائم رہا، اندریں حالات اگر عربوں نے مصری ورق کے لیے یونانی لفظ اختیار کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ بہت سے یونانی الفاظ مصر میں رواج پا چکے تھے۔

مغربی علمائے لغت کی تحقیق کے مطابق Xartes سے جو متعدد الفاظ مشتق ہوئے ہیں وہ ذیل کے نقشہ سے واضح ہیں :-



ہسپانی لفظ کی ابتدا میں جو al آیا ہے وہ عربی کا کلمۂ تعریف ال ہے، یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ لفظ اسپین کی زبان میں عربی ہی کے واسطے سے مروج ہوا ہے۔

واقعۂ قرطاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے دوران میں واقعۂ قرطاس پیش آیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کے لیے سامان نوشت طلب فرمایا تھا۔ متاخرین نے اس موقع پر قرطاس کا ذکر کیا ہے، لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے اور شیخینؒ[1] نے بھی اس سلسلہ میں محض کتاب کا لفظ استعمال کیا ہے، بہرحال اس امر میں کچھ شک

---

[1] جب صحابۂ کرام کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب ہیں، جب محدثین کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ہیں، اور جب فقہاء کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ ہیں۔

نہیں کہ عہدِ رسالت میں عربوں کے ہاں قرطاس ایک معروف چیز تھی، جیسا کہ قرآن پاک کی مذکورۂ بالا دو آیتوں سے ثابت ہے، جن میں قرطاس کا لفظ ایک مرتبہ بصیغۂ واحد اور دوسری مرتبہ بصیغۂ جمع استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں جب ان کے ارشاد پر حضرت زید بنؓ ثابت نے قرآن مجید کو صحیفوں کی صورت میں جمع کیا، تو وہ بھی ایک روایت کے مطابق قرطاس ہی پر لکھے گئے تھے، قلقشندی کا بیان ہے کہ ان کے لیے چمڑا استعمال ہوا تھا، لیکن سیوطی نے اس بیان کو مستند نہیں سمجھا۔

طومار | قرطاس کے ورق کا عرض عام طور پر ۹ انچ اور اس کا طول زیادہ سے زیادہ ۱۵ انچ ہوا کرتا تھا، لمبی تحریر کے لیے ایک ورق کے ساتھ دوسرا ورق گوند سے جوڑ دیتے تھے، اور اس طرح سے بیس بیس ورق کا ایک لمبا سلسلہ تیار ہو جاتا تھا، جسے طومار کہتے تھے، اور جس کی جمع طوامیر آتی ہے، طومار کو انگریزی میں Scroll یا Roll کہتے ہیں۔

طومار کو عربوں نے دَرْج یا دَرَج بھی کہا ہے (صحاح جوہری)۔ ہمارے ہاں دَرج کرنا" "اندراج پانا" یا "مندرج ہونا" کے جو کلمات مستعمل ہیں، وہ تمام اسی لفظ درج سے مشتق ہیں۔

طومار کے اندر کی تحریر عمود یعنی کالم (Column) کی صورت میں ہوتی تھی، ایک کالم کے بعد دوسرا کالم لکھا جاتا تھا، اور یہ کالم آجکل کی مروجہ کتابوں کے صفحات کے مترادف تھے، طومار کی ایک جانب لکڑی کا باریک سا بیلن جوڑ دیتے تھے، اور اس پر طومار کو لپیٹتے تھے، اس بیلن کے دونوں کناروں پر لکڑی کے دو

چھوٹے لٹو بھی لگا دیتے، تاکہ بیلن کو گھمانے اور طومار کو لپیٹنے میں آسانی ہو، قاری پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے طومار کو کھولتا اور دوسرے ہاتھ سے لپیٹتا جاتا تھا طومار کے لیے انگریزی میں Roll کا جو لفظ آیا ہے اس میں اسی لپیٹنے کے عمل کی طرف اشارہ مضمر ہے، اسی طرح قرآن مجید کی سورۃ الانبیاء میں جہاں قیامت کے دن آسمان کے سجل کی طرح لپیٹے جانے کا ذکر آیا ہے، وہ بیان بھی طومار ہی پر صادق آتا ہے، یَوْمَ نَطْوِی السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ، یعنی جس دن ہم آسمان کو لکھے ہوئے طومار کی مانند لپیٹ لیں گے۔" ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ ہماری مروجہ کتابوں پر درست نہیں بیٹھتی، جو اوراق کی شیرازہ بندی سے بنتی ہیں اور جن کے مطالعہ کے لیے ہم کو ان کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، بلکہ یہ تشبیہ صرف طومار ہی پر صادق آتی ہے، جو لپیٹا جاتا تھا، چنانچہ علامہ زمخشری، قاضی بیضاوی اور امام خازن نے اس آیت کی تفسیر میں سجل سے طومار یا صحیفہ ہی مراد لیا ہے۔

کرّاسہ کبھی قرطاس کے اوراق کو اوپر تلے رکھ کر ایک پلندہ سا تیار کر لیتے، اور اس میں سے ڈوری گزار کر تمام اوراق کو یکجا کر لیتے تھے، اس قسم کے پلندے کو کرّاسہ کہتے تھے، کرّاسہ آرامی زبان کا لفظ ہے۔

صحیفہ اور مصحف محمد بن اسحٰق نے حضرت عمر بن الخطاب کے قبولِ اسلام کے بارے میں جو روایت بیان کی ہے اس میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ آپ کو جس وقت بتایا گیا کہ آپ کی ہمشیرہ اور بہنوئی دونوں اسلام کے حلقہ بگوش بن چکے ہیں اور آپ دریافتِ حالات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے تو اس وقت خباب بن الارت ان کے ہاں موجود تھے، اور حضرت خبابؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورہ طٰہٰ مرقوم تھی

اور وہ ان دونوں کو یہ سب سورت پڑھا رہے تھے، اس سورت میں ۱۳۵ آیات ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ اتنی لمبی سورت جس صحیفہ میں مسطور ہوگی وہ کئی اوراق پر مشتمل ہوگا۔ اور اس کی صورت طوماری کی ہوگی جس کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے،

عہد صدیقی میں قرآن مجید جمع ہوا تھا، مگر وہ الگ الگ صحف یعنی صحیفوں میں تھا، جن کی صورت غالباً طوامیر ہی کی تھی، حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان صحیفوں کو نقل کرا کے یکجا کر دیا اور اس مجموعہ کا نام "مصحف" ٹھہرا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے مخالفین نے اپنی بے سمجھی سے آپ پر جو الزامات لگائے تھے، ان میں سے ایک الزام یہ تھا کہ قرآن تو بیشتر الگ الگ صحیفوں میں تھا، آپنے ان کو یکجا کیوں کر دیا۔

اگرچہ صحیفہ کا لفظ (بصیغۂ مفرد) قرآن پاک میں کہیں استعمال نہیں ہوا ہے اس کی جمع صحف کلام پاک کی متعدد سورتوں میں آٹھ مرتبہ آئی ہے۔ اور ہر موقع پر اس سے قدیم زمانے کی آسمانی کتابیں مراد ہیں، اس موقع پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صحیفہ اور مصحف دونوں لفظوں کا مادہ "صحف" ہے، جس کے معنی حمیری اور حبشی زبانوں میں بھی تحریر کرنے یا لکھنے کے ہیں، اور حبشی زبان میں تو مصحف کا لفظ کتاب کے معنی میں بہت عام ہے۔

قرطاس کے دفینے | گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں مصر میں قرطاس کے بہت سے دفینے دریافت ہوئے ہیں، مصر کی زمین بالعموم ریتلی ہے، اور آب و ہوا خشک، اس لیے بعض قرطاس بڑی اچھی حالت میں پائے گئے ہیں، اور اس سے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں، ابتدا میں یہ دفینے اتفاقی طور پر دریافت ہوئے تھے، لیکن جب علماء نے اُن کا بغور مطالعہ کیا اور انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان سے قدیم زمانے کے

متعلق ہر قسم کی قیمتی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں تو قراطیس کی تلاش منظم طریقہ سے ہونے لگی، اور بیرونی ملکوں کے علماء کی جماعتیں ان کی دریافت کے لیے وقتاً فوقتاً مصر میں وارد ہونے لگیں، چنانچہ ممفس، تیبہ، فیوم، اُدفو اور بہنسا وغیرہ مقامات سے بہت سے دفینے ملے، اور ان سے ہزاروں کی تعداد میں قرطاس حاصل ہوئے جو مصر، یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں گئے ہیں، اور علماء کے زیر مطالعہ ہیں،

قراطیس کے مطالعہ نے علمی دنیا میں اب ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جس کو انگریزی میں Papyrology اور جرمن زبان میں Papyrusforsch-ung کہتے ہیں، بعض علماء نے اس فن میں تخصص حاصل کیا ہے، اور ان کی تحقیقات کے نتائج مقالات کی صورت میں ایسے رسائل اور جرائد میں شائع ہو رہے ہیں جو اس موضوع کے ساتھ مخصوص ہیں۔

جو قرطاس مصر سے دستیاب ہوئے ہیں، ان کا تعلق وہاں کی تاریخ کے مختلف زمانوں سے ہے، بعض قدیم مصری زبان میں ہیں، بعض یونانی اور بعض عربی زبان میں ہیں، اور ان کے ذریعہ سے ہر دور کے متعلق ہماری معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مثلاً

قدیم مصری زبان کا ایک شاندار طومار دستیاب ہوا ہے، جو قرطاس پر لکھا ہوا ہے اور جس کا زمانہ تخمیناً سترہویں صدی قبل مسیح ہے، اس طومار میں فن جراحی کا ایک مکمل رسالہ مرقوم ہے، جو سائنس کی تاریخ کے متعلق غالباً سب سے زیادہ قدیم دستاویز ہے، اس طومار سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں نے جراحی میں اس درجہ ترقی کر لی تھی، جس سے اس فن پر مستقل رسالہ کے لکھنے کا امکان پیدا ہوا،

اکثر علماء کا خیال ہے کہ علم طب کی ابتدا مصر ہی سے ہوئی تھی، اس طومار کی دریافت سے جس کا موضوع علم جراحی ہے، اس نظریہ کی قوی تائید ہوتی ہے۔ اس طومار کو مسٹر ایڈون اسمتھ نے دریافت کیا تھا، اس لیے یہ اسی کے نام سے موسوم ہے، اور آج کل نیویارک کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے ہاں محفوظ ہے، اور اور اسے آثار قدیمہ کے مشہور ماہر پروفیسر جیمز ہنری برسٹڈ نے ترجمہ اور حواشی کے ساتھ شکاگو سے شائع کر دیا ہے۔

اسی طرح یونانی زبان کے جو قرطاس مصر سے دستیاب ہوئے ہیں اُن میں ایک مشہور یونانی ادیبوں، شاعروں اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف پائی گئی ہیں، اور ان میں بعض ایسی تالیفات بھی شامل ہیں جو خود یونان میں ناپید ہو چکی تھیں، مثلاً یہ بات تو علماء کو بخوبی معلوم تھی کہ ارسطو نے شہر اثینہ (Athens) کے آئین و دستور پر ایک کتاب لکھی تھی، لیکن وہ مدت دراز سے آفات زمانہ کی نذر ہو چکی تھی، لیکن اچانک ۱۸۹۱ء میں علمی دنیا یہ خبر سن کر دنگ رہ گئی کہ ارسطو کی یہ گمشدہ تالیف مصر میں قرطاسوں پر لکھی ہوئی مل گئی ہے، اب یہ نادر قرطاس برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں، اسی طرح یونانی زبان کے قراطیس میں "کلمات سیدنا عیسیٰ" (Logia of our Lord) بھی دستیاب ہوئے ہیں جو مذہبی تاریخ کے لحاظ سے بیحد دلچسپ اور اہم ہیں، کیونکہ ان میں حضرت عیسیٰ کے بعض ایسے کلمات اور ملفوظات بھی پائے گئے ہیں جو مروجہ اناجیل میں مذکور نہیں ہیں[1]۔

عربی زبان کے قراطیس | عربی زبان کے قرطاسوں کا علمی مطالعہ سب سے پہلے فرانس کے مشہور

---

[1] ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا بذیل "Logia"۔

مستشرق سلوستر وساسی (Silbestre de Sacy) متوفی ۱۸۳۸ء نے شروع کیا۔ جو قرطاس اس نے شائع کیے وہ ۱۸۲۵ء میں سقارہ کے قریب دیرا بوہرمس سے ملے تھے۔ اس کے بعد آسٹریا کے شاہی کتبخانہ کے خازن فان قرہ باشق (Von Karabaçek) متوفی ۱۹۱۸ء نے اس موضوع پر خاص توجہ مبذول کی اور ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان عربی قرطاس اور کاغذ کے متعلق بہت سے تحقیقی مقالات جرمن زبان میں لکھے۔

ایک جرمن کاؤنٹ رائن ہارٹ نے مصر میں بہت سے عربی قرطاس جمع کیے تھے۔ ان کو بعد ازاں شاٹ نے ہائڈل برگ (جرمنی) کی یونیورسٹی لائبریری میں وقف کر دیا۔ یہ مجموعہ اب Schott-Reinhardt کے نام سے مشہور ہے، جس میں بارہ سو کے قریب قرطاس ہیں۔ اکثر عربی زبان میں ہیں، مگر بعض میں یونانی تحریریں بھی ملتی ہیں۔ پروفیسر بکر (C. H. Becker) نے اس مجموعہ کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو ۱۹۰۶ء میں ہائڈل برگ سے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا اور اس میں بعض قرطاسوں کی عکسی نقلیں بھی شامل کیں۔ ان میں بعض قرطاس قرہ بن شریک والیِ مصر کے دالے کے ہیں، جس نے خلیفہ ولید بن عبد الملک اموی کے عہد میں مصر پر ۹۰ھ سے لیکر ۹۶ھ تک حکومت کی تھی۔ ذیل میں دو قرطاسوں کی عبارت منقول ہے جن میں چند مقامات کے خراج کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هذا كتاب من قرة بن شريك لاهل سيوا جيا من كورة

اشقوة انه اصابكم من جزية سنة ثمان وثمانين دينار اوسدس دينار

عددا وكتب راشد فى صفر من سنة احدى وتسعين ۔

بسم الله الرحمٰن الرحيم

هذا الكتاب من قرة بن شريك لاهل سيو البسيرو من كورة

اشقوة انه اصابكم من جزية سنة ثمان وثمانين مائة دينار

واربعة دينار وثلث دينار عددا ومن ضريبة الطعام احد

عشر اردب قمح وثلث اردب وكتب راشد فى صفر من سنة

احدى وتسعين ۔

مصر میں جو عربی قرطاس دستیاب ہوئے ہیں ان میں سرکاری کاغذات اور نجی مراسلات کے علاوہ کچھ ایسا مواد بھی ملا ہے جس کا تعلق طب، شعر و شاعری اور حدیث نبویؐ کے ساتھ ہے۔ آج تک اس قسم کا جو ذخیرہ دریافت ہوا ہے اس میں غالباً سب سے زیادہ اہم ۲۸ اوراق کا وہ صحیفہ ہے جس میں ابو محمد عبداللہ بن وہب بن مسلم قرشی مصری متوفی ۱۹۷ھ کی کتاب الجامع فی الحدیث مرقوم ہے۔ یہ صحیفہ اُدفُو کے مقام سے ملا تھا اور اب قاہرہ کے قومی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

انگلستان کے عربی قراطیس عربی قراطیس کے چند مجموعے انگلستان میں بھی موجود ہیں، مثلاً کچھ عربی قرطاس لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں، اگرچہ اب تک ان میں سے بہت کم دائرۂ تحقیق یا معرض اشاعت میں آئے ہیں، عربی قرطاسوں کا ایک بڑا مجموعہ اوکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں بھی محفوظ ہے جس کی فہرست پروفیسر مارگولیتھ نے ۱۸۹۳ء میں شائع کر دی تھی، اسی قسم کا ایک ذخیرہ مانچسٹر کی جان ریلانڈز لائبریری (J. Rylands Library) میں بھی موجود ہے، پروفیسر ممدوح اس ذخیرہ کا بھی کئی سال تک مطالعہ

کرتے رہے اور انھوں نے آخر کار ۱۹۳۳ء میں اس کی مفصل فہرست شائع کی جس میں چالیس قراطیس کی عکسی نقول بھی شامل تھیں، پروفیسر موصوف کو عربی زبان پر جو غیر معمولی عبور حاصل تھا، اور ان کی طبیعت میں جو مشکل پسندی تھی، ان کی بدولت وہ عربی قراطیس کے مطالعہ میں خوب کامیاب رہے اور اس میدان تحقیق میں انکی مساعی خوب بار آور ہوئیں، انگلستان میں عربی قراطیس کے متعلق آجتک جسقدر تحقیقی کام ہوا ہے وہ بیشتر پروفیسر مارگولیتھ ہی کے علمی تبحر کا رہین منت ہے، وفات (۱۹۴۰ء) کے بعد انگلستان میں مجھے ایسا کوئی مرد میدان نظر نہیں آتا جو اس سنگلاخ میدان کی مشکلات کا حریف بن سکے۔

انگلستان کے مذکورۂ بالا علمی مرکزوں کے علاوہ عربی قرطاسوں کے وافر ذخیرے قاہرہ، پیرس، برلن، ویانا اور سٹراسبورگ میں بھی موجود ہیں،

پراہا (Prague) یونیورسٹی کے پروفیسر اڈولف گروہمان (Grohmann)[1] ایک مدت دراز سے عربی قرطاسوں کا بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مطالعہ کر رہے ہیں اور آج کل اس موضوع پر سند مانے جاتے ہیں، متفرق مقالات کے علاوہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں اس مضمون پر جرمن زبان میں ایک جامع کتاب لکھی تھی، اور عربی قراطیس کے متعلق اس وقت تک جو معلومات حاصل ہو چکی تھیں، ان کو قرینہ کے ساتھ یکجا جمع کر دیا تھا، پھر اسی کتاب کو انھوں نے عربی کا جامہ پہنایا اور اس کا نام اوراق البردی باللغۃ العربیۃ رکھا، قاہرہ کے قومی کتب خانہ میں جو عربی قرطاس محفوظ ہیں، پروفیسر موصوف نے ان کو بھی کئی جلدوں میں شائع کر دیا ہے[1]

---

[1] *Adolf Grohmann*:-

(1) *Allgemeine Eimfuhrang in die arabischen Papyri Wien 1924*

(2) *From The world of Arabic Papyri 1952*

(3) *Arabic Papyri in The Egyptian Library Vols. 1934-1955*

عربی قراطیس کا مطالعہ امریکہ میں | اس موضوع کی دشواری کے باوجود عربی قراطیس کے متعلق امریکہ میں بھی تحقیقی کام شروع ہو چکا ہے، جس کے لیے ہم ایک عربی الاصل خاتون نبیہہ عَبّود (Nabiha Abbott) کے ممنون ہیں، محترمہ شکاگو یونیورسٹی میں اسلامیات کی تعلیم دیتی ہیں، اور اس کے علاوہ وہاں کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ بھی منسلک ہیں، جو مشرقی ملکوں کے آثار قدیمہ کی تحقیق میں عالمگیر شہرت رکھتا ہے، کچھ عرصہ سے موصوفہ نے عربی قرطاسوں کا مطالعہ شروع کر رکھا ہے، اور اپنے مجوزہ سلسلہ کی دو جلدیں شائع کر چکی ہیں، جن کی تدوین و ترتیب مضامین کے لحاظ سے ہوگی، پہلی جلد (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) میں ایسے قرطاسوں کا مطالعہ کیا گیا ہے، جن کی نوعیت تاریخی ہے، چنانچہ اس ضمن میں آٹھ عرب مورخین زیر بحث آئے ہیں، جن کا زمانہ آٹھویں صدی سے لیکر دسویں صدی عیسوی تک ممتد ہے۔ اس جلد میں ۱۳ قرطاسوں کی عکسی نقول بھی مندرج ہیں، دوسری جلد میں جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، ایسے قراطیس سے بحث کی گئی ہے جو علم تفسیر اور حدیث سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے مندرجات مروجہ تفاسیر اور سنن سے بھی قدیم تر ہیں، اس جلد کی ضخامت تین سو صفحات سے زیادہ ہے، اور اس میں عکسی نقول کی ۱۰ پلیٹیں بھی شامل ہیں۔[1]

---

[1] Nabiha Abbott: Studies in Arabic Papyri

Vol. I: Historical Documents. 1956

Vol. II: Tafsir and Tradition. 1967

Published by The Oriental Institute University of Chicago.

اس تفصیل سے میرا مقصود یہ ہے کہ ناظرین کرام کو اس امر کا کسی قدر اندازہ دلایا جائے کہ عربی قراطیس کا مطالعہ کس قدر اہم ہے، اور بلاد مغرب میں وہ کس حد تک ترقی کر چکا ہے، لیکن اپنا یہ حال ہے کہ ابنائے وطن کو ابھی تک یہ سمجھانا ضروری ہے کہ قرطاس کی اصلیت اور کیفیت کیا ہے، اور ان کو ابھی اس بات سے مطلع کرنا باقی ہے کہ دنیا کے کئی علمی مرکزوں میں عربی قراطیس کے کثیر ذخیرے موجود ہیں اور وہ بیش قیمت علمی اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہیں، اور اس اعتبار سے مطالعہ اور استفادہ کے لائق ہیں۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

قرطاس کی علمی اور تمدنی اہمیت | عہد قدیم کے مہذب اور متمدن ملکوں میں قرطاس کو اپنے رواج عام کی بنا پر وہی اہمیت اور قدر و منزلت حاصل رہی ہے جو آجکل کاغذ کو حاصل ہے، ہزاروں سال تک نہ صرف خود اہل مصر قرطاس پر لکھتے رہے، بلکہ یہودیوں کی مذہبی کتابیں بھی اسی پر لکھی گئیں، یونانیوں نے بھی اپنا فلسفہ و حکمت اسی قرطاس میں قلمبند کیا، رومیوں کے لیے بھی اس کا استعمال ناگزیر ٹھہرا، غرضکہ قدیم زمانے میں زندگی کی عام ضروریات کی کفالت کے علاوہ علوم و فنون کی حفاظت و اشاعت میں قرطاس نے وہی کام دیا ہے جو فی زمانا کاغذ سر انجام دے رہا ہے، لہذا عہد قدیم کی حضارت قرطاس کی اسی طرح مرہون منت رہی ہے جس طرح آج کل کا تمدن کاغذ کا ممنون احسان ہے۔

(باقی)

مکتوبِ امریکہ

جناب پروفیسر حفیظ ملک شعبۂ سیاسیات ولینوا یونیورسٹی (امریکہ)

" اس خط میں بعض مفید باتیں ہیں، اس لئے ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُس کو شائع کیا جاتا ہے۔"

۲۵ راگست : ۱۹۷۰ء

مکرمی سید صاحب ! مئی اور جون کے شماروں میں آپ کا مضمون "پاکستان میں دو مہینے" پڑھا، جی یہ چاہتا تھا کہ مضمون ختم نہ ہو، آپ نے کیا کیا گل افشانی کی ہے، بہت ہی لطف اندوز ہوا،

جون کے شمارے میں آپ نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا ایک اقتباس درج کیا ہے، (ص ۔ ۴۲۷) آج سے چند سال پہلے جب ڈاکٹر صاحب میرے یہاں مہمان ہوئے تھے، تو میں نے اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کی تھی حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے "مسٹر بیک" پر قطعی کوئی تحقیق نہیں کی تھی، بلکہ مولانا بنگلوری نے جو کچھ "روشن مستقبل" میں لکھا تھا، اوس کو دہرا دیا ہے، اور اس میں زیادہ ذمہ داری سے کام نہیں لیا، اس میں مصلحت اندیشی زیادہ نظر آتی ہے، اس سلسلہ میں میں نے ایک مضمون سر سید پر لکھا تھا، جو حال میں لندن سے شائع ہوا ہے، جس میں

میں اپنے محترم دوست ڈاکٹر عابد حسین پر تنقید بھی کی ہے، اور اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ انھوں نے کوئی ذاتی تحقیق "مسٹر بیک" پر نہیں کی،

دہلی میں بدرالدین طیب جی کے جو کاغذات موجود ہیں اُن کی ایک کاپی حال ہی میں مجھے وصول ہوئی ہے، ان کاغذات میں بیک صاحب کے بھی چند خطوط ہیں، جو انھوں نے طیب جی کو لکھے تھے، ان خطوط سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نظریاتی قیادت سرسید کی تھی، بیک محض ایک وفادار سکریٹری کی حیثیت سے سرسید کی قیادت پر عمل کرتے تھے، میں ان دنوں جو کتاب سرسید پر لکھ رہا ہوں، اس میں ان مسائل کا ذکر آئے گا، اس خط میں اپنے مضمون (Theodore Beck) بھیج رہا ہوں، اپنے خیالات اور رائے سے آگاہ فرمائیے گا،

میری آپ سے ملاقات آج تک نہیں ہوئی، لیکن میں آپ کا مداح اور خوشہ چیں ہوں آپ علمی معاملات میں میری جو رہنمائی فرماتے رہتے ہیں، میں اس کے لئے آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ایک دن اعظم گڈھ میں حاضر ہوکر نیاز حاصل کروں گا،

ایک مرتبہ شیخ اکرام صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ سرسید کی تحریک کے خلاف رجعت پسندی کی قیادت مولانا شبلی نے کی تھی، میں ان دونوں کے اختلافات کی نوعیت کو سمجھتا ہوں، اور مولانا شبلی کو ہرگز رجعت پسند خیال نہیں کرتا، ایک حد تک (Conservatism) مولانا شبلی میں ضرور موجود ہے لیکن حالات اور واقعات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے، تو یہ کوئی عیب نہیں ہے، سرسید آخری سالوں میں لبر ازم میں انتہا پسند ہوگئے تھے، اس لئے مولانا شبلی کی تحریک گویا ایک

Corrective کی حیثیت رکھتی ہے،

اسلام کو سمجھنے کے لئے میں شبلی، سید سلیمان ندوی، اقبال اور سر سید سے استفادہ کرتا ہوں، Balanced understanding کے لئے شبلیؔ اور سر سید لازم و ملزوم ہیں، وجہ یہ ہے کہ اکثر فقہی مسائل کے سمجھنے کے لئے خود علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

آپ ایسے بزرگوں کا دم غنیمت ہے، اور ہم ایسے لوگوں کے لئے باعث فخر،

آپ نے جو باتیں میرے متعلق لکھی ہیں وہ آپ کے اخلاص اور محبت کی وجہ سے ہیں، ورنہ "من آنم کہ من دانم" میں گذشتہ ۱۷ برس سے امریکہ میں مقیم ہوں، اسلام بالخصوص ہندو پاکستان کے اسلامی تمدن سے میری لگن کی ابتدا یہیں سے ہوئی آج سے چودہ ۱۴ برس پہلے جب میں اپنی پہلی کتاب کے لئے مواد کی فراہمی اور تحقیق میں مصروف تھا تو واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس میں میرے شب و روز گزرتے تھے، بارہ یا چودہ گھنٹے روزانہ مطالعہ کا میرا معمول تھا، تاریخ کی سیکڑوں کتابیں نظر سے گذریں، فلسفہ اور عمرانیات کو پڑھا، اسلام کا مطالعہ بھی کیا لیکن لگن اس وقت شروع ہوئی، جب میں نے شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس سے اسلام کے متعلق جو کج فہمی تھی وہ دور ہونے لگی، ذہنی تسکین کے علاوہ قلبی سکون میسر آنے لگا گویا اب دوبارہ مسلمان ہوا لیکن اب اسلام پر ایمان محض روایتی اور موروثی نہیں تھا، بلکہ اس کی تصدیق دل بھی کرتا تھا اور دماغ بھی، پھر منزل صاف نظر آنے لگی، اور میں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ زندگی کا ثمرہ یہی ہوگا، جس کی طرف آپؐ نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

مغربی زندگی سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ اہلِ مغرب محنت کے عادی ہیں،

مغربی زندگی محض تعیش کی زندگی نہیں ہے، دور سے دیکھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ صرف زندگی سے لطف اندوز ہونا ہی جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے عوام اور خواص کی زندگی محنت اور مشقت کی زندگی ہے، لیکن مغربی تہذیب اس بات کی اجازت بھی دیتی ہے کہ کھانے کے بعد شیرینی کا ذائقہ بھی چکھا جائے، اہل مشرق اسی چیز کو عیش اور لطف اندوزی کہتے ہیں، عیش اور لطف اندوزی گویا "فرار" حیات کے لئے محض سستانے کا نام ہے، اسی عمرانی اور تاریخی نظریہ کو علامہ اقبال نے اس طرح بھی بیان کیا ہے،

ع : شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

ہمارے نوجوان جب مغرب میں آتے ہیں تو "لطف اندوزی" کے پہلو سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے تمدن میں "لطف اندوزی" کا نظریہ اور اس کی روایت موجود نہیں ہے، جب میں یہاں آیا تھا تو میری عمر ۲۴ سال کی تھی، اور اب چالیس کے پیٹے میں آرہی ہے، ابتدا میں لطف اندوزی کے پہلو سے بھی آشنا ہوا مگر پھر اس کی حقیقت کو سمجھ گیا، اس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں لیکن میں نے اکثر نوجوانوں کو دیکھا ہے، وہ لطف اندوزی ہی کو حاصل زیست سمجھ کر واپس چلے جاتے ہیں، اور ان کی زندگی بے کار ہو کر رہ جاتی ہے، یہی المیہ سید محمود کا تھا، اور یہی المیہ نواب وقار الملک کے صاحبزادے محمد احمد کا تھا، کہ عین جوانی میں مرگئے، انھوں نے شراب نوشی تو سیکھی لیکن اعتدال اختیار نہ کرسکے، اب بھی بعض اوقات ایسے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن میرے تجربہ میں اب ہندوستانی اور پاکستانی نوجوان طلبہ کی اکثریت بے راہ روی اختیار نہیں کرتی، اب سیاسی اور

تمدنی شعور کی حالت دوسری ہے،

اس خط میں علامہ اقبال کے متعلق ایک مضمون کی کاپی ارسال کر رہا ہوں، اپنی رائے سے مطلع فرمائیے گا، میں اس ہفتہ میں مسلم ورلڈ کو آپ کی طرف سے دو سالوں کا چندہ (8 ڈالر) بھیج دوں گا، وہ آپ کو اس کی اطلاع دیں گے، خط و کتابت میں وہ لوگ کچھ سست رفتار معلوم ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں اسٹاف معقول تعداد میں نہیں ہے،

والسلام

المخلص: حفیظ ملک

ہندوستان کے سلاطین، علما، ومشائخ
کے تعلقات پر ایک نظر

(طبع دوم)

ہندوستان میں مسلمان فرمانرواؤں کا عہد ۱۳ ویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر ۱۹ ویں صدی کے وسط تک ختم ہو جاتا ہے، اس مدت میں مختلف مذاق وطبیعت کے تقریباً ۸۴ بادشاہ ہوئے، اس مختصر کتاب میں انہی سلاطین اور فرمانرواؤں کے وقت کے علما، ومشائخ سے تعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس سے ضمناً اس پورے دور کی مذہبی ذہنی اور فکری تاریخ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں بالکل منفرد ہے،

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔اے

ضخامت: ۲۲۸ صفحے　قیمت: ۵ روپیے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

فتاوی رحیمیہ، جلد دوم، افادہ، مولانا حافظ قاری مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری، بڑی تقطیع کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۲۴ مجلد قیمت عہ، وغیر مجلد عہ، پتہ، عطرستان چوک بازار، سورت (گجرات)

اس مجموعۂ فتاوی کی پہلی جلد کا ان صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے، زیر نظر جلد میں کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب الاضحیہ، کتاب الذبائح، کتاب النکاح، کتاب الطلاق (بشمول رضاعت، عدت و حضانت) کتاب المساجد، کتاب الوقف، کتاب البیوع والربا، کتاب الحظر والاباحۃ، کتاب الرؤیا، کتاب الوصیۃ والمیراث رد بدعات اور کتاب المتفرقات کے زیر عنوان مختلف النوع استفسارات کے محققانہ اور تشفی بخش جواب دیئے گئے ہیں، بعض احکام کے مصالح اور حکمتیں بھی بیان کی گئی ہیں، اور بعض نئے پیش آمدہ مسائل کا بھی ذکر ہے، بدعات کے سلسلہ میں بعض اکابر علمائے بریلی کے فتوے نقل کرکے ان کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کی طرح اس میں بھی ہر ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے، اور حوالے میں کتب فقہ کے ساتھ کلام مجید احادیث نبوی اور صحابہ کرام کے تعامل کو التزام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، مگر دوسرے طبقوں کے مسلک کی تردید میں غیر ضروری طوالت لہجہ میں تلخی اور مناظرانہ رنگ پیدا ہوگیا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ نہایت مفید متنوع مسائل پر مشتمل اور تمام مسلمانوں علماء اور ارباب افتاء سب کے مطالعہ کے لائق ہے،

فارسی ادب بعہد اورنگ زیب، مرتبہ جناب ڈاکٹر نورالحسن صاحب انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴۰۰، مجلد مع گردپوش قیمت عہ، ناشر اندو پرنٹین

سوسائٹی، دھلی۔

ہندوستان کے تیموری فرمانرواؤں کی رزمیہ داستانوں سے قدیم تاریخیں بھری ہوئی ہیں لیکن ان کی بزم آرائی کے تذکرے کم لکھے گئے ہیں، دارالمصنفین نے ان کی تمدنی وسیاسی تاریخ کی طرح انکی علم پروری وادب نوازی کی جانب بھی توجہ کی جس کا مرقع بزم تیموریہ ہے مذکورۂ بالا کتاب لائق مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر دلی یونیورسٹی سے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے، اس میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے ادب وشاعری کا جسکو مغلوں کے زوال کا عہد سمجھا جاتا ہے مفصل اور محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، یہ تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے تین ابواب میں عالمگیر کے دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات اور اس عہد کی شاعری کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے پھر دو ابواب میں معروف وغیر معروف مثنوی نگار اور غزل گو شاعروں کا تذکرہ اور ان کے کمالات اور تصنیفات پر تبصرہ کیا گیا ہے، بقیہ ابواب میں فارسی نثر کا عمومی جائزہ، مکاتیب و انشار، داستان و قصص، ترجمے، موسیقی، تاریخ وسوانح، تصوف و اخلاق، لغت و فرہنگ اور شرح وغیرہ سے متعلق تصانیف کا ذکر اور ان پر تبصرہ ہے لیکن یہ تعجب ہے کہ شعر و سخن سے اورنگ زیب کی دلچسپی کا کوئی ذکر نہیں ہے، مذہبی کتابوں کا متفرقات میں نہایت سرسری ذکر کیا گیا ہے، غنی کے دیوان کی ترتیب کے سلسلہ میں ابن داراب کے مرتبہ دیوان کا جس کو حال ہی میں علی جواد زیدی صاحب نے اضافے کے ساتھ از سرِ نو کشمیر سے شائع کیا ہے کوئی ذکر نہیں ہے، ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب تلاش اور محنت سے لکھی گئی ہے، مواد و معلومات کی فراہمی میں بڑی چھان بین سے کام لیا گیا ہے، مصنف ابھی نوجوان ہیں لیکن تحریر میں پختگی، بیان میں شائستگی، تبصروں میں توازن اور حسن مذاق نمایاں ہے، یہ کتاب فارسی ادبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

مصلحینِ امت، مترجمہ شیخ نذیر حسین صاحب ایم۔ اے۔ بڑی تقطیع کاغذ کتابت و

طباعت غنیمت صفحات ۲۵۵ قیمت سے ر پتہ مکتبہ علمیہ لیک روڈ۔ لاہور،

ڈاکٹر احمد امین مرحوم، مصر کے مشہور فاضل و مصنف تھے، انھوں نے مسلمانوں کی علمی و مذہبی اور ذہنی و اجتماعی تاریخ پر کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب ان کی مشہور تصنیف زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث کا اردو ترجمہ ہے، اس میں عالم اسلام کی دس ممتاز شخصیتوں محمد بن عبد الوہاب، مدحت پاشا، سید جمال الدین افغانی، سر سید احمد خان، سید امیر علی، خیر الدین پاشا تونسی، علی مبارک پاشا، عبد اللہ ندیم، سید عبد الرحمن کواکبی، اور شیخ محمد عبدہٗ کے اصلاحی و تعلیمی کارناموں، اجتماعی و سماجی خدمات، ملی و قومی کاموں اور سیاسی و انقلابی جد و جہد کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے ان کے اصلاحی و انقلابی خیالات اور مختلف النوع کارناموں کے علاوہ ان کے مختصر حالات، عقائد و افکار اور ان کے عہد و ماحول کے عام سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات و رجحانات اور بعض اسلامی ملکوں کے اصلاحی و سماجی تحریکوں کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، لیکن جیسا کہ خود فاضل مترجم نے لکھا ہے، مصنف کو اردو زبان سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہندوستان کی عظیم شخصیتوں اور نامور رہنماؤں کا علم نہ ہو سکا اور انھوں نے سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کے متعلق انگریزی کتابوں سے حاصل شدہ معلومات پر اکتفا کیا ہے، اس لئے ان کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے، کتابت و طباعت کی غلطیاں بہت ہیں، اس کتاب کا نام "مصلحین امت" بھی کھٹکتا ہے، اس میں جن لوگوں کا ذکر ہے انھوں نے اپنے اپنے دائروں میں بلاشبہ مفید اصلاحی کام انجام دئے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر پر مصلحین امت کے اصطلاحی لفظ کا اطلاق مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔

محمد علی جناح، مترجمہ جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ ہے، پتہ:۔ علمی مجلس دلی ۶ کانجی دوار کاداس نے جو ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کی تحریکوں میں شریک اور

اس کے عینی شاہد ہیں، جنگ آزادی کے متعلق دو کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں، جو سنہ ۳۰ء تا ۳۷ء اور سنہ ۳۷ء تا سنہ ۴۸ء کے واقعات اور سیاسی کوائف پر مشتمل ہیں، ان میں متحدہ ہندوستان کے ان عظیم رہنماؤں کا بھی مفصل ذکر ہے، جن کا ملک کی آزادی اور سنہ ۴۷ء کے انقلاب میں نمایاں حصہ رہا ہے، جناب سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق بمبئی نے دونوں کتابوں کے وہ حصے جن کا بانی پاکستان محمد علی جناح سے تعلق ہے، سلیقہ سے مرتب کرکے سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب قائد اعظم کے ابتدائی خانگی واقعات اور ان کی رومانی شادی سے شروع اور ملک کی تقسیم کی داستان پر ختم ہوتی ہے اس میں اُن کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے اہم حالات، نجی زندگی کے بعض دلکش پہلو، اُن کی قد آور شخصیت کے مختلف النوع جلوے بے داغ کردار کے بلند نمونے، ہندو مسلمان دونوں میں انکی مقبولیت وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے مسٹر جناح کی قوم پروری کا خصوصیت سے تذکرہ کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ حقیقۃً وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے، انھوں نے پاکستان کی بازی نہیں جیتی، بلکہ کانگریسی لیڈر نہرو اور پٹیل بازی ہار گئے، پاکستان کے قیام کی ذمہ داری عموماً تمام تر مسلمانوں اور مسٹر جناح پر ڈالی جاتی ہے، لیکن خود ہندو مفکرین و مورخین کی نظر اس کے دوسرے پہلو و ن پر بھی پڑنے لگی ہے، چنانچہ مصنف کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں تاہم بہت سے لوگوں کو اب بھی اس سے اختلاف ہوگا، لیکن مصنف مسٹر جناح کے خاص دوستوں میں ہیں، برسوں اُن کے ساتھ کام کر چکے ہیں، اُن کی زندگی کے سارے نشیب و فراز اور جنگ آزادی کے ہر مرحلہ سے پوری طرح واقف ہیں، اس لئے مسٹر جناح کے بارہ میں اُن کی رائے بڑی وقیع ہے، اس کے علاوہ انھوں نے یہ سب کچھ اپنی تحریری یادداشتوں کی روشنی میں لکھا ہے، اسلئے اسکی حیثیت مستند تاریخی دستاویز کی ہے، یہ کتاب تنہا مسٹر جناح کی داستان حیات نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی گذشتہ نصف صدی کی سیاسی سرگذشت بھی ہے، اور اس سے جنگ آزادی کی پوری تاریخ اور اس کے لیڈروں کے خدمات کی تفصیل بھی سامنے آجاتی ہے، اس کے ترجمے سے اردو کے ذخیرہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔ "ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

...ؤ صحابہ: (حصۂ اول) قیمت: ؎

...ؤ صحابہ: (حصۂ دوم) " ؎

...ؤ صحابیات: " ؏

...یخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: ؏

...مائے اسلام: (حصۂ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: ؏

...مائے اسلام: (حصۂ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ؏

...عرالہند (حصۂ اول) " ؏

...عرالہند (حصۂ دوم) " ؏

۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: ؏

۱۰- سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: - (زیرِ طبع)

۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ؏

۱۲- ابنِ خلدون: ابنِ خلدون کے سوانحِ زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیرِ طبع)

۱۳- اقبالِ کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ؏

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی ...ی تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل ...بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے ...ر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۴۴۶ قیمت: ؏ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریقِ مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں غیر مسلم رعایا کے حقوق حیوانات کے حقوق اور اُن کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے، قیمت :- ۵۰ روپے

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)　　　　نومبر سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

مجلسِ ادارت

۱۔ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

۲۔ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الٰہ آباد

۳۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے

سلسلۂ تاریخ ہند

عہدِ مغلیہ

مسلمانِ ہند و مورخین کی نظر میں

(جلد اول)

ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے عہد فارسی وانگریزی واردو میں ہندو مسلمان مورخین وغیرہم کے قلم نے بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے ہیں، اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور دورِ جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں قیمت للعہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (ایم۔ اے)

کشمیر

سلاطین کے عہد میں

خطۂ جنت نظیر کشمیر کو علمی و تمدنی و سیاسی اعتبار سے ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے، اور اس وقت تو ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف ہیں، اس کتاب میں اس لالہ و گل کی سرزمین میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ہے اس کی بہت ہی مستند اور مفصل، سیاسی اور تمدنی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، قیمت: ۵۔للعہ

(مرتبہ جناب محب الحسن صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

مترجمہ علی حماد عباسی صاحب ایم۔ اے۔ (اعظم گڈھ)

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۱۰۶ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

شذرات

اردو کو ختم کرنے کی جو تدبیریں کی جارہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ خطرناک اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویز ہے جو بظاہر اُس کی ہمدردی میں کیجارہی ہے کہ اگر اُردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے تو ہندی والوں کی مخالفت ختم ہوجائیگی، اور وہ اردو کو قبول کرلیں گے، اُردو کے مخالفین کی طرف سے تو یہ تجویز سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے کسی جھگڑے کے بغیر خود اردو والوں کے ہاتھوں انکا مقصد حاصل ہو جاتا ہے لیکن اردو کے نادان دوستوں کی طرف سے اس کی تائید حیرت انگیز ہے، یہ صحیح ہے کہ رسم الخط بدل جانے سے زبان ختم نہیں ہوجاتی لیکن اردو کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے، اردو ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، دونوں کے قواعد ایک ہیں مصادر ایک ہیں، ضمیریں ایک ہیں، بہت سے اسمار مشترک ہیں، اگر اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھا دیئے جائیں، تو وہ ہندی بن جائیگی، اور ہندی میں عربی اور فارسی کے الفاظ بڑھا دیے جائیں، تو وہ اردو ہو جائے گی، ان دونوں میں مابہ الامتیاز صرف رسم الخط ہے، اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے، تو وہ چند دنوں میں ہندی کا قالب اختیار کرلے گی، اور ہندی والوں کے رد و قبول کا سوال ہی باقی نہ رہ جائے گا،

……◦◦……

رسم الخط بدلنے سے اُردو کی بہت سی خصوصیات مٹ جائیں گی، اُس کی مختصر نویسی، اس کے حروف و الفاظ کے تلفظ کی صحت و شائستگی اور اس کا حسن سب غارت ہو جائیں گے، خط نستعلیق اتنا حسین و دلکش ہے کہ نستعلیق کی اصطلاح ہی مہذب شائستہ اور کڑھے ہوئے آدمیوں کے لئے استعمال ہونے لگی، نسخ

اور نستعلیق کے نگاروں نے خطاطی کو ایک فن لطیف بنا دیا، اور ایسے ایسے بوقلموں اور حسین و جمیل خط ایجاد کئے گئے، جو آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں، اور جن کی صناعی اعلیٰ درجہ کی مصوری کی ہمسری کرتی ہے، یہ سب کے سب آثار قدیمہ کے کتبات بن جائیں گے، رسم الخط بدلنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اردو کا سارا علمی ذخیرہ جو صدیوں کی محنت و جانکاہی کا نتیجہ ہے، برباد ہو جائے گا، اس کا دیوناگری میں منتقل کرنا ناممکن ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی ذخیرہ عربی کے بعد اردو ہی میں ہے، اور عربی سے ناواقف مسلمانوں کی معلومات کا تنہا ذریعہ ہے، اس سارے ذخیرے سے وہ محروم ہو جائیں گے،

اردو رسم الخط کی بین الاقوامی اہمیت یہ ہے کہ وہ وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ تک کے سارے اسلامی ملکوں میں رائج ہے، ایشیا اور افریقہ کے وہ اسلامی ملک بھی جن کی زبان اور رسم الخط عربی اور فارسی سے جدا ہے، قرآن مجید اور مذہبی تعلیم کی بدولت اردو رسم الخط سے بیگانہ نہیں ہیں، ان کے یہاں عربی کی تعلیم اسی کے رسم الخط میں ہوتی ہے، اور ان کی زبانوں میں بھی اسکے گہرے اثرات ہیں، اس لئے اردو رسم الخط ان ملکوں سے ربط و تعلق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، یاد ہوگا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب تاشقند گئے تھے، تو وہاں کے باشندوں نے السلام علیکم سے ان کا استقبال کیا تھا، پنڈت جی نے بھی اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہا تھا، اور لال بہادر شاستری نے تاشقند میں کسی رجسٹر پر اردو میں دستخط کئے تھے، جس کو ہندوستان کے اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا تھا، اس لئے جو لوگ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی مخالفت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اسلامی ملکوں سے ربط و تعلق کے ایک بڑے رشتے کو کمزور کرتے ہیں،

اس سلسلہ میں ترکی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کی مثال پیش کرنا کئی وجوں سے صحیح نہیں ہے، وہاں ترکی کی کوئی ایسی حریف زبان موجود نہیں تھی، جن میں اتنی قربت اور مشابہت ہو جتنی اردو اور ہندی میں ہے، اور جن میں صرف رسم الخط کا فرق ہو، بلکہ وہاں ترکی کے علاوہ کوئی دوسری زبان ہی نہیں ہے، اس لئے رسم الخط کی تبدیلی سے اس کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، دوسرے اس نے ایک بالکل اجنبی رسم الخط اختیار کیا،

جس کا ترکی میں پہلے کوئی وجود نہ تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ ترکی پوری قوم کی زبان ہے، اسلئے اس کو کسی حال میں بھی نقصان پہنچنے کا امکان نہ تھا، اردو کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، وہ ہر سمت سے نرغہ میں ہے، ایک سمت رسم الخط کی تبدیلی کی بھی ہے، پھر بھی رسم الخط کی تبدیلی سے ترکی قوم کو یہ نقصان تو بہرحال پہنچا کہ اس کی نئی نسل اپنے پرانے ذخیرہ سے بیگانہ ہو گئی، لیکن ترکی قوم اور حکومت دونوں کی زبان ہے، اس لئے اس کی تلافی کی کوشش بھی جاری رہی، اور حکومت کی سرپرستی ہر نقصان کی تلافی کر سکتی ہے، اس کے مقابلہ میں اردو حکومت کی سرپرستی سے نہ صرف محروم ہے بلکہ اس کو سب سے زیادہ نقصان اسی سے پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، ترکی کے رسم الخط کی تبدیلی بھی مصطفیٰ کمال کی ایک اپج تھی جس کو پوری قوم نے دل سے قبول نہیں کیا تھا اسلئے ترکی سے عربی رسم الخط کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا، اور وہاں آج بھی عربی رسم الخط میں بھی کتابیں چھپتی ہیں،

اردو رسم الخط کی بعض خامیوں سے انکار نہیں لیکن خامیوں سے کسی زبان کا رسم الخط بھی خالی نہیں، اس سے اردو کی ابتدائی تعلیم میں ضرور دقت ہوتی ہے، لیکن اس کی اصلاح کی کوششیں بھی جاری ہیں، اور ماہرین تعلیم نے ایسی ریڈریں تیار کر دی ہیں، جن سے یہ دقتیں بڑی حد تک دور ہو گئی ہیں، اردو کی پوری تعلیم کے بعد پھر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی، اس کے لکھنے پڑھنے دونوں میں اتنی تیزی اور روانی پیدا ہو جاتی ہے، کہ ہندوستان کی کوئی زبان اس میں اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندی لکھنے پڑھنے میں جتنا وقت اور تحریر و کتابت کے جس قدر لوازم صرف ہوتے ہیں، اردو لکھنے پڑھنے میں اس سے کہیں کم صرف ہوتے ہیں، اردو پڑھنے میں صرف نگاہ کام کرتی ہے، اس لئے اردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز کسی حیثیت سے بھی مفید نہیں، بلکہ ہر پہلو سے سراسر مضر ہے، البتہ یہ تجویز مناسب ہے کہ ہندی والوں کے استفادہ کے لئے اردو کی بعض ضروری اور اہم کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھی اور شائع کی جائیں، اس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مسلمانوں کی بعض مذہبی جماعتیں اپنا مذہبی لٹریچر ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کر رہی ہیں، اور آئندہ یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا،

مقالات

ادبی سرقات
کلامِ غالب کی روشنی میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

اب ذرا ان اشعار کے تجزیہ کی بھی ضرورت ہے، جن پر سرقہ کا الزام رکھا گیا ہے؛ تمام اشعار کا تجزیہ تو نہ ہو سکے گا لیکن کچھ اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ سرقہ کے الزام کی نوعیت کیا ہے،

غالب: تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عرفی: طغیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل　　آید بزیرِ تیغ و شہیدش نمی کنند

عرفی کے شعر کا مطلب یگانہ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ رے وفورِ ناز کہ فدیۂ عشق تلوار کے نیچے آکر بھی شہادت سے محروم ہو جاتا ہے، طباطبائی نے غالب کے شعر کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "اپنی رسوائی اور مورد تعزیر ہونے کا اظہار ہے کہ لوگ اسے تماشا سمجھے ہوئے ہیں"؛ اگر یہ مطلب تسلیم کر لیا جائے تو پھر دونوں شعروں کے معانی میں بڑا فرق پیدا

ہو جاتا ہے، اور اگر غالب کے شعر سے معشوق کا استغنار مراد ہے، تو پھر اس کے یہ معنی بھی لئے جا سکتے ہیں، کہ معشوق نے مار مار کر غالب کے پرزے نہیں اڑائے، اسی لئے اس کے مارے جانے کا تماشا نہ ہوا، آسی نے غالب کے اس شعر کی شرح میں مذکورۂ بالا فارسی شعر کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کہنہ مشق شاعر غالب نے ایک معمولی یا پامال مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا ہے، کہ نہایت بلند خیال معلوم ہوتا ہے، اگر شعر میں یہ مضمون اس صورت میں لایا جاتا، کہ غالب تیرے قتل کا وعدہ کیا گیا تھا، اور تو وہاں گیا، مگر قاتل نے قتل نہیں کیا تو شعر جیسا کچھ ہوتا ظاہر ہے، غرض کہ ایک رکیک خیال کو حسنِ بندش انوکھا خیال بنا کر دکھا دیتی ہے، ایک فارسی شعر۔ اسی خیال سے لبریز ہے، مگر سچ یہ ہے کہ جس صورت سے معشوق کی بے اعتنائی کو ایک پیش پا افتادہ مضمون سے شاعر یعنی غالب نے حسن بندش کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ایک تصویر ہے، جس کے دیکھنے سے آنکھیں سیر نہیں ہوتیں، (ص ۵۵)

غالب: فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اسکو اسد جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

شاگرد مصحفی:۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یگانہ لکھتے ہیں کہ غالب نے شیخ مصحفی کے ایک شاگرد کے مشہور و معروف شعر کی نقل کی ہے، طبا طبائی نے غالب کے شعر کی شرح میں صرف اتنا لکھا تھا

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یگانہ پر بھی تو سرقہ کا الزام آتا ہے کہ طبا طبائی کی شرح کو اپنی تحقیق میں داخل کر لیا پھر کیا یہ سرقہ اس لئے ہے کہ شعر میں فلک اور معشوق کی ستمگاری کا اشتراک دکھایا گیا ہے یہ تو

ہر شاعر کے یہاں پایا جائے گا، آسی نے غالب کے مذکورۂ بالا شعر کی شرح کرتے وقت یہ بھی لکھا ہے کہ غالب نے اسی مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے،

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یہ تو غالب کی قادرالکلامی کی دلیل ہے کہ غزل کے ایک مضمون کو وہ نوع بنوع ادا کر سکتے ہیں،

غالب: میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
نامعلوم: یاد آیام جنوں بر سر من بار دسنگ — کودکاں را چو زمکتب کسے آزاد کند

یگانہ فارسی شعر کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ لڑکے جب مکتب سے چھٹی پاتے ہیں تو انھیں دیکھ کر اپنے ایام جنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس یاد سے گویا اس شخص کے سر پر پتھر برسنے لگتے ہیں۔" یگانہ اس شعر کی تو تعریف اسطرح کرتے ہیں کہ "کہنے والا کس خوبی سے کہہ گیا" مگر غالب کے شعر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شعر جتنا مشہور ہے اتنا ہی مہمل ہے، مہملیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے، اور دوسرا کچھ کہتا ہے، کوئی ایک مرکز خیال قائم ہی نہیں ہوتا،" "ہرکس بخیال خویش خبطے دارد" اگر غالب کا شعر سرقہ ہوتا تو نقل اصل کے برابر ہوتی مہمل نہ ہو جاتی، اور پھر دونوں شعر کا جو مطلب ہے، وہ سرقہ نہیں کہا جا سکتا، جنون اور سنگ تو عامتہ الورود ہے، اس کو سرقہ نہیں کہا جا سکتا ہے،

غالب: ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

عبداللہ بیامی:-

بیم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من — از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

یگانہ نے فارسی شعر کے معنی یہ بتائے ہیں کہ شاعر کہتا ہے کہ تو مجھ سے وعدہ کرنے اور اس امر کا اندیشہ نہ کر کہ وفا بھی کرنا پڑے گا کیونکہ وعدہ کی خوشی مجھے آج سے کل تک پہونچنے ہی نہ دے گی؛ آج ہی خوشی کے مارے مر جاؤں گا، اس شعر کو دیکھ کر غالب کی چوری یا نقالی کی حقیقت کھلتی ہے، غالب پرست ہزار سر پٹکیں ایسی چوری کی لیپا پوتی نہیں ہو سکتی، غالب کا شعر بقدر دانی رسم کی شانِ بلاغت کو نہیں پہونچ سکتا، اس کے علاوہ بیابانی کے شعر میں بیم از وفا مدار کے فقرہ سے جو معنوی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں اضافہ ہو گیا ہے، وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے، آمادہ کیا ہے اس کے مفہوم کا غالب کے شعر میں پتا تک نہیں، یگانہ کے اس اعتراض کا جواب نظامی بدایونی نے غالب کے شعر کی شرح کرتے ہوئے یہ لکھ کر دیا ہے، کہ فارسی شاعر نے اپنے شعر میں صرف یہ بیان کیا ہے کہ وعدۂ وصل کرنے میں اس خیال سے پس و پیش نہ کر کہ اس کا ایفا کرنا پڑے گا، کیونکہ میں تیرے وعدہ کی خوشی میں کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا، اور نہ میں ہوؤں گا نہ مجھے وعدہ ایفا کرنے کی نوبت آئیگی، ایک غیر انصاف پسند نکتہ چیں نے غالب کے اس شعر کو فارسی شعر کا ترجمہ لکھا ہے، لیکن اُس نے غور نہیں کیا، کہ غالب کے شعر میں جو چو چلاپن پایا جاتا ہے، اور اس کے سننے سے سامع کے دل میں جو اثر ہوتا ہے، فارسی شعر میں اس کا پتا نہیں، وعدے کو جھوٹ جان کر اس پر زندہ رہنا ایک نئی بات ہے،

غالب: اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

ظہیر فاریابی: صد بہا سے عشق را کے بوالہوس دارد قبول

کے شناسد طفل قدرِ سیلیٔ استاد را

یگانہ کہتے ہیں کہ پامال مضمون ہے، بہتیروں نے کہا ہے، اس میں ظہیر فاریابی بھی ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ظہیر فاریابی نے بھی کہیں سے سرقہ کیا ہے۔ آسی لکھنوی نے بھی غالبؔ کے مذکورۂ بالا شعر کی شرح میں ظہیر فاریابی کا شعر نقل کیا ہے معلوم نہیں آسی اور یگانہ دونوں میں کس نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے، مولانا نے ان دونوں اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالبؔ مصائب روزگار یا حوادثِ ارضی وسماوی کی تمثیل اہلِ عقل کے لئے سیلی استاد کا (استاد کا طمانچہ) سے کرتا ہے، اور اس طرح استقلال اور بلند ہمتی کی روح پھونکتا ہے، اور ظہیر فاریابی عشق و ہوس کی امتیازی خصوصیت کو سیلیِ استاد سے مثال دیتے ہیں، بجنوروہانی نے بھی ان دونوں اشعار کا موازنہ اس طرح کیا ہے "میرے نزدیک غالب کا مضمون نہایت وسیع ہے، علاوہ اس کے اس نے طوفانِ حوادث کو مکتب قرار دیا ہے، مکتب کا ہنگامہ خواہ لڑکوں کے پڑھنے سے پیدا ہو یا سیلی استاد کا نتیجہ ہو، اس سے طوفان کے جوش و خروش کا عالم نظروں میں پھرنے لگتا ہے، دوسری لطافت یہ ہے کہ (لطمہ) موج کے تھپیڑے اور استاد کے طمانچے میں کیسی زبردست مشابہت ہے۔ یہ لفظ اپنے معنوں کی تصویر ہے، پھر شعر کا ایک ہی تلازمہ بحر میں ختم ہو جانا بھی اثر شعر کا کفیل ہے، غالبؔ کہتا ہے کہ اہلِ بینش کے لئے کوئی حادثہ ہو سبق آموز ہے، ..... ظہیر نے بوالہوس (ہوس پرست) کو باعتبار نادانی طفل کہا ہے، اور صدمۂ عشق کو سیلی استاد سے تعبیر کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ صدمہ کی لفظ قریب قریب اسی شان کی رکھ دی، جیسی غالبؔ کے شعر میں لطمہ موج ہے' صدمہ کے معنی لغت میں ٹکرانے کے ہیں یہ لفظ بھی بیانِ واقعہ کو واقعہ بنا رہا ہے، جب

یوں ہے تو کوئی شعر ندرت سے خالی نہیں،

(گنجینۂ تحقیق از بیخود موہانی ص ۱۷۳-۱۷۲)

غالب: کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

؟ زخضر عمر فزون است عشق بازاں را اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را

؟ عمر من گیرم کہ باشد عمر تا روز حساب زلیستن بے تو نباشد در حسابِ زندگی

یگانہ نے فارسی شعر نقل تو کر دیا، لیکن شاعر کا نام بتا نہیں سکے ہیں، شاید کہیں سے لے لیا ہو، بیخود موہانی نے پہلے فارسی شعر کو بیتھری کا بتایا ہے، آسی نے خسرو کا ایک ہم معنی شعر اور لکھا ہے،

زہے عمر دراز عاشقاں گر شب ہجراں حساب می گیرند

غالب نے خسرو کے اس شعر سے استفادہ کیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ ہندوستانی نژاد فارسی شعراء میں خسرو ہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے

غالب: مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے،

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

جامی: آسماں جامِ نگوں واں کز مئے عشرت تہی است

جُستن مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی است

یگانہ لکھتے ہیں کہ وہی آسماں، وہی جام واژگوں، وہی مئے عشرت کی ہوس جو یہاں ہے سو وہاں، چوری نہیں تو کیا ہے، آسی نے بھی غالب کے اس شعر کی شرح میں جامی کا شعر نقل کیا ہے، بیخود موہانی کا بیان ہے کہ دونوں شعر کا مبحث تو ایک ضرور ہے لیکن مضمون ایک نہیں، جامی کا رنگ واعظانہ ہے، غالب کا ڈھنگ شاعرانہ ہے

دونوں میں واقعہ اور بیان کا فرق ہے، ایک پیکر بے جان ہے، اور ایک پیکر ذی روح، جو برجستگی غالب کے شعر میں ہے جامی کے یہاں نہیں، (گنجینۂ تحقیق ص ۱۸۰-۱۷۹)

غالب: لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھکر / ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق

صائب: کہ گرفتہ است گناہ وجہ بر گردن خویش / سر مینائے مے وحشت او را نازم

دونوں شعر میں خلق خدا کا خون گردن مینا پر ضرور رکھا گیا ہے، لیکن غالب کے دوسرے مصرع سے شعر میں جو بانکپن بلکہ صحیح تغزل پیدا ہو گیا ہے، وہی اصلی جان ہے جو صائب کے یہاں نہیں،

غالب:- نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یگانہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر اپنی حدوں میں پورا ہے، زبان زد خاص و عام ہے، مگر پرایا مال ہے، عاقل خاں رازی کہتا ہے،

اول این حادثہ بر آدم و حوا بگذشت / نہ مرا کرد رقیب از سر کوے تو جدا

لیکن نظامی بدایونی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عاقل خاں رازی نے بھی فارسی میں اس مضمون کو لکھا ہے، لیکن غالب کے یہاں بہت بے آبرو ہو کر کے ٹکڑے نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ فارسی شعر میں کہاں؟ اس مصرع کو بہت کے لفظ پر پورا زور دے کر پڑھنے سے شعر کے معنی حاصل ہوتے ہیں،

غالب: کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ / ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یگانہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر مبتدیوں کا سا ہے، مضمون بھی نیا نہیں، دیکھئے خواجہ حافظ نے کیا خوب فرمایا ہے،

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

لیکن ان دونوں اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب اردو غزل (ص ۳۰۹) میں رقمطراز ہیں کہ غالب نے حافظ کے شعر میں تھوڑا سا تصرف ضرور کیا ہے، لیکن بلا شبہہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے، زودپشیماں کی ترکیب میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے، اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے، کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غالب: حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز　　دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

شیدا: گفتن دعا بزلفِ تو تحصیلِ حاصل است　　با خضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

یگانہ لکھتے ہیں کہ ملا شیدا کے شعر سے مضمون اڑا کر کچھ کہنا چاہا تھا، مگر شعر تو گتھا نہیں گورکھ دھندا بن کر رہ گیا لیکن غالب کے اسی شعر کے متعلق حالی کہتے ہیں، کہ ایک نئی شوخی ہے، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی، کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو، آسی نے فارسی کا مذکورۂ بالا شعر نعمت خاں عالی کا بتایا ہے، یگانہ اس کو شیدا کا بتاتے ہیں، میرے پیشِ نظر اس وقت نعمت خاں عالی اور شیدا دونوں میں سے کسی کا دیوان نہیں، جو یہ بتاتا کہ یہ کس کا شعر ہے لیکن اگر شیدا کا شعر ہے، تو شیدا پر خود ہی سرقہ کا الزام رکھا گیا تھا، جس کو اس راقم نے اپنی تصنیف بزمِ تیموریہ میں جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تفصیل سے لکھا ہے، ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس کو ہم یہاں بھی دہراتے ہیں، ۱۰۳۴ھ ۱۶۲۴ء میں جہانگیر اجمیر گیا، تو اس کے شاہی جلو میں شعرا بھی تھے، ایک روز شیخ فیروز کی قیامگاہ پر تمام اصحابِ سخن مثلاً

طالب آملی، ملا عطائی جونپوری، انور لاہوری، وغیرہ جمع ہوئے، شیخ فیروز کو مقبولیت اس لئے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے، یہ مجلس جاری تھی، کہ شیدا بھی آپہنچا، تمام شعرا نے گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا، اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی، شیدا نے یہ شعر پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے ۔۔۔ حسن ما پروردگار و عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے،

عشق را پیمبر ولیکن ۔۔۔ حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا، لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا،

زبسکہ کرد غمت تند بر جگر ناخن ۔۔۔ چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثانی ملوانی کا چربہ ہے

از بسکہ بستہ کفذم فاخن در وفشت ۔۔۔ چو پشت ماہیت سراپاے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چیں بجبیں ہوا، مگر ایک اور شعر پڑھ کر داد چاہی،

گر بہ صحرا موفشانی دشت پر سنبل شود ۔۔۔ در بدریا روبشوی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولے کہ یہ تو ملا کاتبی کے شعر سے توارد ہے،

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ ۔۔۔ خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑھ کر کہا اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ،

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد ۔۔۔ از روے ادب مہر خدا بر پشت

شیخ فیروز نے فوراً ہی اتقی کا شعر پیش کیا،

نبوت را تو ہی آں نامہ سربست کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہو کر بدکلامی شروع کر دی، بعض اصحاب مجلس پھر مصر ہوئے، تو اس نے یہ شعر پڑھا،

زلف او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل
زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے لکھا کہ شیدا کی دل آزاری مراد نہیں، لیکن اس مضمون کا شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے،

کس نیابد مصرع پیچیدۂ زلف کجت گرچہ ایں مضمون ز تو در پیش پا افتادہ است

اس طرح شیدا نے کچھ اور شعر سنائے تو شیخ فیروز اس کے ہر شعر کا ماخذ بتاتا گیا، بالآخر اس پر مہر سکوت لگ گئی، اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی، اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا، جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا (یہ تفصیل مخزن الغرائب قلمی نسخہ دارالمصنفین ورق ۲۱۹ - ۲۱۵ سے لی گئی تھی)

اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ ایک اونچے درجہ کا غزل گو قصداً سرقہ نہیں کرتا لیکن بعض اوقات اس کے اشعار میں غیر شعوری طور پر یا تو کچھ خاص خاص الفاظ یا تراکیب، یا مضامین ایسے آجاتے ہیں، جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرقہ ہے۔ شیدا کو خود خبر نہ تھی کہ اس کے اشعار کے متحد المعنی اشعار پہلے سے موجود تھے، وہ اپنی استادی کے زعم میں اپنے اشعار سناتا، لیکن متوازی اشعار سنا کر اس کو زچ کر دیا جاتا، مآثر الکرام کے مصنف نے صاحب تاریخ صبح صادق کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ شیدا نے ایک لاکھ اشعار کہے تھے، ظاہر ہے کہ ایک لاکھ اشعار رکھنے والا سارق نہیں ہو سکتا، اسی طرح کسی غزل گو کے کلام کا تجزیہ

کیا جائے تو اس پر ویسے ہی سرقہ کا الزام آسکتا ہو جیسا کہ یگانہ نے غالب پر لگایا ہے حالانکہ غالب کو خود اعتراف رہا کہ وہ اساتذۂ فن سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

یگانہ لکھتے ہیں کہ کوئی چوری کرتا ہے تو حرف بہ حرف نہیں کرتا، کچھ نہ کچھ الٹ پھیر کرکے پرائے مال کو اپنا بنا لینا چاہتا ہے۔ (غالب شکن ص ۳۰) لیکن غزل گوئی کے الفاظ اور موضوعات کچھ ایسے محدود ہیں کہ ان ہی کے الٹ پھیر میں غزل گو اپنے کمالات دکھاتا رہتا ہے، غزل گوئی کے خاص خاص الفاظ اور موضوعات حسن و عشق، ہجر و وصل، ناز و ادا، مہر و وفا، کرم و ستم، چشم و نرگس، گل و بلبل، شمع و پروانہ، لیلےٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، وامق و عذرا، پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، قتل و خون، شیشہ و ساغر، مینا و سبو، پیمانہ و میخانہ، بت و خدا، زاہد و واعظ، محتسب و ناصح، جنون و گریباں، بہار و خزاں، خس و خار، آفتاب و ذرہ، دریا و قطرہ، دل و جگر، حسرت و ناکامی، نزع و مرگ، قبر و حشر، قفس و چمن، نظارۂ جمال، فردوس و صال وغیرہ ہیں، ان ہی الفاظ کے سہارے غزلیں کہی جاتی ہیں، اور پھر اس سلسلہ میں عاشقوں کی شیفتگی، فریفتگی، بیخودی، مدہوشی، شوق و حسرت، اور رنج و غم کی منفعلہ کیفیتیں اتنی بار دہرائی جا چکی ہیں کہ غزل گویوں کے یہاں وہی ساری باتیں کسی نہ کسی شکل میں پائی جائیں گی، پھر غزل گوئی کی خوبی بھی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں وہی تمام جذبات و احساسات پیش کئے جائیں جو عامۃ الورود ہوں یعنی عشق و محبت کی راہ میں عشاق کو جو پیش آتے ہوں، اور جب یہ خوبی تسلیم کر لی جائے تو شعراء کے یہاں جذبات و احساسات کی یکسانیت کا پایا جانا نہ تعجب خیز ہے، اور نہ سرقہ ہے، اور اگر یہ سرقہ ہے تو بظاہر متحد المعنی ہیں اور قریب المعانی اشعار کا انبار لگا کر بہت سے اساتذہ کو سارق کہا جا سکتا ہے، مثلاً:

میر: کاسۂ چشم لے کے چوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

آتش: آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
یہ ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے

غالب: زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

میر: کاش کہ دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

غالب: میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

میر: کچھ سمجھتے نہیں ہمارا حال
تم سے بھی اے بتاں خدا سمجھے

ذوق: ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

میر: ناخن سے بوالہوس کا گلا یونہی چھل گیا
لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مل گیا

ذوق: گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

میر: احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر رک کر

راسخ: تمہاری بات اب راسخ سمجھ میں کس طرح آئے
گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور رکتے بھی جاتے ہو

میر: میرے تغیرِ رنگ پہ مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

مومن: میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

میر: بتوں کے جرمِ الفت پر مجھے زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے

مومن: نہیں تقصیر اس بت کی کہ ہو میری خطا لگتی
مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

میر: سایہ میں اک بلند قامت کے
فتنے سب سو گئے قیامت کے

داغ: عشق میں اک بلند قامت کے
ہم گلے مل گئے قیامت کے

ناسخ: شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

غالب: نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مصحفی: شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — چھیڑ نا مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

غالب: پڑ ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

آتش: ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم — ناز میں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

غالب: منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا — ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

غالب: آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرت دیدار ہے

ذوق: یہ چاہتا ہے اشوق کہ قاصد بجائے مہر — آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

غالب: نہ ہو گا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ذوق: وہ ہوں رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہے — برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

غالب: اک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل — گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

ذوق: کیا اعتبار ہستی ناپائدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

غالب: اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

ذوق: اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے — تھوڑی سی رہ گئی اسے بھی گذار دے

غالب: پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ذوق: کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے — نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

غالب: نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا — کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ذوق: نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا — کہ ہر اک بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

غالب: باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

ذوق: سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے — اژدہا بن بن کے شب بو رشک گلشن آب میں

غالب: مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

ذوقؔ: صبا جو آئے خس و خارِ گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دلِ آشیاں کیلئے

غالبؔ: دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگیہائے صبا کیا

شیفتہؔ: شمیم گل میں بوئے پیرہن ہے
غلط ہے یہ کہ احسانِ صبا کیا

غالبؔ: عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

شیفتہؔ: عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی
میری ذلت تیری عزت ہی سہی

غالبؔ: عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

شیفتہؔ: اژدحامِ غم و تنگیٔ حرماں
پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

غالبؔ: خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

مومنؔ: مانگا کریں گے اب تو دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

غالبؔ: عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مومنؔ: دل قابلِ محبت جاناں نہیں رہا
وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

غالبؔ: فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کیلئے

مومنؔ: بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم تو ہے
نہیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کیلئے

غالبؔ: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

مومنؔ: ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کیلئے

غالبؔ: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مومنؔ: جا نہیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

غالبؔ: سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

داغؔ: موقوف وصلِ یار ہے گویا وصال پر
اک عمر چاہئے کہ تمنا کرے کوئی

غالبؔ: کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

داغؔ: جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدہ کو ہم
آتے ہوئے ادھر سے کئی بار سامنے

〃 : میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
سب لوگ پوچھتے ہیں کہ حضرت ادھر کہاں

غالبؔ: ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ظفرؔ: کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا
محفل میں وصفِ بادہ و ساغر کے بغیر

غالبؔ: سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

ظفرؔ: واہ اس صورت گری میں دیکھتے ہی دیکھتے
صورتیں کیا کیا نظر سے اپنے پنہاں ہو گئیں

غالبؔ: وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

ظفرؔ: جس سے چار آنکھیں تری اے آفتِ جاں ہو گئیں
تیر سی اس کے جگر کے پار مژگاں ہو گئیں

غالبؔ: اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ظفرؔ: یا تنگ ہے ذوقِ دشت نوردی کہ دو نکال
میں اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پاؤں

میرؔ: اللہ ری عندلیب کی آواز دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

ظفرؔ: آ جائے گر ہوائے گلستاں قفس تلک
بلبل کا دم ہوا ہو یہ کہہ کر کہ ہائے گل

آتشؔ: تبدیل شبِ وصل سے ہو روزِ جدائی
بالش کے عوض ہو سرِ دلبر کے تلے ہاتھ

ظفرؔ: ہے جی میں تمنا یہ کہ سوتے ہیں تو گاہے
آ جائے مرا عارضِ دلبر کے تلے ہاتھ

آتشؔ: مستی میں طلبگار تو ساقی سے ہے مے کا
کاٹوں گا میں کانپے گا جو ساغر کے تلے ہاتھ

ظفرؔ: دل ہاتھ میں اس کا لیا پر ہے یہ ظفرؔ حال
جنبش میں رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ

آتشؔ: پاؤں کو اُن کے چھوا میں نے تو ہنس کر بولے
کاٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہگار کے ہاتھ

ظفرؔ: میں نے چوری سے جو شب لطف کو چھیڑا تو کہا
کاٹنے چاہئیں اس دزدِ سیہ کار کے ہاتھ

لیکن غزل کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی چوری اور فرسودگی میں بھی ہر زمانہ میں تازگی اور دبودگی باقی رہتی ہے، اسی لئے غزل پڑھتے یا سنتے وقت یہ کم دیکھا جاتا ہے کہ غزل گو کیا کہہ رہا ہے، بلکہ زیادہ تر اس پر نظر رہتی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کس طرح کہہ رہا ہے، اور اسی کس طرح کہنے میں اس کی تازگی باقی رہتی ہے، اسی لئے دو شاعروں میں الفاظ یا کیفیات کے اشتراک کا ہو جانا کوئی سرقہ نہیں،

اس کے علاوہ اردو میں غزل گوئی شروع ہوئی تو تمام غزل گو شعراء نے ایرانی شعراء کے طرز میں غزلیں کہہ کر اردو غزل گوئی میں نکھار، بانکپن، رسیلا پن اور البیلا پن پیدا کرنے کی کوشش کی، اور میر سے لے کر غالب تک شاید ہی کوئی غزل گو شاعر ایسا گذرا ہے، جس کے یہاں فارسی شعراء کے کچھ نہ کچھ مضامین نہ آئے ہوں، دارالمصنفین سے مولانا عبدالسلام ندوی کی جو شعرالہند شائع ہوئی ہے، اس کی جلد اول میں ایسے بہت سے اشعار جمع کر دیئے گئے ہیں، (ص ۴۶ - ۴۲)

ان میں سے کچھ مثالیں ہم بھی یہاں ناظرین کی ضیافت کے لئے نقل کرتے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ غالب پر سرقہ کا الزام رکھنا کہاں تک درست ہے

سودا: راز دیر و حرم افشا نہ کریں ہم ہرگز | ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر

حافظ: مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز | ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

سودا: کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا | ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیری: بوے یار من ازیں سست وفا می آید | ساغر از دست بگیرید من از کار شدم

میر: پایا نہ یوں کہ کریئے اس کی طرف اشارہ | یوں تو جہاں میں ہم نے اسکو کہاں نہ پایا

فغاں: مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست | اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

نامعلوم: طالعِ شہرتِ رسوائی مجنوں بیش است — ورنہ طشت من واو ہر دو ز یک بام افتاد

میر: بیشہ تو ایک ہی تھا اس کا پہ ولیکن — مجنوں کے طالعوں نے شہرت میں یاوری کی

میر: جس جا کہ سراپا میں نظر جاتی ہے اٹکے — آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر ہو

نظیری: ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

قائم: فہرست میں خوبانِ وفادار کے پیارے — دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا

نظیری: دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف — نامِ خوبان ہمہ ثبت است ہمین نامِ تو نیست

راسخ عظیم آبادی :-

قتلِ موعود کی حسرت میں موئے اہلِ نیاز — ہمنشیں سیر تو کر ناز کی طغیانی کی

عرفی: طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل — در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

راسخ عظیم آبادی :-

قابلیت ہی نہ تھی کفر کے رتبے کی ہمیں — سبحی کی لیک نہ شایستۂ زنار ہوئے

عرفی: در میانِ کافراں ہم بودہ ام — یک کمر شایستۂ زنار نیست

سودا نے شاہجہانی دربار کے ملک الشعراء حاجی محمد جان قدسی کی ایک پوری غزل کا ترجمہ کرکے اپنی ایک غزل مشاعرہ میں پڑھی، عام شائقین کو تو پتہ نہ چل سکا لیکن جب اُس کی نشاندہی سراج الدین علی خاں آرزو نے یہ شعر پڑھ کر کی،

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے — لکھ رکھیں چاہیئے فلک پہ ملک

تو سودا اُن کی دیدہ وری سے خوش ہو کر اٹھے اور اُن سے جا کر بے اختیار لپٹ گئے،

(شعر الہند جلد اوّل ص ۴۵)

نظیری کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:-

آمدہ سحر کہ دیر و حرم رفت و رو کنند تا با زم از نقیب چہ خوں در سبو کنند

خواجہ میر درد نے اسی زمین اور قافیہ میں غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے،

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

لیکن اُردو کے ان اساتذہ پر سرقہ کا الزام نہیں آتا ہے، وہ تو اردو غزل کو فارسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اسی لئے اُن کے یہاں فارسی غزلوں کے خیالات، تراکیب اور محاورات کی بہتات ملے گی،

مرزا یگانہ کو بھی اعتراف ہے کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا، کیونکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، متاخرین ہمیشہ متقدمین سے استفادہ کرتے ہیں، (غالب شکن ص ۳۵) لیکن مرزا یگانہ غالبؔ کو اس حق سے محروم اس لئے کر دینا چاہتے ہیں کہ اُن کا الزام الہامی اور تخیل کہا جاتا ہے، ان کا سارا غصہ اگر کلام غالبؔ کو الہامی کہنے والوں پر اترتا تو صحیح تھا، لیکن غالبؔ کو چور، گونگا، ٹھونس ٹھانس کرنے والا، بے سرا، جھوٹا، دہقانی، بے ڈھنگا وغیرہ کہنا کہاں تک ادبی فرض اور خدمت انجام دینے کے مرادف ہے، اور پھر حسب ذیل عبارت لکھنا کہاں تک ادبی تہذیب میں داخل ہے،

"اک اُلو کا پٹھا مولوی ٹھینگا موہانی غالب کے اس دہقانی شعر پر بھی جو نہایت شرمناک چوری ہے، سر دھنتا تھا، آدمیاں گم شدند"

(ص ۴۳)

اور پھر سرقہ کا جو معیار یگانہ نے قائم کیا ہے، اس لحاظ سے ان کا یہ کہنا کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا، خود سرقہ ہے، انھوں نے غلام علی آزاد بلگرامی کے اس فقرہ کو اپنانے کی کوشش کی ہے،

"واگر بنظر تفتیش ملاحظہ کند کم شاعرے را از توارد مضامین خالی یابد"

(مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۹)

آزاد بلگرامی توارد کے تو معترف ہیں لیکن ان کا قلم بیگانہ کی طرح سرقہ کا الزام رکھنے میں بے باک اور بے کار وا نہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے توارد کی بڑی دلچسپ تفصیل لکھی ہے جو بہت سے مقالہ نگاروں کے لئے شمع راہ بنی ہوئی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ فارسی کا مشہور شاعر مرزا محمد قلی سلیم طرشتی (المتوفی ۱۰۵۷ھ) دوسروں کے مضامین لے کر خوب ادا کرتا، جیسا کہ خود کہتا ہے:-

گفت حافظ دید چوں کلک بنام را سلیم　　　بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت

لوگوں کی زبان پر یہ برابر ہوتا کہ سلیم "معانی بیگانہ" سے خوب آشنا ہو جاتا ہے، یعنی وہ دوسروں کے مضامین کو خوب اپناتا ہے،

وارستہ نے اُس کو مخاطب کر کے کہا تھا،

وخطے کہ نکردی بکلام اللہ است　　　بیتے کہ نبردۂ تو بیت اللہ است

لیکن سلیم کو خود شکایت تھی کہ اس کے حریف اُس کے مضامین کے باغ کی غارتگری میں لگے رہتے ہیں،

دیوان خود بدست حریفاں مدہ سلیم　　　غافل مشو کہ غارت باغ تو می کنند

اور وہ خود یہی الزام اپنے معاصر شاعر صائب پر رکھتا ہے،

دیوان کیست از سخنانم تہی سلیم　　　تنہا نہ بر من این ستم از دست صائب است

صائب کی قادر الکلامی میں کس کو شک ہو سکتا ہے لیکن سلیم و صائب کے بہت سے متحد المضامین اشعار ہیں، مثلاً

سلیم: مشاطہ را جمالِ تو دیوانہ می کند کآئینہ را خیال پری خانہ می کند
صائب: دل را نگاہِ گرمِ تو دیوانہ می کند آئینہ را رخِ تو پری خانہ می کند
سلیم: چشمِ توام ز ہوش تہیدست می کند یک سرمہ داں شراب ملامت می کند
صائب: از چشمِ نیم مستِ تو با یک جہاں شراب ما صلح کردہ ایم بہ یک سرمہ داں شراب
سلیم: صدا چگونہ برآید کہ ایں سیہ چشماں بہ سنگِ سرمہ شکستند شیشۂ ما را
صائب: نماند نالۂ دل در دو پیشۂ ما را بہ سنگِ سرمہ شکستند شیشۂ ما را
سلیم: ز آشفتگی طرۂ مقصود خبردار ہر فال کہ از شانۂ تمنا دگرفتیم
صائب: خواہد فتاد دامنِ زلفش بدستِ من ایں فال را ز شانۂ تمنا دیدہ ایم
سلیم: زینتِ اربابِ معنی جوہرِ ذاتی بس است لالہ در کوہِ بدخشاں گر نباشد گو مباش
صائب: شمع بر خاکِ شہیداں گر نباشد گو مباش لالہ در کوہِ بدخشاں گر نباشد گو مباش
سلیم: اگر بہ چشمِ حقیقت نظر کنی دانی، کہ طوقِ فاختہ بر پائے سرو خلخال است
صائب: حسن بالا دست را آرائشے چوں عشق نیست طوقِ قمری سرو را بہتر ز خلخال زر است
سلیم: سلیم ہند جگر خوار خورد خونِ مرا چہ روز بود کہ راہم بایں خراب افتاد
صائب: صائب از ہند جگر خوار بروں می آیم دستگیرِ من اگر شاہِ نجف خواہد شد

ان اشعار کو نقل کر کے مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں، کہ حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں جو اشتراک مضامین پیدا ہو گیا ہے، ان کو توارد پہ محمول کیا جائے، پھر وہ علامہ تفتازانی کی ایک رائے کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں کہ سرقہ تو اس وقت ہے کہ جب یہ یقینی طور پر ثابت ہو کہ ایک شعر پہلے سے کسی شاعر کے شعر سے اخذ کر لیا گیا ہے، اور اگر سرقہ ثابت نہیں ہے تو یہ توارد ہے، اور اگر کسی شعر کا اخذ کرنا معلوم نہ ہو تو پھر بھی کہنا چاہئے کہ فلاں شاعر نے ایسا کہا ہے، لیکن

دوسرے شاعر نے سبقت کر کے پھر ایسا کہدیا ہے، اس حسن تعبیر سے سچائی کی فضیلت باقی رہ جاتی ہے جس کو غنیمت جاننا چاہیئے، اس طرح علم غیب کا دعویٰ بھی نہیں ہونے پاتا، اور کسی کا نقص بھی نہیں نکلتا، اسی سلسلہ میں آزاد بلگرامی نے ابو طالب کلیم کے حسب ذیل تین شعر نقل کئے ہیں،

منم حکیم بطور معنی بلند ہمت		کہ استفادۂ معنی جز از خدا نکنم
بخوان فیض الٰہی چو دسترس دارم		نظر بکاسۂ دریوزۂ گدا نکنم
ولے علاج توارد نمی توانم کرد		مگر زبان بہ سخن گفتن آشنا نکنم

کلیم نے اپنی مہارت کے زعم میں کہا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور سے استفادہ نہیں کرتا، وہ فیض الٰہی کے خوان سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے، اس لئے اس کو دریوزہ گری کی ضرورت نہیں، اور اگر اس کے یہاں توارد پایا جاتا ہے، تو اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں، وہ شعر ہی نہ کہے: یہی بات غالب بھی کہہ گئے ہیں،

مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ توارد ناگزیر ہے جس کی بہت سی مثالیں انھوں نے مآثر الکرام جلد دوم میں دی ہیں، اُن میں سے ہم بھی یہاں پر کچھ نقل کرتے ہیں،

امیر خسرو: بستم دل اسیراں بکجا گریز واز تو		بجوالی دو چشمت چشم بلا نشستہ
صائب: بجوالی دو چشمت چشم بلا نشستہ		چوں قبلہ کر دلیلی ہمہ جا بجا نشستہ
بنائی: قضا کہ بر لب و خط عنبریں دارد		برائے کشتن من زہر در نگیں دارد
صائب: امید جان ز شیریں دہنم از لعل سیرانش		ندانستم کہ از خط زہر در زیر نگیں دارد

صائب غزل طرازوں کے امام اور سخن پردازوں میں علامۂ وقت، قواے فصاحت کے حامل اور اعلا کلمۂ بلاغت کے نشانہ سمجھے جاتے تھے، اُن کو اپنی معنی آفرینی پر ناز تھا، خود بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں،

ز صد ہزار سخنور کہ در جہاں آید — یکے چو صائب شوریدہ حال برخیزد

غزل گوئی بہ صائب ختم شد از نکتہ پردازاں — رباعی گر مسلّم شد ز موزونان سحابی را

غزل بود بایں رتبہ ہیچ گہ صائب — نوائے عشق در ایامِ من کمال گرفت

ایسے شاعر کے متعلق کوئی یہ کہے کہ اُس نے امیر خسرو اور بنائی سے سرقہ کیا تو یہ بڑی بے ادبی، اور ادبی بے خبری کی دلیل ہوگی، صائب کے اشعار کے مضامین بعد کے شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں، مثلاً عالمگیری دور کے شاعر خان مرزا معز الدین موسوی فطرت، ناصر علی سرہندی (المتوفی سنہ ۱۱۰۸ھ) اور اُن کے بعد کے مرزا عبد القادر بیدل (المتوفی سنہ ۱۱۳۳ھ) کے بعض اشعار میں تقریباً وہی مضامین ہیں، جو صائب کے یہاں ہیں،

صائب: سرچشمۂ حیات لبِ میچکان اوست — عمرِ دوبارہ سایۂ سروِ روانِ اوست

فطرت: عیش ابد بکامِ دلِ دردمند تست — عمرِ دوبارہ سایۂ سروِ بلند تست

صائب: صحبتِ ناجنس آتش را بفریاد آورد — آب چوں در روغن افتد می کند فریاد چراغ

ناصر علی: آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ — صحبتِ ناجنس را باشد ثمر آزارہا

صائب: ہمیشہ صاحب طولِ امل غمیں باشد — کہ چین بقدرِ بلندی در آستیں باشد

بیدل: دستگاہت ہر قدر بیش است کلفت بیشتر — در خورِ طول است چینہائے کہ دارد آستیں

تذکرہ نگار ناصر علی سرہندی کو شیر نیستانِ سخنوری اور مرد میدانِ معنی گستری بتاتے ہیں، مرزا عبد القادر بیدل اپنی سحر پردازی اور معنی آفرینی میں اب تک بے نظیر سمجھے جاتے ہیں، ان اساتذۂ سخن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے صائب کے اشعار سے سرقہ کیا،

اور پھر بیدل اور میرزا محمد طاہر قزوینی وحید کے ایک شعر کا دوسرا مصرع تو بالکل ایک ہی ہے،

وحیدؔ: مالِ ما شکستگی پر نبستہ است — پرواز ما چو رنگ بیال شکستہ است

بیدلؔ: ما لافِ ہمت از مدد عجز می زنیم — پرواز ما چو رنگ بیال شکستہ است

خود وحیدؔ کے بعض اشعار کے مضامین اُن کے پہلے کے شعراء سے مشابہ ہیں،

واعظؔ: مدعا از دل بروں کن تا برآید مدعا — شد نگیں با نام تا افگند از خود نام را

وحیدؔ: دور فگن نام را کہ نام فگندن — صاحب نام و نشاں نمود نگیں را

ناظمؔ: چناں بگذشت زیں نہ سقف شفاف — کہ سیلاب نگہ از عینک صاف

وحیدؔ: ز چشم مہ سوے بالا سفر کرد — چو نور دیدہ از عینک گذر کرد

فیاضؔ: بباغ بسکہ ز شرم رخت گل آب شود — غلاف غنچۂ گل شیشۂ گلاب شود

وحیدؔ: بہ گلشنے کہ رُخ دوست بے نقاب شود — ز شرم غنچۂ گل شیشۂ گلاب شود

میرزا محمد رفیع واعظ قزوینی نے اپنی کتاب ابواب الجنان کی وجہ سے شہرت حاصل کی تھی، ملا عبدالرزاق فیاض ایران کے مشہور فلسفی اور حکیم ملا صدرا شیرازی کے لائق شاگرد ہیں، میرزا محمد طاہر وحید قزوینی شاہ عباس ثانی صفوی کے دور کا شاعر ہے، اس نے دو مثنویاں مخزن اسرار اور ناز و نیاز لکھیں، اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار ہیں، ظاہر ہے کہ تیس ہزار اشعار کہنے والا شاعر سرقہ نہیں کر سکتا، پھر واعظ کے ایک شعر کا مضمون میرزا محمد قلی سلیم طہرانی سے ملتا جلتا ہے،

سلیمؔ: اگر از صبح محشر روزن من روشنی یابد — کہ شبہاے سیاہم ابر و پیوستہ را ماند

واعظؔ: چوں دو ابروے سیاہت کہ بہم پیوستہ — بے تو شبہاے درازم ہمہ بر ہم بستہ است

شاہجہانی دربار کے ملک الشعراء ابوطالب کلیم کا کلام اس کے عہد میں شعلۂ طور بن کر چمکا، لیکن اس کے بعض اشعار کے مضامین بھی سلیم کے اشعار سے مشابہ ہیں، مثلاً

سلیم: شوقِ رویش ہمہ کس را بہ غریبی دارد | سبب این است جلائے وطن آئینہ را
کلیم: چند در خانہ اش آتش فتد از پرتو تو | زین ستم آئینہ در فکرِ جلائے وطن است
سلیم: چون کشم بارِ گران غمِ دوری کز ضعف | نگہ خود نتوانم ز رخت بر دارم
کلیم: ز ناتوانی خود این قدر خبر دارم | کہ از رخت نتوانم کہ دیدہ بر دارم

اور دوسرے اساتذہ کے متحد المضامین اشعار یہ ہیں،

میر سنجر۔ دم وا پسیں زلیخا بہ ہمیں ترانہ تن زد | کہ بہ جذبۂ محبت پسر از پدر گرفتم
نقی۔ چہ غم از فریبِ دشمن کہ محبتِ زلیخا | بکشا کشِ نہانی پسر از پدر بر آرد
اسیر: نیست جوہر بہ تیغ یار اسیر | بہر قتلم نوشتہ وارد
صدی۔ نیست جوہر کہ بہ شمشیرِ تو تصویر شدہ است | رقم قتل جہانے است کہ تحریر شدہ است
غربتی۔ قضا جدا ز تو خونم چرا نمی ریزد | مگر ز دستِ قضا این قدر نمی آید
اسیر: یار ہرگز ببر نمی آید | از قضا این قدر نمی آید
حزنی: مرا بر سادہ لوحیہائے حزنی خندہ می آید | کہ دارد چشمِ لطف از دلبرنا مہربان من
فطرت: مرا بر سادہ لوحیہائے فطرت خندہ می آید | کہ عاشق گشتہ و چشمِ وفا از یار ہم دارد
سلیم: آنکہ پیغامے بروا زما بسوے او دل است | نامۂ بے طاقتاں بربالِ مرغِ بسمل است
فطرت: می تواں از دل تپیدن یافت احوالِ مرا | نامۂ بے طاقتاں بربالِ مرغِ بسمل است
دانش: لب تشنہ تیغم بگو قاتلِ ما را | کو آب کہ شیرینیِ جاں زد دلِ ما را
قاسم دیوانہ: دہم آبے ز تیغت مستمندم | دلم می سوزد از شیرینیِ جان

پیشرو اساتذہ سے استفادہ کرنا غزل گوئی کی روایت بن گئی ہے، خواجہ حافظ شیرازی کی غزل گوئی پر تو کوئی حرف نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن مولانا شبلیؒ رقمطراز ہیں کہ خواجہ صاحب

نے غزل گوئی شروع کی، تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں:

دارد سخنِ حافظ طرز و روشِ خواجو

پھر حافظ کی جو غزلیں خواجو کی غزلوں کی ہم طرح ہیں، ان میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں، اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں، اسی طرح سلمان کی غزلوں پر بھی حافظ کی اکثر غزلیں، اور ان سے بھی اس قدر جا بجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بنیاد پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کر دیا ہے۔

خواجو اور سلمان کے جو متحد المضامین اشعار حافظ کے یہاں ملتے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:-

خواجو: گر شدیم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست — ہمچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما

حافظ: در خرابات مغاں ما نیز ہم دستاں شدیم — کایں چنیں رفت است در روز ازل تقدیر ما

خواجو: ما دل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم — اے بسا عاقل کہ شد دیوانہ زنجیر ما

حافظ: عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است — عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما

خواجو: از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو — کز کمان نرم زخمش سخت باشد تیر ما

حافظ: تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش — رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما

خواجو: بیا صبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی — بداں زمیں گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی

حافظ: نسیم صبح سعادت بداں نشاں کہ تو دانی — گذر بکوئے فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی

خواجو: چو مرغ در طیراں آئی و چوں باوج رسی — نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی

حافظ: تو بیک حضرت شاہی مراد و دیدہ بہشت — کرم نما و بفرما خبر چنان کہ تو دانی
خواجو: دل دریں پیرزن عشوہ گر دہر مبند — کیں عروسے است کہ در عہد بسے داماد است
حافظ: مجو درستی عہد از جہان بے بنیاد — کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است
خواجو: منزل از پاقرین است چہ دوزخ چہ بہشت — سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت
حافظ: ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست — ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت
خواجو: کے برکنم دل از رخ جاناں کہ مہر او — با شیر در دل آمد با جاں بدر شود
حافظ: عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم — با شیر در بدن شد و با جاں بدر شود
سلمان: سودائے زہد خشکم بر باد دادہ حاصل — مطرب بزن ترانہ ساقی بیار بادہ
حافظ: گل رفت اے حریفاں غافل چرا نشیند — بے بانگ رود و چنگ و بے یار و جام بادہ
سلمان: ایم بستہ دل را در لعل دلکشایت — آن لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ
حافظ: زیں زہد و پارسائی بگرفت خاطر من — ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ
سلمان: سودائیان زلفت گرد تو حلقہ بستہ — شوریدگانِ رویت در یکدگر فتادہ
حافظ: در مجلس صبوحی دانی چہ خوش نماید — عکس عذار ساقی بر جام می فتادہ

مولانا شبلی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "خواجہ صاحب نے متعدد مضامین شیخ سعدی سے بھی لئے ہیں"۔ اور یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ حافظ نے اپنی بعض غزلیں خسرو کی غزلوں کو سامنے رکھکر کہی ہیں ہم نے اپنی کتاب بزم مملوکیہ میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں (ص ۳۱۶) ان میں سے ایک مثال یہاں بھی پیش کی جاتی ہے

خسرو: بیا جاناں کہ جانت را بمیرم — وگر میرم بجاں منت پذیرم
حافظ: بہ تیغم گر زند دستش نگیرم — وگر تیرم زند منت پذیرم
خسرو: نظر گفتند داری با فقیراں — من مسکین نہ آخر ہم فقیرم

حافظ: نصاب حسن در حد کمال ست ۔۔۔ زکاتم دہ کہ مسکین و فقیرم

خسرو: نمی آید بگوشت نالۂ من، ۔۔۔ کہ گوش چرخ کر گشت از نفیرم

حافظ: من آں مرغم کہ ہر شام و سحرگاہ ۔۔۔ رسد تا سدرہ آواز نفیرم

مذکورہ بالا اشعار میں کہیں مضامین کہیں قوافی اور کہیں ترکیبیں مشترک ضرور ہیں لیکن ارباب نظر جانتے ہیں، کہ ان مضامین اور الفاظ کے الٹ پھیر میں یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں تو خواجہ حافظ اپنے پیشروں سے بازی نہیں لیجا سکے ہیں، لیکن خواجہ حافظ نے اکثر اشعار میں اپنی برجستگی، لطافت اور حسن بندش کی وجہ سے اپنے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ بقول مولانا شبلی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی ان ہی قطروں سے بنے ہوئے ہیں، مولانا شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ خواجہ حافظ اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں اُن کی شاعری کے بہات مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابرکرم کے رشحات ہیں اہم اینمہ اُن کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں اس کا کچھ سبب ہو گا اور وہی خواجہ حافظ کی خصوصیات شاعری ہیں، .... حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کا مصداق ہے، (شعر العجم حصہ دوم ص ۲۴۵ - ۲۳۹) اور بالکل یہی بات غالب کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے،

شاید مرزا یگانہ کی نظر مذکورۂ بالا اساتذہ کے متحد المضامین اشعار پر نہیں پڑی، ورنہ وہ غالب شکن کی طرح حافظ شکن، صائب شکن، کلیم شکن، اور بیدل شکن وغیرہ بھی لکھ ڈالتے، اور ان میں

سلیم: شوقِ روییش ہر کس را بہ غریبی دارد سبب این است جلائے وطن آئینہ را
کلیم: چند در خانہ اش آتش فتد از پرتو تو زین ستم آئینہ در فکر جلائے وطن است
سلیم: چون کشم بارِ گرانِ غمِ دوری کز ضعف نگہ خود نتوانم ز رخت بردارم
کلیم: ز ناتوانی خود این قدر خبر دارم کہ از رخت نتوانم کہ دیدہ بردارم

اور دوسرے اساتذہ کے متحد المضامین اشعار یہ ہیں،

میر نجر۔ دم واپسیں زلیخا بہ ہمیں ترانہ تن زد کہ بہ جذبۂ محبت پسر از پدر گرفتم
نعی۔ چہ غم از فریب دشمن کہ محبتِ زلیخا بکشاکشِ نہانی پسر از پدر برآرد
اسیر: نیست جوہر بہ تیغ یار اسیر بہر قتلم نوشتہ وارد
صدی۔ نیست جوہر کہ بہ شمشیر تو تصویر شدہ است رقم قتل جہانے است کہ تحریر شدہ است
غرنی۔ قضا جدا ز تو خونم چرا نمی ریزد مگر ز دستِ قضا این قدر نمی آید
اسیر: یار ہرگز بہ بر نمی آید از قضا این قدر نمی آید
حزنی: مرا بر سادہ لوحیہائے حزنی خندہ می آید کہ دارد چشم لطف از دلبرِ نامہربان من
فطرت: مرا بر سادہ لوحیہائے فطرت خندہ می آید کہ عاشق گشتہ و چشم وفا از یار ہم دارد
سلیم: آنکہ پیغامے بروا زما بسوے او دل است نامہ بے طاقتان بر بالِ مرغِ بسمل است
قطرت: می تواں از دل تپیدن یافت احوال مرا نامہ بے طاقتاں بر بال مرغ بسمل است
دانش: لب تشنہ تیغم بگو قاتل ما را کو آب کہ شیرینی جاں زد دل ما را
قاسم دیوانہ: دم آب ز تیغت مستمندم دلم می سوزد از شیرینی جان

بیشتر اساتذہ سے استفادہ کرنا غزل گوئی کی روایت بن گئی ہے، خواجہ حافظ شیرازی کی غزل گوئی پر تو کوئی حرف نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن مولانا شبلیؒ رقمطراز ہیں کہ خواجہ صاحب

نے غزل گوئی شروع کی، تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں

دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو

پھر حافظ کی جو غزلیں خواجو کی غزلوں کی ہم طرح ہیں، ان میں جابجا مصرعے تک رنگئے ہیں، اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں، اسی طرح سلمان کی غزلوں پر بھی حافظ کی اکثر غزلیں، اور ان سے بھی اس قدر جابجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بنیاد پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کر دیا ہے۔

خواجو اور سلمان کے جو متحد المضامین اشعار حافظ کے یہاں ملتے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں :-

خواجو: گر شدیم از بادۂ بدنام جہاں تدبیر چیست	ہمچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما
حافظ: در خرابات مغاں ما نیز ہم دستاں شدیم	کایں چنیں رفت است در روز ازل تقدیر ما
خواجو: ما دل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم	اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما
حافظ: عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است	عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما
خواجو: از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو	کز کمان نرم زخمش سخت باشد تیر ما
حافظ: تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش	رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما
خواجو: بیا صبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی	بداں زمیں گذرے کن بداں محل کہ تو دانی
حافظ: نسیم صبح سعادت بداں نشان کہ تو دانی	گذر بکوی فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی
خواجو: چو مرغ در طیراں آئی و چوں بہ اوج رسی	نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی

حافظ: تو بیک حضرت شاہی مراد و دیدہ ہست — کرم نما و بفرما خبر چنانکہ تو دانی
خواجو: دل دریں پیرزن عشوہ گر دہر مبند — کیں عروسے است کہ در عقد بسے داماد است
حافظ: مجو درستی عہد از جہان بے بنیاد — کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است
خواجو: منزل از پا ترین است چہ دوزخ چہ بہشت — سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت
حافظ: ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست — ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت
خواجو: کے برکنم دل از رخ جاناں کہ مہر او — با شیر در دل آمد با جاں بدر شود
حافظ: عشق تو در وجود و مہر تو در دلم — با شیر در بدن شد و با جاں بدر شود
سلمان: سودائے زہد خشک بر باد دادہ حاصل — مطرب بزن ترانہ ساقی بیار بادہ
حافظ: گل رفت اے حریفاں غافل چرا نشینید — بے بانگ رود و چنگ بے یار و جام بادہ
سلمان: ایم بستہ دل را در لعل دلکشایت — آن لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ
حافظ: زیں زہد و پارسائی بگرفت خاطر من — ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ
سلمان: سودائیان زلفت گرد تو حلقہ بستہ — شوریدگانِ سویت در کید گرفتادہ
حافظ: در مجلس صبوحی دانی چہ خوش نماید — عکس عذار ساقی بر جام می فتادہ

مولانا شبلی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "خواجہ صاحب نے متعدد مضامین شیخ سعدی سے بھی لئے ہیں"۔ اور یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ حافظ نے اپنی بعض غزلیں خسرو کی غزلوں کو سامنے رکھکر کہی ہیں ہم نے اپنی کتاب بزم مملوکیہ میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں (ص ۳۱۶) ان میں سے ایک مثال یہاں بھی پیش کرتے ہیں

خسرو: بیا جاناں کہ جانت را بمیرم، — وگر میرم بجاں منت پذیرم
حافظ: بہ تیغم گر زند دستش بگیرم، — وگر تیرم زند منت پذیرم
خسرو: نظر گفتند داری با فقیراں — من مسکین نہ آخر ہم فقیرم

حافظ: نصاب حسن در حد کمال ست   زکاتم دہ کہ مسکین و فقیرم

خسرو: نمی آید بگوشت نالۂ من،   کہ گوش چرخ کر گشت از نفیرم

حافظ: من آن مرغم کہ ہر شام و سحرگاہ   رسد تا سدرہ آواز نفیرم

مذکورہ بالا اشعار میں کہیں مضامین کہیں قوافی اور کہیں ترکیبیں مشترک ضرور ہیں لیکن ارباب نظر جانتے ہیں، کہ ان مضامین اور الفاظ کے الٹ پھیر میں یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں تو خواجہ حافظ اپنے پیشروں سے بازی نہیں لیجا سکے ہیں، لیکن خواجہ حافظ نے اکثر اشعار میں اپنی برجستگی، لطافت اور حسن بندش کی وجہ سے اپنے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ بقول مولانا شبلی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی ان ہی قطروں سے بنے ہوئے ہیں، مولانا شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ خواجہ حافظ اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، ان کی شاعری کے بہت مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابر کرم کے رشحات ہیں، تاہم ان کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں، اس کا کچھ سبب ہوگا اور وہی خواجہ حافظ کی خصوصیات شاعری ہیں، .... حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے، لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کا مصداق ہے، (شعر العجم حصہ دوم ص ۲۴۵ - ۲۳۹) اور بالکل یہی بات غالب کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے،

شاید مرزا یگانہ کی نظر مذکورۂ بالا اساتذہ کے متحد المضامین اشعار پر نہیں پڑی، ورنہ وہ غالب شکن کی طرح حافظ شکن، صائب شکن، کلیم شکن، اور بیدل شکن وغیرہ بھی لکھ ڈالتے، اور ان میں

ہر ایک کو الو، بڈھو، منٹھو، چپ چپ، ڈھینڈس، گونگا شاعر، ٹھونس ٹھانس کرنے والا، اور بے سرا ثابت کرکے مزید ادبی خدمت انجام دیدیتے،

یگانہ کے "غالب شکن" پر اظہار خیال کرنے میں میری یہ تحریر ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئی ہے جس کے لئے ناظرین سے معذرت خواہ ہوں، خیال تھا کہ یگانہ کے ہفوات ہفوات ہی سمجھے جائیں گے لیکن اُن کے خیال کی تائید اس مضمون میں بھی کی گئی، جو ارگس کے فرضی نام سے ۱۹۲۸ء کے رسالہ نگار میں کئی قسطوں میں شائع ہوا، پھر اس قسم کی آواز بازگشت ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر عندلیب شادانی کے ایک مضمون میں بھی سُنائی دی جس کو انھوں نے اپنی کتاب تحقیقات کی روشنی میں بھی منسلک کیا، پھر نیاز فتحپوری نے ۱۹۶۲ء میں نگار کا جو غالب نمبر شائع کیا، اس میں بھی یہ آواز دھیمے انداز میں سننے میں آئی، اسی طرح دہلی کے رسالہ تحریک کے غالب نمبر (مارچ ۱۹۶۹ء) کے ایک مضمون "غالب مجتہد یا مقلد" میں یگانہ کی تصنیف غالب شکن کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی، اسی لئے یہ خیال ہوا کہ غالب شکنی کے ان حملوں کا دفاع اچھی طرح کیا جائے، اسی لئے اس عنوان کے تحت میری تحریر طویل ہوگئی،

نوٹ:- اس مضمون کی پہلی قسط میں معارف کے ص ۲۶۵ پر رشید رضا چھپ گیا ہے، رضا نامہ ہے، ناظرین اس کی تصحیح کرلیں، یہ پورا مضمون میری کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" کا ایک باب ہے، یہ کتاب انشاء اللہ جلد شائع ہوگی،

بانی درسِ نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از

جناب مفتی محمد رضا انصاری استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۵)

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (شمس العلماء) جن کی وفات ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں ہوئی، احوالِ رجال میں بڑے محقق گذرے ہیں، اپنے جدامجد ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے سوانح اُن کے تلامذہ کے حالات اور تلامذہ کے سلسلۂ درس کی تفصیل اصلی ماخذوں بلکہ ایسے لوگوں سے جو براہ راست واقفیت رکھتے تھے قلم بند کرا کے اکٹھا کئے گئے تھے، فرنگی محل کے سن رسیدہ حضرات میں انھیں ایسے لوگ تو بے شک نہیں ملے جنھوں نے ملا صاحب کا زمانہ پایا ہو لیکن ملا صاحب کے تلامذہ اور اُن کے دیکھنے والوں کے دیکھنے والے اس وقت موجود تھے جب مولانا محمد نعیم نے ملا صاحب کے احوال کی تدوین کی طرف توجہ کی تھی، اس سلسلے میں اُن کی تحقیقات خالص مورخانہ انداز کی اور بے کم و کاست ہیں، ان ہی مورخانہ تحقیقات میں اُن کا یہ انکشاف بھی ہے، کہ علامہ تفضل حسین خاں (وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے اتالیق پھر نائب المملکت) دراصل ملا احمد حسین ابن ملا محمد رضا فرنگی محلی، شاگرد رشید ملا نظام الدین فرنگی محلی، کے شاگرد تھے، عام طور پر یہی ملتا ہے کہ علامہ تفضل حسین کو ملا حسن فرنگی محلی سے تلمذ تھا، بے شک ملا حسن سے بھی تلمذ تھا، اور چونکہ ملا حسن بحیثیت مصنف کافی مشہور ہوئے، اور ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا فرنگی محلی" جیسے

بے تصنیفی" کے شہرۂ آفاق نہ ہوسکے، اس لئے تذکرہ نگاروں نے علامہ تفضل حسین خاں کے اساتذہ میں ملا احمد حسین فرنگی محلی کا ذکر ضروری نہیں سمجھا،

غفران مآب | علامہ تفضل حسین خاں کے ذکر کے ساتھ ہی، جو ملا نظام الدین فرنگی کے بہ یک واسطہ شاگرد تھے، مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جن کو دو واسطوں سے ملا نظام الدین سے تلمذ تھا، مولانا سید دلدار علی جو غفران مآب کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، اور جن کا خاندان "خاندان اجتہاد" کہلاتا ہے، مولانا حیدر علی سندیلوی کے شاگرد تھے، جو اپنے والد ملا احمد اللہ سندیلوی کے بھی شاگرد تھے، اور ملا باب اللہ جون پوری سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں، جیسا کہ نزہتہ الخواطر کا بیان ہے، مولانا حیدر علی سندیلوی کو بھی ملا باب اللہ جونپوری سے تلمذ تھا، اور اپنے والد سے (ملا احمد اللہ سندیلوی سے) انھوں نے پڑھا تھا، ملا احمد اللہ سندیلوی کو ملا احمد اللہ سندیلوی سے تلمذ تھا، اور ملا احمد اللہ ملا کمال الدین سہالوی (شاگرد خاص ملا نظام الدین سہالوی) کے شاگرد تھے، جیسا کہ اغصان الانساب (قلمی) کا بیان ہے، اور ملا احمد اللہ سندیلوی نے ملا نظام الدین سے پڑھا بھی تھا، اور تکمیل بھی ان ہی سے کی یعنی فاتحۂ الفراغ ملا نظام الدین ہی سے پڑھا، تذکرہ مصنفہ مولانا غلام امام خیرآبادی کا بیان ہے کہ ملا باب اللہ جون پوری، ملا احمد اللہ سندیلوی کے شاگرد تھے، جن کو ملا نظام الدین اور ملا کمال الدین سے شرف تلمذ حاصل تھا؛ اور مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی کے فرزند مولانا سید محمد مجتہد نے بھی مولانا حیدر علی سندیلوی سے پڑھا تھا، اس طرح خاندان اجتہاد کو جو اصلاً ضلع رائے بریلی کا ہے، لیکن اس کے بیشتر افراد خاص کر علماء مجتہدین تقریباً دو سو سال سے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں، دو واسطوں یا تین واسطوں سے ملا نظام الدین فرنگی محلی سے تلمذ حاصل ہے، غفران مآب نے ان کے بعد ان کے خاندان نے

درس وتدریس کو ہمیشہ اپنا اصلی شغل رکھا، اس طرح ملا نظام الدین فرنگی محلی کے سلسلۂ تلمذ کا دائرہ اس خاندان کے واسطے سے وسیع تر ہوتا چلا گیا،

غفران مآب پہلے شخص ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں آصف الدولہ وزیر الممالک اور اُن کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی تحریک پر ۱۲۰۰ھ میں شیعہ نماز جماعت قائم کی، اور پہلے امام مقرر ہوئے، اس سے قبل شیعہ حضرات بلا جماعت فرادی نماز پڑھتے تھے، اس سلسلے میں نزہتہ الخواطر کے مؤلف کا بیان ہے کہ شیعوں کی نماز باجماعت شروع کرنے کا مشورہ خواجہ سید علی اکبر مودودی فیض آبادی نے سرفراز الدولہ کو دیا تھا، خواجہ سید علی اکبر مودودی سلسلۂ چشتیہ کے شیخ طریقت تھے، سرفراز الدولہ حسن رضا خان اور ان کے آقا آصف الدولہ دونوں خواجہ مودودی کا بڑا ادب ولحاظ کرتے تھے،

یکرمه نواب آصف الدوله ووزيره حسن رضا خان و يتردد اليه وتبلق اشاراته بالقبول وهو الذي اشار الى الوزير ان يقيموا الجماعة للصلاة (ص ۳۲۹ جلد ۶)

نواب آصف الدولہ اور اُن کے وزیر حسن رضا خان خواجہ علی اکبر مودودی کا بڑا ادب کرتے تھے، ان کی خدمت میں حاضری بھی دیتے تھے، اور اُن کے ارشادات کی تعمیل کرتے تھے، انہی خواجہ صاحب نے (شیعوں کی) نماز با جماعت کے سلسلے میں مشورہ دیا تھا،

ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تلامذہ اور بالواسطہ شاگردوں کی طویل فہرست کا احاطہ بلا شبہہ ناممکن ہے، لیکن ملا صاحب کے درس کی مقبولیت اور اس کی طرف عام رجحان کا اندازہ کرنے

کے لئے تلامذہ اور تلامذہ کے شاگردوں کی کچھ نہ کچھ تفصیل ضرور مددگار ہو سکتی ہے، اس لئے دائرے کو محدود کرتے ہوئے ملا صاحب کے ان اجلۂ تلامذہ کا ذکر کافی ہوگا، جو خاندان فرنگی محل سے تھے، جن میں ملا کمال الدین سہالوی بھی شامل ہیں، جو اگرچہ فرنگی محلی سمجھے، مگر ملا نظام الدین فرنگی محلی کے بنی عم اور ہم جد تھے،

ملا کمال الدین (وفات ۱۱۷۵ھ) کا ذکر قدرے تفصیل سے اس لئے بھی کیا گیا کہ تذکروں میں عام طور پر اُن کے تلامذہ کے ذکر کے ساتھ استاذ سے شرف تلمذ کا حوالہ مل جاتا ہے، اور حق بھی یہ ہے کہ ملا نظام الدین کی وفات کے بعد ان کے درس کا اصلی ذمہ ملا کمال الدین ہی نے اپنے سر لے لیا تھا، اور پوری تن دہی سے اپنے استاد کی خالی جگہ کو پُر کرنے کی کوشش کرتے رہے، ملا کمال ہی کے زیر تربیت رہ کر ان کے استاذزادے ملا عبدالعلی اس درجہ کو پہونچے کہ بحرالعلوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اور ان ہی ملا کمال نے اپنے بھانجوں ملا حسن فرنگی محلی اور ملا محمد علی فرنگی محلی کو استاد بلکہ استاذ الاساتذہ بنایا، اگرچہ ان کے یہ دونوں بھانجے اپنے جد (جد کے حقیقی بھائی) ملا نظام الدین سے علوم حاصل کر چکے تھے، مگر تکمیل نہیں کر پائے تھے،

ملا کمال الدین سہالوی (ثم فتح پوری) کی مسند درس فتح پور میں تھی، اور وہیں سے بیٹھ کر وہ اس خلا کو پُر کر رہے تھے، جو اُن کے اموراستاد کی وفات سے فرنگی محل میں پیدا ہو گیا تھا، اگرچہ فرنگی محل میں بھی ملا صاحب فرنگی محلی کے بلا واسطہ شاگردوں کے درس کی کئی مسندیں بھی ہوئی تھیں، جیسے ملا احمد عبدالحق فرنگی محل (وفات ۱۱۶۷ھ) ملا احمد حسین فرنگی محلی (وفات تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں) اور ملا محمد یعقوب فرنگی محلی وغیرہ ان سب کے یہاں بھی طلبہ خاصی تعداد میں آتے تھے، جن میں سے بعض خاصے نامور بھی ہوئے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جائے استاد خالی است" کا احساس فرنگی محل کی فضا میں پوری طرح موجود تھا، اور جب

ملا کمال الدین سہالوی کی نگاہ و تربیت سے سنور کر ملا عبد العلی (بحر العلوم) ملا حسن اور ملا ولی درسؒ تدریس کی طرف آئے تو فرنگی محل میں پھر استاذ الہند ملا نظام الدین کا دور تازہ ہوگیا، اور سب سے زیادہ شہرت ملا عبد العلی بن ملا نظام الدین کو حاصل ہوئی، مگر وہ دس برس سے زیادہ فرنگی محل میں ٹھہر نہ سکے، اور خونریز شیعہ سنی قضیہ کے نتیجہ میں انھیں ترکِ وطن کرنا پڑا، شاہجہاں پور گئے، جہاں کم و بیش بیس برس درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا، حافظ رحمت خاں والی ملک روہیل کھنڈ کی شہادت کے بعد رام پور اس کے بعد بوہار (ضلع بردوان) گئے، ان دونوں مقامات پر اُن کے قیام کی مجموعی مدت دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے' اس لئے کہ ۱۲۰۵ھ میں بحر العلوم مدراس پہونچ چکے تھے، جہاں بیس برس تک نشر علوم و عرفان کرنے کے بعد ۱۲۲۵ھ میں ان کا وصال ہوگیا،

ملا حسن فرنگی محلی، بحر العلوم کے ترکِ وطن کے بعد فرنگی محل میں ملا حسن کی محفلِ درس استاذ الہند کی یادگار بن گئی، اور ان کے بھائی ملا محمد ولی فرنگی محلی اور چچا ملا احمد حسین فرنگی محلی کی درس گاہ بھی، جو اس فرنگی محل میں تھی، طالبانِ علم کے لئے کشش رکھتی تھی، لیکن ملا حسن فرنگی محلی، ملاّ عبد الاعلیٰ فرنگی محلی کے بیان کے مطابق :-

بعد مہاجرت مولانائے کامل سوائے	مولانائے کامل (ملا عبد العلی بحر العلوم)
ملا مذکور دیگرے نہ بود کہ ریاست	کے ترکِ وطن فرمانے کے بعد سوائے
علمی اختیار کند، ایشاں اختیار	ملا حسن کے فرنگی محل میں کوئی دوسرا
کردند و مرجع خدام و معتقدین ایں	نہ تھا جو علمی سرداری اختیار کرتا،
خاندان شدند،	انھوں نے علمی سرداری قبول کی،
	اور خاندان فرنگی محل کے معتقدین

اور خدام کے مرجع بن گئے ،

ملا عبدالاعلیٰ اس کے آگے لکھتے ہیں :۔

قریب بست سال بدرس مشغول
ماندند، و بسیار اعتبار پیدا کردند،
چنانچہ مردمان ایشاں را جانشین
مولانا عارف می دانستند دستخط
بر استفتار می کنانیدند، چنانچہ از
مولانا عارف می کنانیدند، و بعد
انتقالش از مولانائے کامل می
کنانیدند

(رسالہ قطبیہ (قلمی)

بیس سال کے قریب ملاحسن فرنگی
محل میں درس دیتے رہے، اور بڑا
احترام ان کا کیا جانے لگا، چنانچہ
لوگ ان کو مولانائے عارف (استاذ
الہند ملا نظام الدین) کا جانشین
سمجھنے لگے تھے، اور استفتوں پر
ان سے ہی جواب لکھواتے تھے،
جیسا کہ ملا نظام الدین سے لکھواتے
تھے، اور ملا نظام الدین کے انتقال
کے بعد مولانائے کامل (ملا عبدالعلی
بحر العلوم) سے لکھوایا کرتے تھے۔

پھر ملاحسن کو بھی اسی طرح کے شیعہ سُنی قضیہ سے سابقہ پڑا، جیسا کہ بحر العلوم کو پڑا تھا، یہ شجاع الدولہ وزیرالممالک کا زمانہ تھا جس کی راجدھانی فیض آباد تھی، علمائے فرنگی کے ساتھ ملاحسن ایک وفد لیکر شجاع الدولہ کے پاس فیض آباد گئے کہ لکھنؤ کے حکام شیعہ سُنی قضیہ بھڑکاتے، اور خون ریزی کراتے ہیں، اس وفد نے خیراللہ حسینی اور محمد عطا حسینی کے خون ناحق کی بھی فریاد کی تھی، یہ دونوں طلبہ شیعہ سُنی قضیے میں شہید ہوگئے تھے، مگر فیض آباد میں کوئی دادرسی شجاع الدولہ کے عمال نے نہیں کی، ملا عبدالاعلیٰ اس سلسلے میں ارکانِ وفد کی باہمی نااتفاقی کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں،

اس میں ناکامی کے بعد ملا حسن بھی لکھنو واپس آنے کے بجائے فیض آباد سے اس راہ پر چل پڑے جو اس سے قبل ان ہی حالات میں بحر العلوم نے اختیار کی تھی، اور حافظ رحمت خاں کے پاس شاہجہاں پور پہنچ گئے، اور شاہ مدن (شاہ شرف الدین قادری جیلانی شاگرد ملا کمال الدین سہالوی) کے یہاں قیام کیا، اس وقت بحر العلوم بھی وہاں موجود تھے،

چوں حافظ رحمت خاں متوجہ بر جہاد
مرہٹہ بود و آنہا غلبہ بسیار کردہ بودند
خدمت ملا کردن نتوانست ضابطہ خاں
ابن نجیب الدولہ ملا را بملک خود طلب
نمود و آنجا تشریف بردند، اعزاز کلی
نمود، چوں خان مذکور از کفار
ہزیمت خورد برفاقت شاہ عالم
ماندند چوں خان مذکور بر ملک خود
قائم شد باز ملا را طلبیدہ با عزاز تمام
در ملک خود داشت چوں دراں ملک
ہمیشہ ہنگامۂ کفار و بغاوت بود برخاستہ
در مصطفیٰ آباد تشریف آوردند چند سال
درس دادہ فوت کردند،

اس وقت چونکہ حافظ رحمت خاں
مرہٹوں سے لڑائی کی تیاری میں
مصروف تھے، جو بے پناہ یورش
کر رہے تھے، اس لئے ملا حسن کی
خدمت بجا نہ لاسکے، نجیب الدولہ
کے بیٹے ضابطہ خاں نے ملا حسن کو اپنے
یہاں (دار الحکومت دامروہہ و نجیب آباد)
بلایا، اور تشریف آوری پر بڑی
توقیر کی، اور جب ضابطہ خاں کو
مرہٹوں کے مقابلہ میں ہزیمت ہوگئی
(اور ریاست ہاتھ سے نکل گئی) تو
ملا حسن شاہ عالم (بادشاہ دہلی) کی
رفاقت میں شاہجہاں آباد میں آرہنے
لگے، جب ضابطہ خاں پھر اپنی مملکت
پر قابض ہوا تو اس نے ملا حسن کو دہلی

سے بلوالیا، اور پورے اعزاز و احترام
کے ساتھ اپنے ساتھ رکھا لیکن چونکہ
اس کی مملکت میں مرہٹوں اور فسادیوں
کی طرف سے ہمیشہ گڑبڑ باقی رہتی تھی،
اس لئے ملاحسن وہاں سے رام پور آگئے
اور چند سال درس و تدریس میں گذار
کر وفات پاگئے، (رسالہ قطبیہ قلمی)

ملاحسن کی وفات رام پور ہی میں ہوئی، اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی، خاندانی تحریروں میں ملاحسن کی وفات کا سال مذکور نہیں ہے۔ قدرت اللہ شوق رام پوری نے جو تذکرہ شعراء موسوم بہ طبقات الشعراء کے مصنف ہیں، اپنی دوسری تصنیف "تاریخ جام جہاں نما" (قلمی) میں جو رضا لائبریری (رام پور) میں محفوظ ہے، ملاحسن کی وفات کا سال سنہ ۱۱۹۹ھ لکھا ہے، قدرت اللہ شوق ملاحسن فرنگی محلی کے "ہم استاد" مولوی غلام طیب بہاری کے شاگرد تھے، ملاحسن اور مولوی بہاری دونوں نے معقولات ملا کمال الدین سہالوی سے پڑھی تھیں،

رسالہ قطبیہ کے مصنف ملا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی ملاحسن کے داماد تھے، ان کا بیان ملاحسن کے سلسلے میں بلاشبہہ مستند ترین بیان ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارانگر (واقع ضلع بجنور) کے مدرسے میں ملاحسن نجیب الدولہ کے زمانے میں نہیں گئے تھے (جن کا انتقال سنہ ۱۱۸۴ھ میں ہوا) بلکہ ان کے بعد اُن کے بیٹے ضابطہ خاں کی دعوت پر گئے [illegible] زمانہ تھا، جب ... حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ بقید حیات تھے، حافظ رحمت خاں کی شہادت سنہ ۱۱۸۸ھ میں ہوئی، اس طرح ملاحسن کے فرنگی محل سے جانے کا زمانہ قریب قریب متعین ہو جاتا ہے، اور وہ سنہ ۱۱۸۴ھ اور سنہ ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا [illegible]

رسالہ قطبیہ کی تفصیل سے شیخ رضی الدین محمود انصاری (اغصان الانساب کے مصنف) کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے کہ نجیب الدولہ نے ملا حسن کو اپنے مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے مامور کیا تھا،

ملا حسن کے فرنگی محل سے چلے جانے کے بعد ملا نظام الدین کی مسند درس ایک بار پھر سونی سونی نظر آنے لگی تھی، اگرچہ اس وقت بھی فرنگی محل میں تلامذہ ملا نظام الدین کی درس گاہیں تھیں، ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا جو شروع سے آخر تک اپنے ماموں چچا ملا نظام الدین سے پڑھ چکے تھے، اور جن کو رسالہ قطبیہ کے مصنف کے بیان کے مطابق ملا نظام الدین نے متبنیٰ بھی کیا تھا، اور جو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے بیان کے مطابق آخر عمر تک درس دیتے رہے تھے، ان ہی کے ایک شاگرد علامہ تفضل حسین گذرے ہیں، ملا نظام الدین کے ایک دوسرے شاگرد ملا محمد یعقوب ابن ملا عبدالعزیز بھی فرنگی محل ہی میں درس دے رہے تھے، بلکہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کی تصریح کے مطابق مولانا محمد یعقوب، :-

"تحصیل علوم حضرت استاذ الاسند رحمۃ اللہ علیہ اور ملا حسن سے کر کے فارغ التحصیل ہوئے،...... استاذ الاسند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں آپ (ملا محمد یعقوب) کی تدریس کی شہرت ہوگئی تھی، آپ کی دیانت اور تقویٰ پر عوام و خواص سب کو بھروسہ تھا، یہاں تک کہ سرکار اودھ کی جانب سے آپ کو عہدۂ افتار سپرد ہوا، جس کو آخر عمر تک آپ نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے، حکام کو آپ کے فتووں پر بہت زیادہ اعتبار و اعتماد تھا"

(تذکرۂ علماے فرنگی محل مطبوعہ صفحہ ۲۰۵)

ملا محمد ولی | اور خود ملا حسن کے چھوٹے بھائی ملا محمد ولی (بن ملا غلام محمد مصطفیٰ) بھی فرنگی محل ہی

یں درس و تدریس جاری کئے ہوئے تھے، انھوں نے بھی استاذ الہند ملا نظام الدین سے اور ملا کمال الدین سہالوی (اپنے ماموں) سے پڑھا تھا، وہ مدرس بھی تھے، مصنف بھی، اُن کی ایک تصنیف شرح سلّم ہے، جو مخطوط کی شکل یں بیشتر علمی ذخیروں یں پائی جاتی ہے، اس شرح کے بارے یں مولوی غلام امام خیرآبادی کا بیان ہے کہ

شرح خوب ست، گویند کہ آں شرح بنظر	بہترین شرح ہے لوگوں کا بیان ہے
ملا نظام الدین درآمدہ و ملا اصلاح داں	کہ یہ شرح ملا نظام الدین کے ملاحظہ
فرمودہ است۔	سے گذر چکی ہے، اور ملا صاحب نے
(آمدنامہ قلمی)	اس یں اصلاح بھی فرمائی ہے،

یہی ملا ولی فرنگی محلی ہیں، جو خیرآبادی سلسلۂ تلمذ کے نامور استاد اور شاگرد رشید مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی یعنی مولوی فضل امام خیرآبادی کے استاد ہیں، ملا ولی کے تلامذہ یں اور بھی بڑے نامور لوگ ہیں، جن یں سے ایک سید انشاء اللہ خاں مشہور شاعر بھی ہیں، خود ملا ولی کے تینوں صاحبزادے مولوی عزیز اللہ، مفتی ظہور اللہ اور مولوی نور اللہ بھی اپنے والد ماجد ہی کے شاگرد تھے، مفتی ظہور اللہ کثرت تلامذہ اور مفید ترین درسی تصانیف کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے ہیں، سرکار اودھ یں عہدۂ افتار پر مامور ہونے کے باوجود درس و تدریس یں غیر معمولی انہماک رکھتے تھے، وقائع قادرخاں کے مولف مولوی عبدالقادر رامپوری سنہ ۱۲۳۰ھ یں گشت کرتے ہوئے لکھنؤ آئے، تو فرنگی محل یں مفتی ظہور اللہ سے ملاقات کیلئے بھی آئے، یہی اس وقت فرنگی محل کے سب سے بڑے عالم تھے، اپنے روزنامچے یں (جس کا واحد قلمی نسخہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے حبیب گنج کلکشن یں ہے) انھوں نے "از مناید فرنگی محل" لکھ کر مفتی ظہور اللہ کو یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"ایک دن مولوی ظہور اللہ صاحب کی زیارت سے بھی مشرف ہوا، جو صناد ید (اکابرین) فرنگی محل میں ہیں، اور اپنے خاندان کے دستور کے مطابق فنون مروجہ کی تعلیم دیتے ہیں"

(فارسی سے ترجمہ)

ملا مبین بہرحال جب ملا حسن نے فرنگی محل کو چھوڑا ہے، تو کئی مشہور فرنگی محل مدرس فرنگی محل کے اندر درس دے رہے تھے، مگر ملا حسن کا چلا جانا علی اعتبار سے خاندان فرنگی محل کے لئے باعث تشویش بن گیا تھا، ملا حسن کے شاگرد رشید اور بنی عم ملا محمد مبین بھی بہت فکر مند ہو گئے تھے اس سلسلے میں ملا مبین کے حقیقی بھتیجے اور شاگرد رشید ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے لکھا ہے،

ہرگاہ ملا حسن علیہ الرحمہ کہ استاد او	جب ملا حسن نے جو ملا مبین کے استاد
بود از وطن بطرف ملک روہیل کھنڈ	تھے، فرنگی محل سے روہیل کھنڈ کی طرف
رفتہ ملا محمد مبین علیہ الرحمہ درجناب شاہ	ہجرت کر لی تو ملا مبین نے شاہ شاکراللہ
شاکراللہ علیہ الرحمۃ حاضر شدہ حکایت	(سندیلوی شاگرد ملا نظام الدین و
رفتن ملا محمد حسن از وطن بیان آورد	مرید میر سید اسماعیل بلگرامی) کی خدمت
شاہ موصوف خطاب بوے کردہ	میں حاضر ہو کر ملا حسن کا فرنگی محل سے
فرمود میاں محمد مبین! محمد حسن نامے	چلا جانا بیان کیا، شاہ صاحب نے
بود آں نام بشما نہادہ شد بخانہ بنشینید	ملا مبین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:-
درس می دادہ باشید، اعتبار شما دریں	میاں محمد مبین! محمد حسن ایک نام تھا،
ملک زیادہ از اعتبار ملا حسن خواہد شد	وہ نام تمھیں دے دیا گیا، جاؤ گھر
وہم چناں اتفاق افتاد کہ حق تعالیٰ	گھر میں رہو، اور درس و تدریس کرو
درباطن اکثرے از امرایان آں زماں	ملا حسن سے بھی اس دیار میں

وتکرار ساختہ کہ مثل وے در ہند فاضلے
نیست چنانچہ روزے در محفل وزیر الممالک
نواب شجاع الدولہ مرحوم سید شاہ مدن
علیہ الرحمۃ مذکور ملا محمد حسن کرد و رتبہ تالیفہ
او در علم بیان ساختہ امیرے قطع کلام
کردہ مدح ملا محمد مبین آغاز نمود و مرتبہ
اورا فوق بر تبۂ ملا محمد حسن قرار دادہ سید
شاہ مدن گفت کہ وے عزیز و تلمیذ ملا
محمد حسن است امیر گفت غلط است
او تلمیذ کسے نیست شاہ مدن خاموش
ماندہ گویند کہ آن امیر مرتضیٰ خان بڑیچ
بود،

(اغصان اربعہ مطبوعہ ص ۱۴)

تمھارا اعتبار ہوگا" اور ایسا ہی اتفاق
ہوا بھی، اللہ جل شانہٗ نے اس زمانے
کے بیشتر معززین کے دلوں میں یہ
بٹھا دیا، کہ اب ہندوستان میں مُلّا
مبین کے ایسے درجے کا کوئی اور عالم
نہیں ہے، چنانچہ ایک روز وزیر الممالک
شجاع الدولہ کی محفل میں سید شاہ
مدن ؒ نے ملا حسن کا ذکر کیا (جو یقیناً
وہی زمانہ ہوگا، جب ملا حسن ہجرت
کرکے ضابطہ خاں کے پاس جا چکے
تھے،) اور تفصیل سے بتایا کہ علمیت میں
ان کا کیا بلند مرتبہ تھا، ایک امیر نے
شاہ مدن کی بات کاٹتے ہوئے "ملا
محمد مُبین کی تعریف و توصیف شروع
کردی، اور ملا مبین کو ملا حسن سے
بلند مرتبہ ٹھہرایا، شاہ مدنؒ نے جواب
میں کہا "ملا مبین تو عزیز بھی ہیں، اور
شاگرد بھی، ملا حسن ہی کے ہیں" امیر
نے کہا" بالکل غلط! ملا مبین کسی کے

شاگرد نہیں، بے چارے شاہ مدن
خاموش ہو کر رہ گئے، ان امیر کا نام
لوگوں نے امیر مرتضیٰ بجارچ بتایا ہے،

ملا محمد مبین فرنگی محلی کا عہد سعادت علی خاں ۱۲۲۵ھ میں فرنگی محل میں انتقال ہوا، وہ ملا نظام الدین کے وصال سے چار سال قبل ۱۱۵۱ھ میں پیدا ہو چکے تھے، اور اسی ۱۲۲۵ھ میں ملا بحرالعلوم کا انتقال مدراس میں ہوا ملا حسن اور ان کے چھوٹے بھائی ملا محمد ولی ایک سال کے فرق سے بارہویں صدی ہجری کے اختتام پر عازم آخرت ہو چکے تھے، فرنگی محل میں ملا محمد ولی کے صاحبزادگان نے جن میں مفتی محمد ظہور اللہ درس و تدریس میں سب سے نامور ہوئے، مشغلۂ آبائی کو جاری رکھا، اور مفتی یعقوب کے فرزند ملا عبدالقدوس نے جو ملا حسن اور ملا غلام یحییٰ بہاری کے شاگرد تھے، درس و تدریس کے شغل پر ایسی توجہ کی کہ عہد سعادت علی خاں میں عہدۂ افتا قبول کرنے سے انکار کر دیا، مدراس میں ملا بحرالعلوم کی جانشینی ملک العلماء ملا علاء الدین احمد بن مولانا احمد انوار الحق نے کی، ان کے بھائی مولانا نورالحق فرنگی محل میں درس و تدریس کرتے رہے، یہ دونوں بھائی ملا علاء الدین اور مولانا نورالحق اور ان دونوں کے والد ماجد مولانا احمد انوار الحق بھی بحرالعلوم ہی کے شاگرد تھے، ان تینوں حضرات میں کسی نے شاہجہاں پور، کسی نے رامپور اور بوہار جا کر بحرالعلوم سے اعلیٰ کتابیں پڑھ کر فراغت حاصل کی تھی، ملا بحرالعلوم کے صاحبزادوں میں بڑے ملا عبدالاعلیٰ، (مصنف رسالۂ قطبیہ) نے بھی اپنے والد ماجد ہی سے ساری تعلیم حاصل کی تھی، لیکن ان کی وفات والد ماجد سے اٹھارہ سال قبل (۱۲۰۷ھ میں) ہو گئی، دوسرے بیٹے ملا محمد نافع بن بحرالعلوم بھی والد ماجد کی حیات میں انتقال کر گئے، مولانا عبدالرب بن بحرالعلوم نے جن کو نواب آرکاٹ نے سلطان العلماء کا خطاب دیا تھا، کچھ دنوں مدراس میں والد ماجد کی وفات کے بعد درس و تدریس

کی، اس کے بعد وطن واپس آکر شغل تدریس جاری رکھا، اُن کی وفات ۱۲۵۳ھ میں ہوئی، ان کے بعد اُن کے نامور فرزند مولانا عبدالحکیم نے بحرالعلوم کی جانشینی فرنگی محل میں رہ کر کی، اور اُن سے بھی فیض بہت جاری ہوا،

شمس العلماء مولانا محمد نعیم بن مولانا عبدالحکیم نے اپنے عہد تک کے علماء فرنگی محل کے تلامذہ کی ایک فہرست تیار کی تھی، اور ملا محمد ولی فرنگی محلی کے پوتے مفتی محمد نعمت اللہ فرنگی محلی نے اس پر نظر ثانی کر کے مولانا محمد نعیم کو بعض اہم مشورے دیئے تھے، مناسب ہے کہ تلامذہ کی اس فہرست کو ان صفحات میں محفوظ کر دیا جائے، اس لئے کہ اب تک وہ مخطوطے کی شکل میں متفرق کاغذات سے منسلک ہے بعض پہلوؤں سے اس فہرست تلامذہ کی بھی تاریخی اہمیت ہے، ملا نظام الدین اور ملا بحرالعلوم کے تلامذہ اس فہرست میں جو مولانا محمد نعیم کے پرپوتے مولانا محمد ناصر فرنگی محلی کے پاس محفوظ ہے شامل نہیں ہیں،

ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا فرنگی محلی کے تلامذہ نواب تفضل حسین لکھنوی، مولوی محمد اسلم پسروزی، مرزا محمد لکھنوی، مولوی اظہار الحق بن ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی، ملا محمد مبین فرنگی محلی، ملا عبدالاعلی بن بحرالعلوم فرنگی محلی، مولوی حبیب اللہ فرنگی محلی، مولوی نورالحق فرنگی محلی، مولوی سعدالدین بن ملا احمد حسین فرنگی محلی،

تلامذہ ملا حسن فرنگی محلی مولوی سید یحیٰ عرف مسافر عظیم آبادی، مولوی عبداللہ رامپوری، .... مولوی محمد قائم، مولوی غلام نبی خاں شاہجہاں پوری، مولوی عبدالرزاق رامپوری، قاضی حسام الحق موہانی، مولوی محمد وحید موہانی، نواب تفضل حسین خان لکھنوی، مولوی محمد اسلم پسروزی، حافظ اصغر علی فیض آبادی، شیخ فصیح الزماں احمد پوری، مولوی محمد مستقیم گوپاموی، مولوی امجد علی قادری اکبرآبادی، شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی، مرزا رضی لکھنوی، میر خیراللہ حسینی بنگالی (شہید)، مرزا محمد لکھنوی، مولوی عمادالدین لبکنی، مولوی مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی، مولوی اظہار الحق فرنگی محلی،

مولوی حبیب اللہ فرنگی محلی، ملا محمد مبین فرنگی محلی، ملا عبدالعلی فرنگی محلی، مولوی عبدالقدوس فرنگی محلی، مولانا شاہ احمد انوارالحق، فرنگی محلی، قاضی محمد رکن الدین کیرانی، فتح پوری، مولوی عبدالغنی فتح پوری، حافظ......... علی رامپوری، اور شاہ ثناء اللہ سندیلوی، (یہ ملا نظام الدین کے تلامذہ میں تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ملا حسن سے بھی کچھ پڑھا ہوگا،) بیاض دراصل

تلامذہ ملا محمد ولی فرنگی محلی | قاضی سراج الدین علی خاں موہانی، مولوی نعیم اللہ بہرائچی، انشاء اللہ خاں شاعر لکھنوی، مولوی محمد نافع فرنگی محلی، مولوی، عزیز اللہ فرنگی محلی، مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی، مولوی نوراللہ فرنگی محلی، مولوی نظام الدین دیوی، مولوی احسان اللہ اناوی، مولوی حامد سہرابی، مولوی فضل امام خیرآبادی، مولوی عبدالواجد خیرآبادی، مولوی نعمت اللہ نے مولوی عبدالواجد کے تلمذ کی تصدیق نہیں کی

تلامذہ مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی، | مولوی عبدالرحیم صفی پوری، مولوی فضل رسول بدایونی (ساتھ یہ بھی تحریر ہے کہ "مولوی فضل رسول انکار کردند") مولوی یادعلی نصیرآبادی، مولوی ہادی دیوی، مولوی احسان اللہ اناوی، مولوی کفایت اللہ مرادآبادی معروف بہ کافی شاعر (راجہ امداد علی خاں کنتوری) مولوی امداد علی حدیث خواں، منشی عبدالکریم لکھنوی، احسان حسین خاں لکھنوی، حکیم واجد علی خاں موہانی، مولوی فضل امام موہونی، مولوی عبدالقادر لکھنوی، مولوی غنی نقی، زیدپوری، مولوی مسیح الدین خان کاکوروی (سفیر اودھ) مولوی احمد علی محمد آبادی، مولوی احمد علی چریاکوٹی، مولوی محمد سعید عظیم آبادی (اس کے ساتھ لکھا ہے، مولوی نعمت اللہ منسوخ کردند") مولوی ابوالحسن پنجابی عظیم آبادی، مولوی حیدر علی فیض آبادی، مولوی منظر علی خان لکھنوی، اخوند شیر محمد ولایتی، شاہ احمد سعید دہلوی، مولوی عبدالقادر فیض آبادی، مولوی جلال الدین رام پوری، مولوی سعد اللہ مرادآبادی (مفتی اودھ) مولوی جعفر علی کسمنڈوی) مولوی قدرت علی ردولوی، مفتی عبدالسلام امیٹھوی، مولوی فضل علی سندیلوی، مولوی محمد حنیف دھنتوری، مولوی صبغۃ اللہ نگرامی، مولوی

محمد صادق لکھنوی، مولوی حسین احمد ملیح آبادی (محدث) قاضی امین الدین فتح پوری، مولوی برہان الحق فرنگی محلی، مولوی محمد حیدر فرنگی محلی، مولوی ظہور علی فرنگی محلی، مولوی محمد اسحاق رام پوری، مولوی نجم الدین رامپوری، منشی عبد الواحد رام پوری، (شاگرد مولوی اسماعیل لندنی ہم بود) مولوی محمد حامد فرنگی محلی، مولوی محمد امین الحق فرنگی محلی، مولوی محمد غضنفر فرنگی محلی، مولوی خادم احمد فرنگی محلی، مولوی غلام یحییٰ فرنگی محلی، مولوی غلام زکریا فرنگی محلی، مولوی غلام محمد فرنگی محلی، مولوی محمد نور کریم دریابادی، مولوی محمد معین الدین کڑاوی، مولوی محمد خلیل اللہ فرنگی محلی، مولوی اسد اللہ فرنگی محلی، مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی، مولوی رحمت اللہ فرنگی محلی، مولوی محمد امین اللہ فرنگی محلی، مولوی محمد عبد الحلیم فرنگی محلی، مولوی محمد یوسف فرنگی محلی، مولوی محمد عیسیٰ فرنگی محلی، حکیم رضا علی لکھنوی، حکیم ابوسعد اناوی، مولوی اکبر علی فتح پوری، محمد مراد بنگالی، مرزا محمد مستقیم الہ آبادی، (جو مولوی اسماعیل لندنی کے استاد تھے) مولوی نور اللہ فرنگی محلی، قاضی سعید الدین سہالوی، مرزا خیر اللہ لکھنوی، مولوی عبد المجید بدایونی، مولوی فضل علی (یہ مولوی فضل علی سندیلوی کے علاوہ دوسرے صاحب ہیں) مولوی تفضل علی جون پوری، مولوی عبد الحفیظ ملیح آبادی، مولوی ممتاز علی جائسی، مولوی سرفراز علی خاں (کہ در عظیم آباد مفتی عدالت بودند) حکیم سید محمد لکھنوی،) حکیم مرزا کلو لکھنوی، مولوی حافظ محمد (ہمشیرزادہ مولوی مراد بنگالی،) شیخ محمد حسین لکھنوی، مولوی عطا حسین (کہ در مسجد مولوی حیدر مرحوم قیام می داشتند) مولوی اسماعیل متوطن چھپرہ، حکیم غلام نجف سندیلوی، مولوی محمد ولایتی، حکیم بو علی سندیلوی، حکیم ابو البقاء متوطن سندیلہ، حکیم تنا لکھنوی، پسران حکیم منا لکھنوی، مولوی نجف علی عظیم آبادی، مولوی علی قلی خاں کنتوری، مولوی منو بنارسی، مولوی اشرف علی رودولوی، مولوی ارادت حسین بنگالی، مولوی غلام علی متوطن لہرپور کھیری، مولوی غلام علی بنگالی، مولوی میر سید محمد رودلوی، مرزا عباس لکھنوی، پنڈت بخت مل لکھنوی، حکیم امداد حسین خاں موہانی، مولوی عظیم الدین سرہندی، مولوی پیر بخش (متوطن

حضرت کچھوچھہ اُستاد مسیح الدولہ) حکیم کلو لکھنوی، (حکیم مرزا کلو لکھنوی سے مختلف یہ صاحب ہیں) مولوی ثابت علی الہ آبادی، مولوی عنایت الدین پنجابی (کہ در مدرسہ کلکتہ مدرس بودند) مولوی نیاز علی پنجابی، مولوی امانت اللہ بنگالی، مولوی دیانت اللہ بنگالی، حکیم فرخ حسین بنگالی، حکیم مرزا محمد (برادر حکیم مرزا محمد شریف لکھنوی) مولوی شکر اللہ الہ آبادی، (ابن شاہ حجۃ اللہ) مولوی مجد الدین، پسر مولوی عبد الحکیم پنجابی، منشی مصلح الدین علی نقی خاں ملانوی، حکیم میرزا ہر علی اودھی، حفیظ الدولہ مولوی باقر علی اودھی، (استاد امجد علی بادشاہ اودھ) مولوی اعظم علی بنگالی، حکیم معصوم علی، مولوی یاد علی بنگالی، میر غلام علی بریلوی،

تلامذہ ملا نور اللہ بن ملا محمد ولی فرنگی محلی	مولوی اسد اللہ فرنگی محلی، مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی، مولوی رحمۃ اللہ فرنگی محلی، (یہ تینوں ملا نور اللہ کے صاحبزادگان ہیں،)

مولوی امین اللہ فرنگی محلی، مولوی ظہور علی فرنگی محلی، مولوی محمد یوسف فرنگی محلی، مولوی عبد الغفار فیض آبادی منشی الملوک کنور رتن سنگھ، مولوی جعفر علی کسمنڈوی، مولوی یاد علی نصیرآبادی، مولوی مظہر علی خان لکھنوی، حکیم واجد علی موہانی، مولوی نور کریم دریابادی، مولوی ثابت علی الہ آبادی محمد مسیح زمان (ساکن توپ دروازہ) مولوی غلام یحییٰ خان فرنگی محلی، مولوی محمد حیدر فرنگی محلی، مولوی تفضل علی جون پوری، مولوی عبد الکریم لکھنوی، منشی عبد الکریم لکھنوی، پنڈت بخت مل لکھنوی میر نثار علی فیض آبادی، مولوی عظیم اللہ موہانی، حکیم وارث علی موہانی، مولوی میر سید محمد رودولوی مولوی عبد الحکیم پنجابی، (کہ در نخاس قیام می داشتند) مولوی مرزا کاظم علی (پدر فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق لکھنوی) مولوی محمد مستقیم الہ آبادی (استاد میر اسماعیل لندنی) مولوی عبد الرحمٰن ولایتی مولوی نظامی شاہ آبادی، مولوی ممتاز علی جائسی، مولوی نور الدین ولایتی، مولوی غلام مولیٰ مولوی حیدر علی فیض آبادی،

تلامذہ مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی | شاہ غلام اعظم الہ آبادی، شاہ اکرام اللہ الہ آبادی، مولوی تفضل حسین فتح پوری، مولوی الٰہی بخش فیض آبادی، مولوی نور علی مراد آبادی، مولوی محمد معین الدین کراوی، حکیم ہدایت اللہ صفی پوری، حکیم سید محمد موہانی، حکیم غازی لکھنوی، مولوی امیر علی کنتوری، مولوی ارشاد حسین عظیم آبادی، مولوی ابونصر عظیم آبادی، مولوی علیم الدین حسین عظیم آبادی، مولوی محمد حامد فرنگی محلی، مولوی فخر الدین احمد فرنگی محلی، مولوی ابوالحسن فرنگی محلی، مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی، مولوی لمعان الحق فرنگی محلی، حافظ عبدالصمد کاکوروی، ملا نواب ولایتی، حافظ محمد سورتی، مولوی نجم الدین رامپوری، مفتی عبدالواحد رامپوری، حکیم ابوالحسن کراوی، مرزا علی عباس چریاکوٹی، حکیم مظفر حسین خاں، میر قائم علی وکیل جونپوری (منصف) اخوند علی محمد ولایتی، حکیم نواب مرزا لکھنوی، حکیم صحت اللہ مولوی محمد رحمت اللہ فرنگی محلی، شیخ محمد بخش شہید، حکیم محمد ابراہیم ابن حکیم محمد یعقوب، مولوی کرامت اللہ فرنگی محلی، خواجہ شمس الدین کشمیری، مولوی مرزا محمد علی (کلکتہ) مرزا باقر، شیخ عنایت اللہ کشمیری، مرزا عباس، علی محمد خاں، سید مہدی معروف بہ سید میرن جان، پنڈت شیو نرائن کشمیری، مولوی غلام قادر فرنگی محلی، میر احمد مفتی گنج، مرزا مہدی، مرزا علی قلی، میر عباس نواز گنجی، حکیم مرزا صفدر علی کشمیری، مولوی حمید الدین (کہ در مسجد شاہ عبدالرحمن مغفور قیام می داشتند و در عدالت فوجداری نوکر بودند) مولوی حبیب الرحمن، شیخ محمد اشرف، شیخ بتاب، مولوی اسحاق، شیخ نیاز علی، مولوی محمد جعفر سندیلوی، حکیم سید محمد ہاشم علی خاں بن حکیم کاظم علی خاں، حکیم سید محمد باسط علی خاں، حکیم سید محمد رسول خاں، حکیم سید قربان علی، حکیم سید قاسم علی، مولوی منور علی، مولوی تراب علی، حکیم نوازش علی، حکیم مولوی فخر الدین الہ آبادی، مولوی رستم علی گورکھپوری، مولوی عبدالعلی بنارسی، مولوی مدد علی بنارسی، مولوی محمد فاروق چریاکوٹی، پنڈت رام نرائن عظیم آبادی، مولوی متشرع (کہ در مسجد شاہ مینا، قدس سرہٗ مقیم بودند) مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی کے تلامذہ کی فہرست بہت

طویل ہے، اور اُن میں سے بیشتر کے وطن کا ذکر نہیں ہے، صرف نام ہیں، جن کا اعادہ کچھ مفید نہ ہوگا، خود مولوی نعمت اللہ نے فہرست تلامذہ میں لکھا ہے کہ پنجاب، ہانسی بریلی، مرادآباد، سہسوان، رامپور، بمبئی، بڑودہ، سورت، برہان پور، الہ آباد، جون پور، غازی پور، اعظم گڈھ، علی گنج، سیوان، مظفر پور، کڑہ جہان آباد، بنارس، چھپرہ، عظیم آباد، چریاکوٹ، تبیا، وبہار، اودھ کے بہت سے تلامذہ کے نام یاد نہیں آرہے ہیں،

شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی نے مولانا نعمت اللہ بن نور اللہ ابن ملا ولی فرنگی محلی کو اپنی تیار کردہ فہرست تلامذہ بھیجی تھی، اس وقت مولانا نعمت اللہ بڑودہ میں تھے، مولانا نعمت اللہ نے ۱۷ رصفر ۱۲۸۷ھ کو ایک خط کے ساتھ حک و اضافہ کرکے فہرست واپس کردی، مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی کا سفر سے وطن واپس ہوتے ہوئے بنارس میں ۱۲۹۰ھ میں انتقال ہوگیا، اور وہیں تدفین عمل میں آئی، کہا جاتا ہے، کہ شیخ علی حزین کے پہلو میں دفن کئے گئے،

مولانا نعمت اللہ نے اپنے جوابی خط میں یہ بھی نشان دہی کی ہے کہ ملا محمد رضا فرنگی محلی کی شرح سلّم جو مفقود معلوم ہوتی ہے، اُن کے مطالعے سے گذری تھی، وہ لکھتے ہیں :-

شرح سلّم حضرت ملا محمد رضا نزد حکیم مرزا غازی معائنہ کردہ بودم،	حضرت ملا محمد رضا (بن ملا قطب شہید) کی شرح سلم میں نے حکیم مرزا غازی کے پاس (جو مولانا نعمت اللہ کے شاگرد تھے) دیکھی تھی،

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی، اور مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی کی یادداشتوں سے مذکورۂ بالا صفحات پر جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ مکمل بھی نہیں ہے، اور ملا صاحب کے وصال کے بعد کے ڈیڑھ سو برس تک بھی پوری طرح حاوی نہیں ہے، اب اس سلسلے کے چند ممتاز شاگردوں کے نام ان ہی یادداشتوں

سے لکھ کر اس سلسلے کی مزید تفصیل کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھنا مناسب ہے،

مفتی محمد عباس لکھنوی (شاگرد مولوی عبد القدوس فرنگی محلی) مولوی امیر علی شہید امیٹھوی اور مولوی غلام امام شہید الہ آبادی (شاگردان مولوی اسد اللہ فرنگی محلی) مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی اور سید اولاد حسن والد ماجد نواب سید صدیق حسن خان بھوپالی (شاگردان مولانا نور الحق ابن مولانا احمد انوار الحق فرنگی محلی) مولانا شاہ فضل رسول بدایونی، مولانا نور الحق فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے جن کی دستار بندی کی رسم ردولی شریف (ضلع بارہ بنکی) میں حضرت مخدوم احمد عبد الحق ردولوی کے عرس کے موقع پر ادا کی گئی، مولوی وجیہ الدین اشرف مصنف بحر زخار (شاگرد مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی شاگرد ملا نظام الدین) مولوی مرزا حسن علی محدث لکھنوی (شاگرد مولوی احمد ابو الرحم فرنگی محلی) مولوی کرم احمد مینائی (شاگرد مفتی محمد اصغر فرنگی محلی) مولوی حیات حسین مینائی منشی طالب حسین مینائی، منشی امیر احمد مینائی امیر (معاصر داغ) اور مولوی بندہ حسن لکھنوی (شاگردان مفتی محمد یوسف فرنگی محلی) مفتی محمد یوسف فرنگی محلی فرنگی محل میں درس دیتے، اور سرکار اودھ کے عہدہ افتار کے فرائض انجام دیتے رہے، انتزاع سلطنت اودھ کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور میں مدرس اعلیٰ ہوکر فرائض تدریس انجام دیتے رہے، ان سے قبل مدرسہ حنفیہ جون پور میں ان کے عزیز اور شاگرد مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی (والد ماجد مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی) صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے، جب وہ حیدر آباد دکن بلا لئے گئے، تو انھوں نے اپنے استاد مفتی محمد یوسف کو مدرسہ حنفیہ کا ذمہ دار بنا دیا، یہ ۱۲۷۷ھ کی بات ہے، مفتی محمد یوسف اور مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی کے بکثرت تلامذہ یوپی کے مشرقی اضلاع میں تھے، مفتی محمد یوسف کا ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا، اور جنت البقیع میں مدفون ہیں،

ملا محمد مبین فرنگی محلی اور ان کے ارشد تلامذہ ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی (مصنف عمدۃ الوسائل

علمیات واعضان اربعہ وتفسیر معدن الجواہر) کے تلامذہ کی فہرست بھی خاصی لمبی ہے ، ملا ولی اللہ فرنگی محلی کی وفات سنہ ۱۲۷۰ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں ہوئی او وہ کثیر التصانیف وکثیر التلامذہ تھے سرکار اودھ کے مفوضہ فرائض کی بجاآوری کے ساتھ اُن کے علمی مشاغل معیاری پیمانے پر جاری رہے اُن کے تلامذہ میں علاوہ حضرات فرنگی محل کے چند حضرات یہ ہیں :-

مولوی نظام العالم خیرآبادی ، ملا نثار احمد ولایتی ، مولوی محمد نقی لکھنوی ، مولوی سید انور علی مراد آبادی ، مولوی محمد امین مچھلی شہری ، حکیم فخر الدین الہ آبادی ، مولوی نجف حسین کسری ، مولوی محمد حسن بدایونی ، مولوی محمد لطف اللہ زمینوی ، مولوی صاحب عالم مارہروی ، مفتی بندہ حسن لکھنوی ، حکیم زین العابدین عرف منجھلے ، نواب مہدی علی خاں (عم نواب علی نقی خاں بہادر) وغیرہ ،

تلامذہ علماء فرنگی محل کی اس طول طویل فہرست کے پیش کرنے کی غرض یہ بھی ہے کہ اس سے ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تیار کردہ درس نظامی کی جامعیت اور مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جامعیت اس پہلو سے کہ اس فہرست میں ایسے متعدد نام نظر آئیں گے جنھوں نے اسی درس کو پڑھ کر بڑے سے بڑا ملکی اور انتظامی عہدہ سنبھالا اور کسی قسم کی نااہلی کا ثبوت نہیں دیا ، گویا اس عہد کے سرکاری نظم ونسق کی ضرورتوں کو درس نظامی بالکل اسی طرح پوری کررہا تھا جس طرح آج کل سرکاری ملازمتوں کے لئے یونیورسٹی کی ڈگریاں ہیں ، اس فہرست میں ایسے نام بھی بکثرت ہیں جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا ، اور بڑی کامیابی سے اس کو انجام دیا ، گویا درس نظامی کا فارغ التحصیل اپنے زمانے میں اسی صلاحیت کا مالک مانا جاتا تھا ، جس طرح آج تدریسی منصب پر فائز ہونے کے لئے اعلیٰ ترین ڈگریوں کے حصول کو لازم قرار دیا جاتا ہے ، اور درس نظامی کی مقبولیت کا اندازہ اس پہلو سے کیا جانا چاہئے کہ آگے

حلقے میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک کے لئے کشش تھی، شیعہ سنی، اور ہندو کا کوئی فرق نہ تھا، منشی الملوک منشی رتن سنگھ، اور پنڈت بخت مل لکھنوی وغیرہ ایک طرف تھے، اور علامہ تفضل حسین اور مفتی میر عباس لکھنوی دوسری طرف، اور مولوی غلام امام شہید، مولوی فضل امام خیرآبادی، اور مولینا حکیم فخر الدین الہ آبادی وغیرہ تیسری طرف، یہ سب ایک دائرے میں اکٹھا ہو کر پہلو بہ پہلو بیٹھے اور استاد درس نظامی سے یکساں فیض حاصل کرتے تھے،

ملا نظام الدین فرنگی محلی نے حویلی فرنگی میں اٹھارہویں صدی کے بالکل آغاز یا ۱۳؍۱۱۱۲ء میں بیس بائیس سال کی عمر میں درس و تدریس کا ایک بیج بویا تھا جو دیکھتے دیکھتے سایہ دار درخت ہو گیا، پچاس سال تک وہ اس کی آب یاری کرتے رہے، اور یہ درخت پھلا پھولا، اور شاخوں نے سارے ہندوستان کو کم و بیش اپنے سایہ میں لے لیا، خود فرنگی محل کے اندر اس درخت کی جو شاخیں تھیں، وہ شاخ در شاخ ہوتی رہیں، اور جس حد تک اس مضمون میں ہم پہونچے ہیں، وہ ملا نظام الدین کے وصال کے پورے سو سال (۱۲۶۴ھ) تک کا زمانہ ہے، یہی ۱۲۶۴ھ وہ سال ہے جب خاندان فرنگی محل کا ایک شہسوار تدریس و تصنیف پردۂ عدم سے وجود میں آیا، یہ علامہ ابو الحسنات محمد عبد الحئی فرنگی محلی کا سال پیدائش ہے، اس وجود نے مسند درس پر قدم رکھتے ہی ماہتاب و آفتاب بن کر شب در روز وہ نور علمی بکھیرا کہ ہندوستان ہی نہیں، تمام ممالک اسلامیہ اس کے نور کی شعاعوں سے روشن ہو گئے، اور آج بھی جب کہ اس آفتاب کے غروب ہوئے ۱۵ کم سو سال ہو رہے ہیں، اس کی روشنی افق علمی کے دھندلکے کو منور کئے ہوئے ہے،

ملا نظام الدین کے بعد کے سو سال ہی ہم نے لئے ہیں، اس کے بعد جن اساتذۂ فرنگی محل کی رونق درس بڑھی، اس کی تفصیل میں جانے سے ہم اپنے عنوان سے بہت دور جا پڑیں گے، گو اب بھی کافی دور اس شوق میں نکل آئے ہیں، کہ ملا نظام الدین کا جلوہ ذرا دور ہو کر بھی دیکھ لیں،

دور جا کر دیکھئے نزدیک آ کر دیکھئے ہم سے ہو سکتا تو ہم اُن کو برابر دیکھئے

قرطاس اور کاغذ
تاریخ کی روشنی میں

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی

(۲)

(۲) کتابت کے لئے چمڑے کا استعمال | باوجود اپنی صفائی اور فراوانی کے قرطاس میں یہ نقص تھا کہ وہ کافی طور پر مضبوط اور پائدار نہ تھا، اس لئے اہم دستاویزوں اور نوشتوں کے لئے قدیم زمانہ کے لوگ صاف شدہ چمڑا استعمال کرتے تھے، خصوصًا اہلِ ایران اہم تحریروں کے لئے چمڑا ہی کام میں لاتے تھے، چنانچہ ابن الندیم بغدادی نے تصریحًا لکھا ہے کہ کانتِ الفرسُ تکتبُ فِی جُلودِ الجوامیس والبقرِ وَالغنمِ (کتاب الفہرست، ص ۲۱) یہی دستور یونانیوں کا تھا، جیساکہ سقراط کے ایک مقولہ سے ظاہر ہے، کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے کتابوں کی تالیف کیوں چھوڑ دی ہے، اس نے جواب دیا کہ "میں علم کو زندہ لوگوں کے دل و دماغ سے نکال کر مردہ بھیڑ بکری کی کھال میں منتقل نہیں کروں گا،" اسی قسم کے مقولے بقراط کی طرف بھی منسوب ہیں،[1]

[1] قال سقراط حین سُئِلَ عن ترکہ تصنیف الکتب "لَسْتُ بناقلٍ للعلمِ من قلوبِ البشرِ الحیّۃ الی جلود الضأن المیّتۃ" (کتاب الہند للبیرونی ص ۸۰) (بقیہ حاشیہ ص ۳۷۶ پر)

یونانی لکھنے کے چمڑے کے لئے دفتیرہ (Diphthera) کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی جلد یا کھال کے ہیں، اور بعض اہرائے مغرب کا خیال ہے کہ فارسی کا لفظ "دفتر" اسی کلمہ سے ماخوذ ہے[1] مشہور یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس جس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے لکھتا ہے کہ: "یونانی حال کی بعض اقوام کی طرح پہلے زمانہ میں دفتیرا یعنی چمڑے پر لکھتے تھے، اور وہ اس لفظ کو ابھی تک پاپائرس (Papyrus) یعنی قرطاس کے طومار کے لئے استعمال کرتے ہیں"

کتابت کے لئے چمڑا تیار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ بھیڑ بکری یا بچھڑے کی کھال لے کر اسے چونے کے پانی میں ڈال دیتے تھے جس سے اس کے بال اتر جاتے تھے، بعد ازاں اسے خشک کر کے اس پر پسی ہوئی کھریا مٹی ملتے تھے، اور پتھر سے گھوٹ کر اس کی سطح کو صاف اور ملائم بنا لیتے تھے، ایشیائے کوچک کا شہر پرغامم (Perghamum) اس قسم کے چمڑے کی دباغت اور ساخت کے لئے خاص طور پر مشہور تھا، اس لئے لکھنے کا چمڑا اسی شہر کے نام پر (Chart Perghamum) یعنی "پرغامم کا ورق" کہلایا۔ انگریزی زبان کا لفظ پارچمنٹ (Parchment) اسی سے ماخوذ ہے، اس قسم کے چمڑے کو انگریزی میں (Vellum) بھی کہتے ہیں،

رق | اوائل اسلام میں بھی چمڑا لکھنے کے لئے استعمال ہوا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کے نام جو تبلیغی مراسلہ بھیجا تھا، وہ چمڑے پر مرقوم تھا، اسی طرح خیبر کے یہود کے ساتھ آنحضرت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۵) قال له تلميذه: لو امليت علىّ كتابا يخلد عنك. قال له بقراط: الحكمة لا تحتاج الى جلود الضأن (تاريخ يعقوبى طبع بيروت جلد اول ص ۱۱۸)

قال له ليماوس: ايها المعلم، لم لا تدوّن لنا حكمتك فى المصاحف، فقال له بقراط: يا ليماوس، ما اوثقك بجلود البهائم الميتة (بحوالہ مذکورہ بالا)

[1] ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (لائڈن) طبع ثانی جلد دوم ص ۷۷،

کا جو معاہدہ ہوا، وہ بھی چمڑے پر لکھا گیا تھا، اس قسم کے چمڑے کو رق کہتے تھے، چنانچہ کتب لغت میں رق کی تشریح یوں آئی ہے، جلد رقیق یکتب فیہ۔ قرآن پاک میں رق کا جو لفظ آیا ہے اس سے لکھنے کا چمڑا ہی مقصود ہے (وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ فِي رَقٍّ مَنْشُورٍ سورۂ طور) رق کا لفظ جاہلی شعرا کے کلام میں بھی آیا ہے، اور حبشی زبان میں بھی اسی معنی میں مستعمل ہے،

طرس اگرچہ کتابت کا چمڑا مضبوط اور پائدار ہوتا تھا، لیکن گراں قیمت تھا، اس لئے اس کا استعمال عام نہ ہو سکا، بعض لوگ ضرورت کے وقت چمڑے کی پہلی تحریر کو دھوکر یا کسی اور طرح سے محو کر کے اس پر دوسری عبارت لکھتے تھے، اس قسم کے چمڑے کو جس پر ایک سے زیادہ عبارتیں یکے بعد دیگرے لکھی جائیں انگریزی میں (Palimpsest) کہتے ہیں، اس کے لئے عربی میں طرس کا لفظ آیا ہے، جس کی جمع طروس یا اطراس آتی ہے، ابن الندیم عباسی عہد کے متعلق لکھتا ہے کہ اَقَامَ النَّاسُ بِبَغْدَادَ سِنِيْنَ لَا يَكْتُبُوْنَ اِلَّا فِي الطُّرُوْسِ لِاَنَّ الدَّوَاوِيْنَ نُهِبَتْ فِي اَيَّامِ مُحَمَّدِ بْنِ زُبَيْدَةَ وَكَانَتْ فِي جُلُوْدٍ فَكَانَتْ تُمْحٰى وَيُكْتَبُ فِيْهَا (الفہرست ص ۳۲) یعنی بغداد کے لوگ کئی برس تک صرف طروس ہی پر لکھتے رہے۔ کیونکہ سیدہ زبیدہ کے فرزند محمد (الامین) کے عہد میں سرکاری دفتر (یعنی رجسٹر) لٹ گئے تھے، جو چمڑے پر مرقوم تھے، اس لئے ان کی تحریروں کو مٹا کر لوگ انہی پر لکھتے رہے"

قرطاس اور چمڑے (پارچمنٹ) کی موجودگی میں بھی دنیا کو ایسے سامان نوشت کی ضرورت تھی، جو ارزاں اور عام ہو، اس ضرورت کو اہل چین نے کاغذ ایجاد کر کے پورا کیا،

(۳) کاغذ کی ایجاد اور رواج پذیری منجملہ ان ایجادوں کے جن کے لئے ساری دنیا اہل چین کی ممنون ہے، اور جن کے رواج عام سے تہذیب و تمدن نے عظیم الشان ترقی کی ہے، اور علوم و فنون میں بالخصوص غیر معمولی اشاعت پائی ہے، کاغذ کی ایجاد بھی شامل ہے[1]

[1] ص ۸، نمبر ۶ دیکھئے،

قدیم چینی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً ایک سو سال بعد ایک شخص سائی لُون (Ts'ai Lun) نے جو شاہی سلاح خانہ کا منتظم تھا کاغذ ایجاد کیا، اس سے پہلے چینی بانس پر لکھتے تھے، پھر اس مقصد کے لئے سفید ریشمی کپڑا استعمال کرنے لگے، لیکن ریشمی کپڑا بیش قیمت تھا، اس لئے اس کا رواج عام نہ ہو سکا،

سائی لون نے پرانے چیتھڑوں، ماہی گیروں کے پرانے جالوں، گھاس پھوس، درختوں اور بالخصوص توت کی چھال سے کاغذ تیار کیا، اس کے اہل وطن نے اس ایجاد کو بہت مفید پایا، اور اس کی اہمیت اور افادیت کو دیکھ کر موجد کی ذہانت اور خدمت گذاری کا کما حقہ اعتراف کیا، چنانچہ حکومت چین کی مجلس وزراء نے ۱۰۵ء میں سرکاری طور پر سائی لون کی تحسین کی، اور بعد کے زمانے میں بھی اس کی ایجاد کی یاد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہی، چنانچہ مدت دراز تک اس کا گھر اور وہ پتھر جس میں وہ کاغذ سازی کے لئے مسالہ مہیا کرتا تھا، زیارت گاہ خاص و عام رہا،

چینی کاغذ کے سب سے پرانے نمونے جو تا حال دستیاب ہوئے ہیں، وہ ہیں، جو سر آرل سٹائن (Aurel Stein) نے مشرقی ترکستان کے غاروں میں دریافت کئے تھے، اور جو اب برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں، ان کا زمانہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی ہے اور بدھ مت کی

(حاشیہ ص ۳۷۷)

۱؎ اہل چین نے وقتاً فوقتاً چند ایک ایسی مفید عام اشیاء ایجاد کی ہیں جن کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اور جو اپنے رواج عام کی وجہ سے انسانی تمدن کا جزء لاینفک بن چکی ہے، ان اشیاء میں کاغذ کے علاوہ حسب ذیل اشیاء قابل ذکر ہیں، (۱) چینی ظروف جن کو انگریزی میں Porcelain کہتے ہیں (۲) ریشم اور ریشمی پارچہ جات (۳) قطب نما جس کی ساخت میں چینیوں نے مقناطیس استعمال کیا تھا، (۴) چائے کا استعمال بحیثیت ایک مشروب کے،

کی مذہبی تحریریں ایں، جب ان کو خوردبین سے بغور دیکھا گیا، تو معلوم ہوا کہ اُن کی ساخت میں درختوں کی چھال اور سَن کے ریشے کام میں لائے گئے تھے،

اوائل عہدِ اسلام میں چین سے بحری تجارت کے ذریعہ سے جو اشیاء اسلامی ملکوں میں درآمد ہوتی تھیں، اُن میں چینی کاغذ کا بھی ذکر آیا ہے،

کاغذ کا رواج اسلامی ملکوں میں

مسلمان کاغذ سازی کی صنعت سے کیسے واقف ہوئے؟ اس سلسلہ میں عربی اور چینی مصادر کے بیانات کو یکجا دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کاغذ کی صنعت اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سمرقند میں جاری ہوئی، اور پھر وہاں سے دوسرے اسلامی ملکوں میں پھیلی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک بھاری چینی لشکر فرغانہ کے ترک حکمراں کی امداد کے لئے آیا تھا، لیکن سمرقند کے عرب والی زیاد بن صالح خزاعی نے اسے وادی ایلی میں دریائے طراز کے نزدیک ۱۳۳ھ مطابق ۷۵۱ء میں شکست فاش دی، اور ہزاروں چینیوں کو پکڑ کر اپنے صدر مقام یعنی سمرقند میں لے آیا، ان چینی اسیروں میں بعض کاغذ بنانا جانتے تھے، چنانچہ انھوں نے سمرقند میں کاغذ سازی شروع کر دی، غالباً اس ارادے سے کہ کچھ روپیہ پیسہ کما کر اتنی رقم جمع کر لیں جس سے فاتحین کو زرِ فدیہ دے کر آزادی حاصل کر سکیں، بہرحال اُن کے ذریعہ یہ صنعت سمرقند میں جاری ہوگئی، اور یہ شہر رفتہ رفتہ کاغذ سازی کا بہت بڑا مرکز بن گیا، اور یہاں کا کاغذ بڑی افراط سے دساوَر کو جانے لگا، اور سمرقند کا نام اپنے عمدہ کاغذ کے لئے دور دور تک مشہور ہوگیا،

ابن الاثیر نے اپنی تاریخ میں ۱۳۳ھ کے ذیل میں مذکورۂ بالا جنگ کا حال حسبِ ذیل الفاظ میں لکھا ہے:-

وفیها تخالف اخشید فرغانة	اس سن میں فرغانہ کا اخشید اور چاچ کا
وملك الشاش فاستمد اخشيد	بادشاہ آپس میں جھگڑ پڑے، اور اخشید

ملك الصين فامدّه بمائة
الف مقاتل فحصروا ملك
الشاش فنزل على حكم ملك
الصين فلم يتعرض له
ولا لاصحابه بما يسوءهم
وبلغ الخبر ابا مسلم فوجّه
الى حربهم زياد بن صالح
فالتقوا على نهر طراز فظفر
بهم المسلمون وقتلوا منهم
زهاء خمسين الف واسروا
نحو عشرين الفا وهرب الباقون
الى الصين وكانت الواقعة في
ذي الحجة سنة ثلاث وثلاثين
ومائة[1]

نے چین کے بادشاہ سے امداد طلب کی،
اس نے اس کی مدد کے لئے ایک لاکھ
جنگجو بہادر بھیجے، جنھوں نے شاہ چاچ
کا محاصرہ کرلیا، شاہ چاچ نے فغفور
چین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور
فغفور نے بھی اس کے اور اس کے ساتھیوں کے
کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ
رکھی، اور جب ابو مسلم (والی خراسان)
کو یہ خبر پہونچی تو اس نے زیاد بن صالح
کو ان سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا،
چنانچہ دریائے طراز کے کنارے اُن
کا مقابلہ ہوا اور مسلمانوں نے اُن پر
فتح پائی، اور اُن کے تقریباً پچاس
ہزار آدمی قتل کر ڈالے، اور تقریباً
بیس ہزار کو اسیر کرلیا، اور باقی لشکری
چین کی طرف بھاگ گئے، یہ جنگ
ذوالحجہ ۱۳۳ھ ہجری میں واقع ہوئی
تھی،

---

[1] امام طبری نے عربوں اور چینیوں کی اس جنگ کا کہیں ذکر نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے کہ ابن الاثیر

اگرچہ ابن الاثیر نے چینی قیدیوں کے ضمن میں ان کی کاغذ سازی کا ذکر نہیں کیا لیکن دیگر متعدد مصنفین نے اس کی وضاحت کر دی ہے، کہ سمرقند میں کاغذ کی صنعت انہی اسیروں کے ذریعہ سے جاری ہوئی تھی، چنانچہ ابو منصور عبد الملک بن محمد ثعالبی نیشاپوری (متوفی ۴۲۹ھ) نے لطائف المعارف میں لکھا ہے کہ

من خصائص سمرقند الکواغیدُ	سمرقند کی خاص چیزوں میں مختلف اقسام
التی عطلت قراطیس مصرا	کے کاغذ ہیں، جن کے رواج سے مصر کے
والجلود التی کانت الاوائل	قرطاس اور وہ چمڑے متروک ہو گئے
یکتبون فیہا لانہا احسن و	ہیں، جن پر پہلے زمانہ کے لوگ لکھا کرتے
انعم وارفق و اوفق ولا	تھے، کیونکہ کاغذ (اُن کے مقابلہ میں)
تکون الا بہا وبالصین، و	بہتر اور زیادہ نرم اور ملائم ہے، اور
ذکر صاحب المسالک و	تحریر کے لئے زیادہ موزوں و موافق ہے،
الممالک انہ وقع من الصین	یہ کاغذ سمرقند اور چین کے سوا اور کہیں
الی سمرقند فی سبی سباھم	نہیں ہوتا، اور کتاب المسالک و الممالک
زیاد بن صالح من اتخذ	کے مصنف نے لکھا ہے، کہ زیاد بن صالح
الکواغید بہا ثم کثرت	چین سے سمرقند کی طرف جن قیدیوں
الصنعۃ واستمرت العادۃ	کو پکڑ لایا تھا، اُن میں بعض ایسے لوگ
حتی صارت متجراً لاھل	تھے جنھوں نے وہاں کاغذ سازی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۰) نے اس واقعہ کی کیفیت کو کسی اور معتبر مصدر سے اخذ کیا ہے، کیونکہ اس کے بیان کی تصدیق چینی تواریخ سے بھی ہوتی ہے۔

سمرقند فعمّ خیرها والارتفاق بها فی الآفاق،
(لطائف المعارف مطبوعہ مصر ص ۲۱۸)

شروع کردی، پھر اس صنعت نے بڑا فروغ پایا، اور مدت تک جاری رہی یہاں تک کہ اہلِ سمرقند کاغذ کی تجارت کرنے لگے، اور اس کا فائدہ اور استعمال تمام ملکوں میں عام ہو گیا"

اسی مفہوم کو ابو الریحان البیرونی (متوفی سنہ ۴۴۰ھ) نے ان مختصر الفاظ میں ادا کر دیا ہے"

الکواغیدُ لاهلِ الصّین وانّما احدث صنعتها بسمرقند سبیٌ منهم، ثمّ عُمِلَ[1] منه فی بلاد شتی فکان سدَاداً من عوزها
(کتاب الهند ص ۸۰)

کاغذ اہلِ چین کے ساتھ مخصوص تھا، اور اس کی صنعت کو سمرقند میں چینی اسیروں ہی نے جاری کیا تھا، پھر دیگر ملکوں میں بھی کاغذ بنایا گیا، جس سے لوگوں کی ضرورت پوری ہوئی،

ابو عبد اللہ زکریا بن محمد قزوینی متوفی سنہ ۶۸۲ھ نے اپنی کتاب آثار البلاد واخبار العباد (مطبوعہ گوٹنگا، ۱۸۴۸ء ص ۲۶۰) میں سمرقند کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ثعالبی کے مندرجۂ بالا بیان کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے،

عرب مصنفین کے بیانات کی تصدیق چینی تواریخ سے بھی ہوتی ہے، ان کا بیان ہے کہ ترک ہمیشہ عربوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے، جولائی سنہ ۷۵۱ء میں عرب امیر زیاد بن صالح نے ایک معرکہ میں نہ صرف ترکوں کو شکست دی، بلکہ اس چینی لشکر کو بھی ہزیمت دی، جسے فغفورِ چین نے کو رہا کے

---

[1] ہو سکتا ہے کہ عُمِلَ کا لفظ حُمِلَ کی تصحیف ہو،

ایک سپہ سالار کاؤ سین چاؤ کے جھنڈے تلے ترکوں کی امداد کے لئے بھیجا تھا[له]

غرض چینیوں کی آمد سے سمرقند میں کاغذ سازی کی صنعت جاری ہوگئی، اور اس کو رفتہ رفتہ اتنا فروغ ہوا کہ اہل سمرقند کاغذ کی تجارت کرنے لگے، اور سمرقند کا نام دور دور تک عمدہ کاغذ کے لئے مشہور ہوگیا،

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) اس کے وزیر فضل بن یحییٰ برمکی نے کاغذ سازی کا ایک کارخانہ بغداد میں قائم کیا، اور چند ہی برس میں وہاں کاغذ اس افراط سے تیار ہونے لگا کہ فضل بن یحییٰ کے جانشین جعفر بن یحییٰ برمکی نے سرکاری ملکوں میں چمڑے اور قرطاس کی بجائے کاغذ کا استعمال شروع کر دیا،

کاغذ کی صنعت سمرقند سے نکل کر رفتہ رفتہ دوسرے اسلامی ملکوں میں پھیلتی گئی، چنانچہ ابن الندیم نے "ورق خراسانی" کا ذکر کیا ہے، جو مقامی کتان (flax) سے تیار ہوتا تھا، اسی طرح تہامہ (عرب) کے کاغذ کے کارخانوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو کاغذ کی تیاری میں نباتاتی ریشوں یعنی گھاس پھوس سے کام لیتے تھے، پانچویں صدی ہجری میں ناصر خسرو اپنے سفرنامہ میں طرابلس کے کاغذ کا تذکرہ کرتا ہے، اور لکھتا ہے کہ یہاں کا کاغذ سمرقند کے کاغذ کی مانند بلکہ اس سے بھی بہتر ہوتا تھا (سفرنامہ مطبوعہ پیرس ص ۱۲)

جب کاغذ کی صنعت مصر میں رائج ہوئی، تو وہاں قرطاس سازی بتدریج بند ہوگئی، اور کاغذ کے رواج سے قرطاس کا استعمال تیسری صدی ہجری میں رفتہ رفتہ ہر جگہ متروک ہوگیا، اسلامی ملکوں میں کپاس (cotton)، کتان (flax) اور پٹسن (jute) وغیرہ ریشہ دار اشیاء بکثرت پیدا ہوتی تھیں، مسلمان اقوام نے کاغذ سازی میں ان سے خوب کام لیا، جس سے کاغذ کی صنعت کو ہر جگہ فروغ حاصل ہوا،

له Mailla: Histoire General de chine, vol III p 234

اور عمدہ کاغذ بآسانی ارزاں قیمت پر دستیاب ہونے لگا جس سے کتابوں کے نسخ واشاعت اور علوم وفنون کی ترقی میں بڑی مدد ملی،

فان قرہ باشق (Von Karabacek) ایک قلمی کتاب کا ذکر کرتا ہے جس کا نام "عمدۃ الکتاب" ہے، اور جس میں کاغذ بنانے کا طریقہ بتایا گیا ہے، یہ کتاب غالباً پانچویں یا چھٹی صدی ہجری میں تالیف ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مسلمانوں نے اس صنعت پر مستقل کتابیں لکھی تھیں چونکہ یہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہو سکی، اس لئے میں اس کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر سکتا

کاغذ کی صنعت اندلس میں کاغذ سازی کی صنعت مغرب کی طرف منتقل ہو کر آخرکار اندلس (اسپین) پہنچی، اور یورپ میں اسپین پہلا ملک ہے، جہاں کاغذ سازی اسلامی عہد میں سب سے پہلے جاری ہوئی اندلس میں شاطبہ (Tazira) کے شہر نے اس صنعت میں خاص نام پیدا کیا، چونکہ شاطبہ کے علاقہ میں اعلیٰ قسم کا کتان پیدا ہوتا تھا، اس لئے اس صنعت نے وہاں خوب فروغ پایا، چنانچہ شریف ادریسی جو چھٹی صدی ہجری کا ایک معروف جغرافیہ نگار ہے، شاطبہ کے بارہ میں لکھتا ہے کہ

"وہاں کاغذ سازی کے کارخانے ہیں، جن میں ایسا اچھا کاغذ تیار ہوتا ہے کہ روئے زمین پر اس کی نظیر نہیں ملتی، اور مشرق ومغرب کے ملکوں میں کثیر مقدار میں برآمد ہوتا ہے"

یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ نے بھی معجم البلدان میں شاطبہ کے عمدہ کاغذ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:-

ویعمل الکاغذ الجید فیھا	یعنی اس شہر میں عمدہ کاغذ تیار ہوتا
ویحمل منھا الی سائر بلادِ	ہے، جو اندلس کے تمام دیگر شہروں
الاندلس،	میں برآمد کیا جاتا ہے،

جب سپین کے عیسائیوں نے شاطبہ کے علاقہ کو دوبارہ فتح کر کے عربوں کو وہاں سے

نکال دیا، تو شاطبہ میں کاغذ سازی بدستور جاری رہی لیکن اب یہ صنعت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی،
اندلس میں شاطبہ کے علاوہ بلنسیہ (*Valencia*) اور طلیطلہ (*Tolado*) کے
شہر بھی کاغذ سازی کے مرکز تھے، لیکن عربی حکومت کے زوال کے بعد جب یہ صنعت عیسائیوں کے
ہاتھ میں چلی گئی، تو کاغذ کی وہ پہلی سی عمدگی اور نفاست قائم نہ رہ سکی، کیونکہ عیسائیوں کو اس
فن میں عربوں جیسی مہارت حاصل نہ تھی،

کاغذ سازی کا رواج یورپ میں | بارہویں صدی عیسوی میں قشتالہ (*Castile*) کے عیسائی
فرمانرواؤں نے اپنے ہاں شاطبہ کے نمونہ پر کاغذ تیار کیا، اور اس کا استعمال اپنی مملکت میں جاری کیا،
پھر تیرہویں صدی میں یہ صنعت اطالیہ میں پہنچی، جہاں فابریانو اور بولونیا (*Bologna*)
کے شہروں نے اس فن میں خاص شہرت حاصل کی، چودہویں صدی میں فرانس میں کاغذ سازی
کے کارخانے قائم ہوئے، اور بعد ازاں یورپ کے دوسرے ملکوں یعنی جرمنی اور انگلستان میں بھی
یہ صنعت جاری ہوگئی،[1] بہرکیف چودہویں صدی میں مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں علمی اغراض کے
لئے کاغذ کا استعمال عام ہو چکا تھا، اور پندرہویں صدی میں کتابت کے لئے چمڑے کا استعمال
رفتہ رفتہ متروک ہوگیا، اسی زمانہ میں جب یورپ میں پرنٹنگ یعنی چھاپے کا فن ایجاد ہوا، تو
کتابوں کی طباعت کے لئے اہل یورپ کے پاس خاطر خواہ مقدار میں کاغذ موجود تھا، جس سے
علوم وفنون کی اشاعت میں بے اندازہ سہولت پیدا ہوئی،

کاغذ کے رواج سے پہلے یورپ کے لوگ کتابوں کی تحریر کے لئے پارچمنٹ یعنی چمڑا استعمال
کرتے آئے تھے، لیکن پارچمنٹ گران قیمت اور کمیاب تھا، اس لئے وہاں کے عیسائی پادریوں

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے:- *Les origines du Papier par Andre Blum. Paris, 1932.*

اور راہبوں کا یہ عام دستور تھا کہ وہ قدیم یونانی اور لاطینی تصانیف کی عبارتوں کو مٹاتے تھے، اور پھر صاف شدہ چمڑے پر اپنی مذہبی تحریریں یعنی ورد و وظیفے لکھتے تھے، یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا اور یونان اور روما کا قدیم لٹریچر مٹتا رہا[1]، اور اُن کے حکما، شعرا اور ادبا کی بہت سی کتابیں ہمیشہ کے لئے ناپید ہوگئیں، عربوں نے یورپ میں کاغذ سازی کو رواج دے کر علوم قدیمہ پر بڑا احسان کیا، اگر وہ اہلِ یورپ کو کاغذ مہیا نہ کرتے، تو کلاسیکل لٹریچر رفتہ رفتہ بالکل نیست و نابود ہو جاتا، چنانچہ "تمدن عرب" کے مشہور مصنف ڈاکٹر گستاولیبون (GusTve Le Bon) اس بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"قرون وسطیٰ کے اہلِ یورپ ایک مدت دراز تک صرف چمڑے ہی پر لکھتے رہے، لیکن وہ اس قدر گراں قیمت تھا کہ اس کی گرانی کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں سخت مشکل حائل تھی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ چمڑا اس قدر کمیاب ہوگیا کہ عیسائی رہبان یونان اور روما کے بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں کی عبارتوں کو مٹا کر ان پر اپنے اوراد و وظائف لکھتے رہے، اگر عرب نہ ہوتے، اور کاغذ نہ بناتے تو قدیم زمانے کے اکثر علمی شاہکار، جن کے یہ راہب محافظ سمجھے جاتے تھے، ضائع ہو جاتے ایک ایسی چیز کو دریافت کرکے جو چمڑے کی جگہ کام دے سکے، اور مصری قرطاس کی

---

[1] مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ یونان اور روما کے قدیم لٹریچر کے ناپید ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ جب عیسائی مذہب نے کئی صدیوں کی جد و جہد کے بعد یورپ میں غلبہ پایا، تو اُن کے مذہبی پیشواؤں نے اس لٹریچر کو اپنے عقائد کے منافی سمجھ کر حتی الامکان جلا کر برباد کیا، اس سے معلوم ہوا کہ جب اسپین کے عیسائیوں نے قرطبہ اور غرناطہ کی شاہراہوں میں عربی کتابوں کو چن چن کر جلایا تھا، تو وہ اپنے ایک قدیم دستور کی تجدید کر رہے تھے۔

مانند ہو، عربوں ہی نے اشاعتِ علوم کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے[1]،

کاغذ کا رواج ہندوستان میں ہندوستان میں کاغذ کے رواج سے پہلے لکھنے کے لئے مختلف چیزیں کام میں لائی جاتی تھیں، مثلاً تاڑ کے پتے، بھوج پتر، اور سفید ریشمی کپڑا، تاڑ کے پتے لمبائی میں ایک ہاتھ اور چوڑائی میں تین انگل کے برابر ہوتے ہیں، اُن پر لکھنے کے بعد ان کے درمیان سوراخ کرتے تھے، اور ان میں دھاگا ڈال کر ایک شیرازہ میں جمع کر لیتے تھے،

بھوج کے درخت کی چھال خاصی لمبی چوڑی ہوتی ہے، اس پر مہرکشی کرتے تھے جس سے وہ چھال مضبوط اور ملائم ہو جاتی تھی، اس کے ورق الگ الگ ہوتے تھے، اس لئے تحریر کی ترتیب کو قائم رکھنے کے لئے اُن اوراق پر ہندسے ڈال لیتے تھے، اور اُن کو لکڑی کی دو تختیوں کے درمیان باندھ دیتے تھے، اور پھر حفاظت کے لئے کسی کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹ لیتے تھے، اس قسم کی کتاب کو پوتھی کہتے ہیں، اور اس طرح کی پوتھیاں ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں،

جس تحریر کو پائدار بنانا مقصود ہوتا تھا، اسے پتھر یا تانبے پر کھود دیتے تھے، چنانچہ مہاراجہ اشوک کے فرمان پتھر پر کندہ کئے گئے تھے، اور ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں، اسی طرح جاگیر کی سندات ..... جو حکمرانوں کی طرف سے امراء کو عطا ہوتی تھیں، تانبوں کی تختیوں پر منقوش ہوتی تھیں، اس قسم کی تختیاں ہندوستان کے کئی عجائب خانوں میں موجود ہیں،

ہندوستان میں کاغذ کا رواج اسلامی عہد میں ہوا، کاغذ سازی کی صنعت یہاں

---

[1] La Civilisation des Arabes par Dr. Gustave Le Bon. Paris. 1884, page 518

غالبًا ترکستان یا خراسان سے آئی ہوگی، ابتداء میں لاہور اور دہلی اسلامی حکومت اور حضارت کے مرکز تھے، اس لئے کاغذ سازی کے کارخانے غالبًا سب سے پہلے ان ہی شہروں میں قائم ہوئے ہوں گے، لیکن ہمارے پاس اس بارے میں کوئی قطعی شہادت موجود نہیں، سب سے پہلی تاریخی شہادت جو میرے علم میں آئی ہے، کشمیر کے بارے میں ہے، تو اریخ کشمیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ کشمیر کے بادشاہ سلطان سکندر کا ایک بیٹا شاہی خان تھا، جو امیر تیمور کے حملۂ ہند (۱۳۹۸ء) کے بعد اس کے ہمرکاب سمرقند گیا، اور وہاں کئی سال تک مقیم رہا، جب کشمیر واپس آیا، تو وہ ہر فن کے باکمال کاریگر اپنے ساتھ لایا، ان میں کاغذ ساز اور جلد ساز بھی تھے، جب شاہی خان زین العابدین کے لقب سے کشمیر کے تختِ حکومت پر بیٹھا، تو اُس نے ان کاریگروں کی سرپرستی کو شاہانہ انداز میں جاری رکھا، کشمیری لوگ بڑے ذہین اور چابکدست کاریگر ہیں، انھوں نے کاغذ سازی کے فن میں بڑی ترقی کی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں کشمیر میں ایسا عمدہ اور نفیس کاغذ تیار ہونے لگا کہ شاہانِ کشمیر دوسرے ملکوں کے حکمرانوں کے پاس اپنے ملک کے نوادر کے ساتھ اپنے ہاں کا بنا ہوا کاغذ بھی بطور تحفہ بھیجنے لگے،

کاغذ کی صنعت رفتہ رفتہ ہندوستان کے تقریبًا ہر صوبہ میں جاری ہوگئی، اور تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ، بہار، بنگالہ اور گجرات میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہو چکے تھے، اور ہر ایک خطہ کے کاغذ کی خاص خاص صفات تھیں، کیونکہ مختلف علاقوں میں کاغذ کی ساخت میں جو اشیاء استعمال کی جاتی تھیں، ان میں خاصا اختلاف تھا، مثلاً بنگال کے کاغذ ساز بیشتر اپنے صوبہ کا ٹسن (Jute) کام میں لاتے تھے، اور اودھ والے بانس کا ریشہ استعمال کرتے تھے، ممکن ہے بنانے کے طریقہ میں بھی اختلاف ہو، چنانچہ احمد آباد (گجرات) کا کاغذ سفید اور چکنا اور اودھ کا کاغذ دبیز اور پائدار ہوتا تھا،

اس صنعت میں پنجاب بھی دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں رہا، سیالکوٹ میں کاغذ سازی کے بہت سے کارخانے تھے، اور ان میں جو کاغذ تیار ہوتے تھے، ان کے الگ الگ نام تھے، سیالکوٹ کشمیر کی سرحد پر واقع ہے اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ کاغذ سازی کی صنعت وہاں غالباً کشمیر ہی سے آئی ہوگی، سیالکوٹی کاغذ سفید، مضبوط اور ملائم ہوتا تھا، اور تمام صوبہ میں برتا جاتا تھا اور بیوپاریوں کے بہی کھاتوں کے لئے خاص طور پر کام میں آتا تھا، خلاصۃ التواریخ کا مؤلف منشی سبحان رائے بٹیالوی (۱۶۹۵ء) سیالکوٹ کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس شہر میں عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے، جو سفید، صاف اور پائدار ہے، خصوصاً وہ اقسام جو خاصۂ جہانگیری اور مان سنگھی کے نام سے مشہور ہیں"۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ اور ان کے امراء دیگر صنعتوں کے علاوہ کاغذ سازی میں بھی دلچسپی لیتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کی توجہ اور شاہانہ سرپرستی سے اس فن کو فروغ حاصل ہوا ہوگا،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے

تمدنی کارنامے

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے شاندار عہد کے فن تعمیر، رفاہ عام کے کام، شہروں اور قریوں کی آبادی، باغات، ترقی حیوانات، تمدنی تعلیم، کاغذ سازی، کتب خانہ، اور خطاطی وغیرہ پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس دور میں اسی زمانہ کے بنے ہوئے کاغذ پر کتابیں لکھی جاتی تھیں، جن کے نمونے آج بھی، تمام کتب خانوں میں نظر آتے ہیں،

قیمت :- معہ

"منیجر"

غروری

از

جناب پروفیسر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

بیشتر تذکرہ نویسوں نے گیارہویں صدی ہجری کے ایرانی شعرا میں ایک شاعر غروری کا ذکر کیا ہے اور اس کو کاشی بتلایا ہے، مگر بعض تذکروں میں دوسرے غروری کا بھی ذکر کیا گیا ہے، کلمات الشعراء کے مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ میں صرف غروری لکھا ہوا ہے، مگر ان کی جانب جو اشعار منسوب ہیں وہی اشعار اس تذکرہ میں میر برہان عروس کی طرف منسوب ہیں، نیز حاشیہ میں لکھا ہے کہ دوسرے نسخہ میں عروس کا تخلص عزلت ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے ان دونوں کو ایک کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں دو ہم عصر شاعر تھے، جن کا تخلص غروری تھا، اور دونوں کاشان کے رہنے والے تھے، ان میں سے ایک ہندوستان آئے، اور دوسرے ایران ہی میں رہ گئے، کلمات الشعراء میں دونوں کا ذکر ہے، اور دونوں کو کاشی کہا گیا ہے تذکرہ کاتب میں ایک کو غروری کاشی اور دوسرے کو جو ہندوستان آئے تھے، میر غرور کاشی کہا گیا ہے مؤلف مخزن غرائب نے بھی ہندوستان آنے والے غروری کو میر غرور کاشی لکھا ہے، مؤلف ریاض الشعراء نے ہندوستان والے کو میر غروری کاشی ۔۔۔۔۔۔ اور دوسرے کو غروری کاشی لکھا ہے،

ملا غروری کاشی کو نصر آبادی نے احتمالاً شیرازی بتایا ہے، اور ان کی بڑی تعریف کی ہے

اور لکھا ہے کہ وہ دنیاوی چیزوں سے پرہیز کرتے تھے، اسی لئے اسّی برس کی عمر پائی، اور بقول اُن کے وہ زندہ دل انسان تھے، اور اکثر صاحبانِ حال کی خدمت میں رہا کرتے تھے، آخر عمر میں اصفہان کے ایک قہوہ خانے میں رہنے لگے تھے، جہاں لوگ ان سے ملاقات کرتے تھے، ان کا ذریعۂ معاش جدول کشی اور رسّالی تھا، نصر آبادی کے والد سے اُن کے اچھے تعلقات تھے، اور وہ اپنے والد کے ساتھ اُن کے پاس جایا کرتے تھے، شاہ صفی کی حکومت کے آخری زمانے میں انھوں نے انتقال کیا، انہی غروری نے مثنوی تحفۃ العراقین کی بحر میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی' اس کے معراج کے اشعار کو تذکرہ نصر آبادی میں نقل کیا ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے:-

شد ز آمدنش چو چرخ آگاہ — پر کرد ز شمع مشعلش راہ

مؤلف خزانۂ عامرہ نے ان کو قطعاً شیرازی بتلایا ہے، اور نصر آبادی کے حوالے سے ایک شعر نقل کیا ہے،

یہ شعر شاہ عباس ماضی[1] کے کتابدار صادق بیگ نقاش[2] کی مدح میں کہا تھا، اور قہوہ خانے میں اُن کو سنایا تھا:-

چوں عرصۂ زنگ است وصدائے زنگ است — صیت سخن تو در جہان امکان

یہ بھی لکھا ہے کہ جب غروری نے یہ شعر پڑھا تو صادق بیگ نے مسودہ اُن کے ہاتھوں سے لے لیا اور کہا کہ مجھ میں اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ نہیں ہے، مؤلف تذکرہ نے

---

[1] سنہ ۹۸۵ھ سنہ ۱۰۳۸ھ / سنہ ۱۵۸۷ء - سنہ ۱۶۲۹ء

[2] ناظم تبریزی نے لکھا ہے کہ صادق بیگ کی جامعیت کے لحاظ سے کوئی برابری نہیں کر سکتا، اگرچہ ہر صنف میں شعر کہا ہے، مگر اُن کی مثنوی اور قصیدے غزلوں سے بہتر ہوتے ہیں،

یہ بھی لکھا ہے کہ اس شعر کا وزن ایرانیوں کا نکالا ہوا ہے، اور اچھا نہیں ہے، مؤلف ریاض الشعراء نے ان غروری کو کاشی بتایا ہے، اور لکھا ہے "در نہایت افتادگی و کمال مسکنت بودہ"[1]

دوسرے غروری وہ ہیں جن کو سب نے کاشی لکھا ہے، یہ تقی اوحدی کے معاصر اور صاحب دیوان تھے، تقی اوحدی ان سے ایران و ہندوستان دونوں جگہ ملے تھے، تذکرۂ میر علاء الدولہ نے ان کے دیوان کے اشعار کی تعداد تین ہزار بتائی ہے،

فانوس خیال میں اُن کو میر برہان غروری تبلایا گیا ہے، اور لکھا ہے کہ ہندوستان آکر انھوں نے اپنا تخلص برہان کر لیا تھا، اسی تذکرہ میں ان کو "نادرہ گو کاشیریں سخن"[2] لکھا گیا ہے، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ فن سپہ گری میں مہارت رکھتے تھے، اُس کے بیان کے مطابق غروری کاشان کے مشہور سادات میں تھے، مگر ابتداء عمر میں شیراز چلے گئے، اور وہاں مدتوں مقیم رہے اور وہاں کی ممتاز شخصیتوں سے اُن کے تعلقات رہے، شیراز سے غروری ہندوستان آئے، یہاں آنے کے سبب کا ذکر آیندہ آئے گا، مؤلف میخانہ نے غروری کو "مجموعۂ نکتہ دانی"[3] لکھا ہے، اور اُن کے اشعار کے بارہ میں لکھا ہے کہ اچھے اور پسندیدہ ہوتے ہیں، لیکن اکثر مضامین متقدمین اور متاخرین سے ماخوذ ہیں[4]، عبدالنبی مولف میخانہ نے انھیں نہیں دیکھا تھا، لیکن اُن کے بعض ساتھیوں سے ان کے حالات تحقیق سے معلوم کئے تھے، اُن کے قول کے مطابق غروری کاشان سے شیراز اور وہاں سے لار گئے، اور قبل اس کے کہ لار شاہ عباس کے قبضہ میں آئے، انھوں نے انوری[5] کا ایک قصیدہ اپنے نام سے وہاں کے بادشاہ کی شان میں پیش کر دیا، اس پر انھیں انعام ملا، اُس کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے، مگر جب پھر عراق پہنچے، تو اُن کے آنے سے پہلے ہی یہ راز فاش ہو گیا، اور لوگوں نے ان کا اتنا مذاق اُڑایا کہ ان کو ایران چھوڑ کر ہندوستان

---

[1] اورق ۴۴۲ [2] ورق ۲۲ [3] ورق ۸۴ [4] ورق ۸۵ [5] متوفی در حدود ۵۸۳ھ/ ۱۱۹۲ء

آنا پڑا، مؤلف میخانہ کے زمانہ میں غروری ہندوستان کی سیاحت میں مشغول تھے، انھوں نے اُن کے ساقی نامہ کی تعریف کی ہے، اور اس کو نقل کیا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے،

ثنا می کنم پیرِ میخانہ را — تجلی دہ طور پیمانہ را

اس مثنوی کے کچھ اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

زشرمِ رُخِ ساقیِ گرم خوی — خوی خجلت از شبنم آرد بروی

مشو خرّم از عارضِ تابناک — کہ گل ہم ازیں غصہ زد جامہ چاک

مہِ عارضش شمع کاشانہ بود — تجلی درآں بزم پروانہ بود

بُتِ سرکش مجلس آرائے من — بہار برق کشت تمنائے من[۵۵]

میخانہ کے لاہور والے مطبوعہ نسخہ میں اس مثنوی کے ۱۵۷، اور طہران والے نسخے میں ۱۷۶، اشعار ہیں،

غروری کے بارہ میں پروفیسر شفیع کو بھی اشتباہ ہوا ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غالباً یہ دونوں غروری ایک ہیں، میخانہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ پتہ نہیں وہ کون سے غروری ہیں، جن کا یہ ساقی نامہ ہے، مؤلف مخزن نے کاشان کے دو غروری کا ذکر کیا ہے، اور انھوں نے اور مبتلا نے یہ شعر نقل کیا ہے،

باید کہ تو برنہ گردی از من — سہل است کہ روزگار برگشت

اسی شعر کو آزاد نے خزانہ عامرہ میں غروری شیرازی کی طرف منسوب کیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ غروری کاشی اور شیرازی ایک ہیں[۵۵]،

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ غروری شاہجہاں[۵۶] کے زمانہ میں ہندوستان آئے،

---

[۵۵] میخانہ ص ۵۴ [۵۶] ۱۰۳۷ھ / ۱۰۶۸ھ – ۱۶۲۸ – ۱۶۵۸ء

مگر فانوس خیال میں ہے کہ ہندوستان اکبر پہلے وہ عبدالرحیم خانخاناں[1] کے مداحوں اور ملازموں میں شامل ہوئے، یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے، خانخاناں نے جہانگیر[2] کے زمانہ میں انتقال کیا اس لئے غروری شاہجہاں کے عہد سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہوں گے، اس قول کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ تقی اوحدی اُن سے ہندوستان میں بھی ملے تھے تقی اوحدی نے ....۱۰۳۰ ہجری/۲۱-۱۶۲۰ء میں انتقال کیا، اس لئے یقین سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ شاہجہاں کی تخت نشینی سے پہلے جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آگئے تھے،

شمالی ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد غروری دکن گئے، اور وہاں کے عرفا کے ساتھ اپنا وقت گذارنے لگے، دکن کے بادشاہ کی مدح میں کہتے ہیں:-

طبع را در عہد بذل خسرو مالک رقاب ‏ ‏ ‏ چوں لوا با فتح خاقان دکن آراستم

مؤلف ریاض الشعرا، اور نشتر عشق کے قول کے مطابق غروری نے ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

کلمات الشعرا کے میر برہان عروس، غروری اور عزلت ایک ہیں جو ہندوستان آئے تھے اس لئے کہ حسب ذیل شعر جو اس تذکرہ میں دو جگہوں پر عروس اور غروری کی طرف منسوب ہے، وہی ہے جو مخزن میں ہندوستان آنے والے غروری کاشی کے نام سے نقل کیا گیا ہے،

بہر تزئین دل ز تن میخواستم کلہائے داغ ‏ ‏ ‏ صد چمن برہم زدم تا یک قفس آراستم

ناظم تبریزی نے بھی انھی غروری کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان آئے تھے، اس لئے کہ حسب ذیل شعر جو تذکرۂ نظم گزیدہ میں ہے وہی ہے جو تذکرۂ اشرف علی میں ہے جس میں تصریح ہے کہ

---

[1] ۹۶۴ - ۱۰۳۶ ہجری/۱۵۵۶ - ۱۶۲۷ عیسوی

[2] ۱۰۱۴ - ۱۰۳۷ ہجری / ۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ عیسوی۔

وہ ہندوستان آئے تھے۔

گر نیافتہ باز نظارۂ رویش　　کہ سوے دیدۂ نگہ شرمساری می آید

ناظم تبریزی نے اُن کو "سید با ادراک"[1] بتایا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ اُن کے اشعار مشہور ہیں، مگر اُن کی نظمیں دقیق ہوتی ہیں"[2]

کابل میوزیم میں دیوان غوری کا ایک قلمی[3] نسخہ موجود ہے، اس میوزیم کی قلمی فہرست اور فرانسیسی زبان کی مطبوعہ فہرست میں جو اس قلمی فہرست پر مبنی ہے اس کو دیوان غوری شیرازی کہا گیا ہے، اس قلمی فہرست میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس دیوان میں ایک قصیدہ شاہجہاں اور اورنگ زیب[4] کی مدح میں ہے،

بہرحال اتنا مسلّم ہے کہ اس دیوان والے غوری وہی ہیں جو ہندوستان آئے تھے، اور یہاں کے بادشاہوں کی مدح میں قصیدے کہے تھے، مگر ان غوری کو شیرازی کہنا صحیح نہیں ہے، اگرچہ وہ شیراز میں بھی رہے تھے، بہتر بھی یہ ہے کہ ان کو کاشی ہی کہا جائے، دوسرا ثبوت اس شاعر کے شیرازی نہ ہونے کا یہ ہے کہ خود اس دیوان میں کہیں بھی شیراز کا ذکر نہیں ملتا، اُس کے مقابلہ میں کاشان کی بار بار مدح کی گئی ہے،

بلبلم دشمن جاں گشتہ دو ہقاں بخواہ　　بس کہ سرجا صفت گلشن کاشاں کردم

زیں بس زصوت بلبل کاشاں بیان خوش است　　تا کے حدیث طوطی ہندوستاں کنی

دیوان غوری کا یہ نسخہ بالکل ناقص اور خراب حالت میں ہے، مگر بہت نادر ہے، اس لئے کہ اب تک اس کے کسی دوسرے نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا،

اس ناقص دیوان میں بہت سی غزلیں ہیں، جو ردیف الف کے اس شعر سے شروع

---

[1] ص ۱۰۹ [2] ایضاً [3] نمبر ۲۲۹ [4] ۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ ہجری / ۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ عیسوی،

ہوتی ہیں :-

دیدہ بکینہ دلم بستہ کہ عجب مدار   طفل مریض اگر شود دشمن جان حکیم را

دیوان کے مطالعہ سے غوری کی شخصیت کے کچھ نئے گوشے سامنے آتے ہیں، جن کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا ہے، غوری کو بھی دوسرے شعرا کی طرح اپنے ہنر پر فخر ہے :-

آنجا کہ غوری شود از انشا غزل‌خواں   گر مست ترنم نشوی مست سخن باش

تسخیر جہاں دارد غوری تہ رقم   مسند فطرت بقدر دسترس آراستم

وہ اپنی بے طالعی کے شاکی نظر آتے ہیں :

از دوست چساں شکوہ تواں کرد غوری   بے طالعی اہل ہنر رسم قدیم است

طعنہ سرگشتگی از غیر نتوانم کشید   ہنگہ غربت را بصد زیب وطن آراستم

انھوں نے حافظ کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کا خیال ہے کہ حافظ کا تتبع نہیں ہو سکتا،

مکن تتبع حافظ غوری از کہ کسی   بجز آں بروکہ رموز سخنوری داند

حافظ کے کلام کے علاوہ وہ گلشن راز جیسی مثنوی سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں :-

کمال شیخ از غوری مپرس   کہ موبموئی نیش شرح گلشن راز است

آید برقص روح غوری بزیر خاک   ہر جا حدیث گلشن تبریزی می کند

غوری نے غزلوں میں مرزا عبدالشکور اور عبدالحسین نامی اشخاص کی تعریف کی ہے، غوری کے اشعار زیادہ تر متوسط درجہ کے ہیں، نمونۃً کچھ منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں :

از داغ سوختم دل حسرت نصیب را   آراستم ز گل قفس عندلیب را

قبلہ نا زفریبان جہاں یوسف بود   او ہم از طور تو آئین زلیخا برداشت

واز ندبے سبب بغروری یہ طعنہا، جمعی کہ غارت چمن ہوش کردہ اند
ایں شفق نیست کہ آرائش گردوں شدہ است[۱] قدسیاں بہر شہیداں کفنے ساختہ اند
از دل سخت بتاں شکوہ مکن سخن از دیدۂ نسناکی زن
از رفو لذت اگر می طلبی، سینہ بر خنجر بیباکی زن

ان ناقص غزلوں کے بعد کچھ قطعات ہیں، جن میں آصف[۱] (غیاث ملت و دین) خان جہاں[۲] مرزا باقی[۳] کی مدح کی گئی ہے، اور ابوالوفا نامی ایک شخص کی جسکو غالباً ایک باعی میں مولوی لکھکر یاد کیا گیا ہے، ہجو کی گئی ہے،
قطعوں کے بعد ایک مختصر سی مثنوی ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے،

باز طبعم شرر فشاں شدہ است شعلۂ کلک مرا زباں شدہ است

اس میں بھی کسی اسد نامی شاعر کی مذمت کی گئی ہے،

اس مثنوی کے بعد پھر کچھ قطعات ہیں، ان میں شاہ نجو، آصف خان، ابوالقاسم، میر سعد الدین ابراہیم اور ایک خرگوش کی موت اور ایک عمارت، ایک گھر شاہی حمام کسی خان کی بنائی ہوئی مسجد کی تاریخیں اور بعض لوگوں کی ہجویں ہیں، افسوس خیال میں ہے کہ غروری مرشد بروجردی[۱] کے دوست تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انکے تعلقات خراب ہو گئے تھے اور ہجو کی نوبت آگئی تھی، اس ہجو کے کچھ اشعار دیوان میں موجود ہیں،
اس کے بعد باعیات ہیں جو اور اصناف سخن کی طرح ناقص ہیں، ایک باعی نمونۃً پیش کی جاتی ہے،

ایں روح مقدس بوجودت سرگرم کونین ز شرم نکہت در از رم
خورشید صفت گرم در آئینہ مبیں، آئینہ مبادا کہ شود آب از شرم

ایک رُباعی میں شاعر نے اپنا تخلص برہان بتایا ہے، :- "برہان تو زوسواس ہوس"
ایک رُباعی میں قاضی مسعود کی تمجید کی گئی ہے، اس کے بعد قصائد ہیں یہ حصہ بھی ناقص ہے، ان قصائد میں شاہجہاں اورنگ زیب جمال الدین شاہ نجو اور پیغمبر کی مدح کی گئی ہے،

---

[۱] بروجردی یا بروجردی متوفی ۱۰۳۵ھ/۲۱-۱۶۲۰ء

آخر میں ایک ترجیع بند ہے جس کا یہ شعر ہر بند کے بعد دہرایا گیا ہے،

بنشینم و بے تو چند باشم ہم آتش و ہم سپند باشم

قصائد کے آخر میں بھی کچھ غزلوں کے اوراق آگئے ہیں :-

فہرست مآخذ ۱- قدرت اللہ شوق: تکملۃ الشعراء نسخہ خطی شمارہ ۲۴۱۴۳ کتبخانہ رامپور (۲) مرزا محمد علی کاتب: تذکرہ کاتب، نسخہ خطی شمارہ ۲۴۲۵، رضا لائبریری رامپور (۳) احمد علی ہاشمی: مخزن الغرائب نسخہ خطی شمارہ ۱۳۷، خدا بخش لائبریری (۴) مرزا محمد طاہر نصیرآبادی: تذکرہ نصرآبادی چاپخانہ ارمغان تہران (۵) محمد افضل سرخوش: کلمات الشعرا دین محمد پریس لاہور، (۶) میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور (۷) میر علاؤالدین اشرف علی خان: تذکرۃ الشعرا نسخہ خطی، شمارہ ۲۴۵۹، کتابخانۂ رامپور (۸) سیف الدین محمد فائز خیال نسخہ خطی شمارہ ۹۲۵/۲۵ علی گڑھ یونیورسٹی (۹) کشن چند اخلاص: ہمیشہ بہار نسخہ خطی شمارہ ۱۶۸۹ خدا بخش لائبریری، (۱۰) تذکرۃ الشعرا نسخہ خطی شمارہ ۲۴۵۶، رامپور، (۱۱) ناظم تبریزی: نظم گزیدہ نسخہ خطی، شمارہ ۹۲۵ علی گڑھ یونیورسٹی (۱۲) سید علی حسن خاں: صبح گلشن، مطبع شاہجہانی، بھوپال، (۱۳) علی قلی خاں والہ داغستانی: ریاض الشعرا نسخہ خطی، شمارہ ۴۵۰۳۷ نیشنل میوزیم، نئی دہلی، (۱۴) حسین قلی خاں عظیم آبادی: نشتر عشق، نسخہ خطی شمارہ ۲۰۱۲ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، (۱۵) ملا عبدالنبی فخرالزمانی: تذکرۂ میخانہ باہتمام احمد گلچین معانی، ۱۳۴۵ شرکت نسبی حاج محمد حسین، و شرکار اقبال، (۱۶) ملا عبدالنبی فخرالزمانی، تذکرۂ میخانہ، محمد شفیع، کیپو آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور،

(۱۷) S. De laugier De Beaurecueil: Manuscript D Afghanistan Le Caire, 1964

مطبوعات جدیدہ

سلوک سلیمانی

مرتبہ مولانا محمد اشرف خاں صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۸، مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، قیمت للعہ پیسے، مکتبہ سرمدی۔ ۷۔۴ اسلامیہ پارک سیکم نمبر چھ روڈ لاہور،

حضرت سید صاحبؒ کی شخصیت علم و عرفان اور شریعت و طریقت دونوں کی جامع تھی، عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے سلوک و عرفان میں بھی امتیازی درجہ حاصل کر لیا تھا، اور اس راہ میں بھی ان سے بڑا فیض پہنچا، ان کے مسترشدین میں مولانا محمد اشرف خاں صاحب صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، انھوں نے معارف کے سلیمان نمبر کیلئے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا، جو طوالت کی وجہ سے خاص نمبر کے بجائے بعد میں بالاقساط شائع ہوا تھا، اب انھوں نے افادۂ عام کے خیال سے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، سید صاحب کے سلوک پر لائق مرتب نے ایک اور ضخیم کتاب بھی لکھی ہے، جو آیندہ شائع ہوگی، زیر نظر کتاب میں انھوں نے سید صاحب کے عارفانہ اشعار، ملفوظات، تربیتی مکتوبات اور متعدد دوسری تحریروں سے ان کے نظریۂ سلوک و عرفان کی وضاحت کی ہے، کتاب کے ابتدائی نصف حصہ میں سلوک و تصوف کے متعلق سید صاحب کا نقطۂ نظر اور آخری حصہ میں اس کی اہم خصوصیات و کیفیات اور واردات وغیرہ کی حقیقت و اہمیت تحریر کی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب سلوک سلیمانی بلکہ سلوک اشرفی کا ایک جامع

خاکہ اور سلوک و عرفان کی اصل حقیقت کا مرقع ہے، فاضل مرتب نے مقدمہ میں سید صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کے جلووں اور مختلف النوع کمالات کے دلکش پہلوؤں کے ذکر کے سلسلہ میں ان کی سلوک و تصوف سے ابتدائی دلچسپی اور ان کی زندگی میں اس کے تدریجی ارتقاء کا بھی ذکر کیا ہے، سید صاحب کے علوم ظاہری میں کمالات کے مقابلہ میں ان کی باطنی و روحانی زندگی کے گوشے نمایاں نہ تھے، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے، اور اس سے انکے روحانی و باطنی زندگی کے کمالات کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے، طرز تحریر دلکش ہے، غلام محمد صاحب نے معارف کے سلیمان نمبر کے متعلق غلطی سے لکھا ہے کہ یہ ستمبر ۵۴ءمیں شائع ہوا تھا، یہ صحیح نہیں ہے، یہ نمبر مئی ۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

تعلیمی مقالات (۱) | مرتبہ مجلس تعلیمات پاکستان، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۹۴، قیمت ع۸/ر، پتہ مجلس تعلیمات پاکستان ۵۰ علامہ اقبال روڈ (شبلی کالج) لاہور ۵

پاکستان کے ادارہ مجلس تعلیمات کا مقصد نظام تعلیم میں ایسی مفید تبدیلیاں عمل میں لانا ہے جو دین سے بے تعلقی اور دین و دنیا میں دوئی کے رجحان کو ختم کر کے طلبہ و اساتذہ کو اسلامی افکار و اقدار کا حامل بنا سکیں، اس ادارہ کی ماہانہ نشستوں میں مختلف علمی و تعلیمی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے ہیں، یہ مجموعہ ان نشستوں کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین غور و فکر سے لکھے گئے اور بصیرت افروز ہیں، اور ان میں مختلف علمی و تعلیمی مسائل پر بحث، مفید خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جن سے معاشرہ و افراد کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کی اہمیت، اسکو زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے کی تدبیریں اور درس و تدریس کے بارہ میں مفید رہنمائی ملتی ہے، ایک مضمون میں مسلمانوں کی ریاضی میں خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، "کیا درس نظامی محض ایک دینی نصاب ہے (حافظ نذر احمد) اور "جدت اور تعلیم" (سید علی شبر کاظمی) خصوصیت سے مفید اور دلچسپ مضامین ہیں، یہ مجموعہ خصوصیت سے تعلیم و تدریس سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، "ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: ؏	۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ
اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " ؏	۱۰- سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیر طبع)
اسوۂ صحابیات: " عہ	۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ؏
تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: عہ	۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)
حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندان فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: عہ	۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ؏
حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ؏	
شعر الہند (حصہ اول) " عہ	
شعر الہند (حصہ دوم) " للعہ	

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی، تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دار المصنفین کے پیش نظر ہے۔ یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۴۴۶ قیمت: عہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی کل زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ اوطان سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ دینِ اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت: - ۳۳۰ صفحے، قیمت: - ۵/ روپے

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) دسمبر ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

جلد ۱۰۶ - ماہ شوال المکرم ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۰ء - عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

مشرقی پاکستان پر جو قیامت صغریٰ ٹوٹی ہے، اسکی تفصیلات اسقدر دردانگیز ہیں کہ انکے تصور سے روح لرز اٹھتی ہے، اور گذشتہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کی تاریخ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اس حادثہ نے عبرت و بصیرت کے دفتر کھول دیے ہیں، اس سے سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود آج کا انسان بھی قدرت کی قہرمانی قوتوں کے سامنے اتنا ہی بے بس ہے جتنا پہلے زمانہ کا انسان تھا، اس تباہی کی دردانگیزی کا اظہار قلم سے نہیں کیا جاسکتا، اسکی تلافی مدتوں میں ہوسکے گی، اللہ تعالیٰ اس مصیبت عظمیٰ میں پاکستان کی مدد فرمائے، اس حادثہ پر پوری دنیا خصوصاً امریکہ اور یورپ کے ملکوں نے جو عملی ہمدردی کی ہے وہ اسکا ثبوت ہے کہ انکی مادہ پرستی کے باوجود ان کے دلوں سے انسانیت کا چراغ گل نہیں ہوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انکی مادہ پرستی سے قطع نظر ان میں بہت سے قابل تقلید اخلاقی اوصاف ہیں جن کی بدولت وہ زندہ ہیں، ہم کو ان اوصاف میں ان کی تقلید کی توفیق نہیں ہوتی ہے، ہم نقل بھی کرتے ہیں تو انکی برائیوں کی، اسلیے ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم ہیں جو انکو حاصل ہیں، اس موقع پر ہر قسم کے اختلافات کے باوجود حکومت ہند نے جس انسانی شرافت و ہمدردی کا نمونہ پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ خود پاکستانیوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، وہاں ان حالات میں بھی حصول اقتدار کی کشمکش جاری رہی اور مشرقی پاکستان کی سیاسی پارٹیوں نے اس سے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور انکی زبانوں پر وہی شورش انگیز نعرے جاری رہے، ان سطور کی تحریر کے وقت پارلیمنٹ کا الیکشن ختم ہوچکا ہے اور اسکے نتائج کا بھی اعلان ہوگیا ہے، اس کے دوررس نتائج کے متعلق ابھی سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن اتنا تو ظاہر ہوگیا کہ پاکستان اپنے اصل مقصد سے دور ہٹ گیا ہے، ڈکٹیٹرشپ کی مدت اب ختم ہوگئی جس کو ختم ہی ہونا چاہیے تھا اور جلد ہی جمہوری حکومت قائم ہوگی، لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جمہوریت کی ساری خوبیوں کے باوجود ہر ملک کیلیے ایک ہی قسم کی جمہوریت موزوں نہیں ہوتی، برطانوی [illegible] جمہوریت پورے ایشیا میں ناکام ہوچکی ہے، صرف ہندوستان

پارلیمنٹری سسٹم چل رہی ہے، لیکن اسکے نتائج اور ملک کا انتشار دیکھکر اب بہت سے ہندوستانی مفکرین اسکو ملک کے لیے مفید نہیں سمجھتے، اسلیے پاکستان کو ان ملکوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، اور ایسا دستور بنانا چاہیے جس میں جمہوریت کے ساتھ ملک کی سالمیت اور طوائف الملوکی کے انسداد کا پورا لحاظ ہو اور وہ پاکستان کے دونوں حصوں کیلئے قابل قبول ہو۔

یورپ میں چھوٹے چھوٹے ملک ہیں، انکی آبادی سو فیصدی تعلیم یافتہ ہے، ان میں پورا سیاسی شعور اور نسلی و لسانی اور تہذیبی وحدت و یکرنگی ہے اور انکی جمہوریت بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد اس منزل پر پہنچی ہے، اسکے باوجود مختلف ملکوں میں انکے حالات کے لحاظ سے جمہوریت کی شکل مختلف ہے، پاکستان کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہے، اسلیے اسکے لیے برطانوی طرز کی جمہوریت کسی حیثیت سے بھی موزوں نہیں ہے، ان میں وحدت کا سب سے قوی رشتہ مذہب ہے جس کو انھوں نے پس پشت ڈالدیا ہے، اسلیے اب صرف ملک کا مفاد وحدت کا رشتہ رہ گیا ہے، اگر اس پر بھی نسلی، صوبائی اور لسانی عصبیت غالب آگئی تو پھر کوئی طاقت پاکستان کو انتشار سے نہیں بچا سکتی، اس لیے اگر پاکستان کو ملک ان عصبیتوں سے زیادہ عزیز ہے تو دستور بنانے میں اسکا پورا لحاظ رکھنا چاہیے، اسوقت پاکستان کیلیے بڑا نازک مرحلہ آگیا ہے، اس میں اس کے تدبر کا امتحان ہے، دیکھنا ہے کہ اس میں وہ کہانتک کامیاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس امتحان میں اس کی مدد فرمائے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس دار المصنفین نے ۴۰ ممتاز اہل سنت کے دستخطوں سے شیعہ سنی اتحاد کیلیے جو اپیل شائع کی تھی، ستر کا مقام ہے کہ شیعوں کی طرف سے اسکا پرجوش خیر مقدم کیا گیا، سرفراز اخبار نے اس اپیل کو شائع کیا اور اسکی پرزور تائید کی، سید کلب عباس صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے نہ صرف اسکی پوری تائید کی بلکہ اس کیلئے کچھ مفید تجویزیں بھی پیش کیں، اور ۴۰ شیعہ اکابر کے دستخطوں سے ایک اپیل شائع کی، اسی طرح کی ایک اپیل مولانا مجتبیٰ حسن صاحب مجتہد کامون پوری نے مسلم یونیورسٹی اور دوسرے مقامات کے ممتاز شیعوں کیجانب سے شائع کی، اس کے علاوہ بہت سے شیعوں نے اخبارات میں اسکی تائید کی، یہ اسکا ثبوت ہے کہ یہ اپیل وقت کی پکار ہے اور شیعہ سنی دونوں کا سنجیدہ اور سمجھدار طبقہ ان کے اتحاد کیلئے بے چین ہے، باقی کسی مسئلہ پر خواہ وہ کتنا ہی مفید ہو، سو فیصد اتفاق ہونا مشکل ہے، کچھ نہ کچھ اصحاب غرض اسکے مخالف نکل ہی آتے ہیں لیکن اگر سنجیدہ طبقہ متفق و مستعد ہے تو مخالفت کی آوازیں

کچھ دنوں میں خود بخود دب جاتی ہیں، اس لیے انشاء اللہ اس کار خیر میں دیر سویر ضرور کامیابی ہوگی۔

حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی جن کا قدم ہر اچھے کام میں آگے رہتا ہے کئی سال ہوئے اسلامیات کی تحقیقات کے لیے "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، ابتک یہ ادارہ کرایہ کی عمارت میں تھا، جو اسکی ضروریات کے لیے ناکافی تھی، اب ان کو تغلق آباد میں حکومت سے مناسب قیمت پر تیس ایکڑ زمین مل گئی ہے اور عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی ہے، حکیم صاحب نے اس کے لیے پندرہ لاکھ کی قیمتی جائداد وقف کرکے اس کا ٹرسٹ قائم کر دیا ہے، اس ادارہ کے کاموں کا خاکہ اتنا وسیع ہے کہ اگر اسکے مطابق کام انجام پاجائیں تو یہ ادارہ بین الاقوامی شہرت حاصل کرلے گا، مگر اس قسم کی کوششوں کے نتائج برسوں میں نکلتے ہیں، اسلیے اس ادارہ سے بھی اسی کی توقع رکھنی چاہیے، اگر خاکہ میں درج شدہ کاموں کا ایک حصہ بھی پورا ہو جائے تو یہ بھی بڑا کام ہوگا، ہم اپنے معاصر اور ہم مشرب ادارہ کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔

اس وقت ہندوستان کے اردو رسالوں میں سب سے سستا معارف ہے، اس مواد سے قطع نظر جو وہ پیش کرتا ہے ضخامت کے لحاظ سے بھی ۸۰ صفحوں کا ہوتا ہے اور اس سے کم صفحات کے رسالوں کی قیمت بھی دس روپیے سالانہ سے کم نہیں ہے، کاغذ کتابت، طباعت وغیرہ کے سامانوں کی روزافزوں گرانی تھی ہی، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ پاکستان نے اپنے یہاں ہندوستان کے ہر قسم کے لٹریچر کی بندش کردی، اب یہاں سے ایک مطبوعہ پرزہ بھی پاکستان نہیں جا سکتا، اس لیے ان تمام رسالوں کی جو پاکستان جاتے تھے، آمدنی اتنی گھٹ گئی ہے کہ ان کا قائم رہنا دشوار ہو رہا ہے، ان مجبوریوں کی بنا پر آیندہ جنوری سے معارف کی قیمت آٹھ کے بجائے دس روپیے سالانہ کر دی گئی ہے، امید ہے کہ معارف کے قدردانوں پر یہ اضافہ گراں نہ گذرے گا، اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان والے یوں زبانی تو اردو کے لیے بہت شور مچاتے ہیں، لیکن اس کو زندہ رکھنے کی جو صورتیں ہیں، ان کو اختیار نہیں کرتے، معارف دار المصنفین کا ترجمان ہے، اس لیے اس کو بہرحال قائم رکھنا ہے، ورنہ وہ اپنی آمدنی سے نہیں چل سکتا، اردو والوں کے دامن پر یہ بدنما داغ ہے۔

مقالات

بانی درسِ نظامی مُلّا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از

جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری، استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۴)

استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴-۹۳ء میں جب کہ ان کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی، سہالی سے ترک وطن کرکے لکھنؤ کی "حویلی فرنگی" میں والدہ، دادی، دو بھاوجوں، دو بھتیجوں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ مقیم ہوئے، اور نئے وطن میں مستقل بود وباش کے تمام مراحل طے ہو جانے کے بعد ملا صاحب تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلے، تذکرہ نویسوں کے تخمینے کے مطابق ۲۵ سال کی عمر میں اور بعض قوی قرائن کے پیش نظر کیس یا بائیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوکر ۱۱۱۲-۱۳ھ یا ۱۷۰۱-۲ء میں واپس فرنگی محل اپنی نئی رہائش گاہ آکر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، ملا صاحب کی شادی کس عمر میں ہوئی؟ اس کی تفصیل جاننے کا اب کوئی ذریعہ ہماری دسترس میں نہیں ہے، صرف اتنا معلوم ہے کہ ملا صاحب کی شادی اپنے آبائی وطن قصبہ سہالی میں چودھری محمد آصف کی بیٹی سے ہوئی تھی، چودھری محمد آصف ملا نظام الدین محمد کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید پر دشمنوں کے حملے کی خبر سن کر نو آدمیوں کے ساتھ امداد

کو پہنچے تھے، اور مدرسہ ملا قطب الدین شہید کے سامنے ہی حملہ آوروں کی مدافعت کرتے ہوئے اپنے ہمراہیوں سمیت شہید ہو گئے تھے، (۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ ۱۶۹۱ء)

ان اہلیہ سے ملا نظام الدین کے ایک اولاد ہوئی، جو صغر سنی ہی میں انتقال کر گئی) اغصان اربعہ) ملا صاحب کے [illegible] عبدالحی (بن [illegible] سعید) ملا عبدالعزیز (بن ملا محمد سعید) ملا غلام محمد مصطفیٰ (بن ملا محمد اسعد) ملا عبدالحی (بن ملا محمد رضا) اور ملا احمد حسین (بن ملا محمد رضا) ہی ملا صاحب کی اولاد تھے آخر الذکر بھتیجے ملا احمد حسین کو جو سب بھتیجوں میں چھوٹے تھے ملا صاحب نے متبنیٰ کر لیا تھا،

مولانا عارف (ملا نظام الدین محمد)	مولانا عارف مولوی احمد حسین مرحوم
نے مولوی احمد حسین مرحومؒ (ابن ملا	متبنیٰ کردہ بود،
محمد رضا) کو متبنیٰ کیا تھا،	(رسالہ قطبیہ قلمی)

اور یہ سب بھتیجے ملا صاحب کے سامنے ہی صاحب اولاد بھی ہو چکے تھے، وہ کنبہ جس کی سربراہی

---

۵۱ یہاں ضمناً یہ ذکر ضروری ہے کہ ملا احمد حسین کی وفات کی تاریخ اور زمانہ ابھی تک کہیں نظر سے نہیں گذرا تھا، رسالہ قطبیہ کے مصنف مولانا عبدالاعلیٰ کے ملا احمد حسین کو "مرحوم" لکھنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ زمانۂ تصنیف رسالہ قطبیہ میں وہ انتقال کر چکے تھے، رسالہ قطبیہ کی تصنیف سنہ ۱۲۰۰ھ میں ہوئی، جیسا کہ ملا عبدالاعلیٰ (مصنف) نے وضاحت سے لکھا ہے:-

"قد فرغت من تسوید هذه الرسالة المتبرکة الموسومة بالقطبیة فی بیان احوال الفرق النظامیة عاشر محرم الحرام سنة الف و مائتین ۱۲۰۰ من هجرة النبی الاکرمؐ"

(اس رسالہ کی تالیف سے جس کا نام القطبیۃ فی بیان احوال الفرق النظامیہ ہے دسویں محرم سنہ ۱۲۰۰ھ میں فرصت پائی)

"ملا نظام الدین پیسود سال کی عمر میں آ پہنچی تھی، ان کی نگاہوں کے سامنے پھل پھول رہا تھا، لیکن ملا صاحب کے مخلصین کے دلوں میں یہ تمنا ضرور مچل رہی تھی کہ ملا صاحب سے صلبی سلسلہ بھی اسی طرح جاری ہو، جس طرح علمی فرزندوں سے ان کا علمی سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے، بلکہ خود ملا صاحب بھی بشری تقاضے کے تحت اپنی بے اولادی سے ملول رہتے تھے"۔

ازیں جہت بمقتضائے بشریت رنجیدہ
خاطر می ماند، و از برادرزادہ خود ملا
احمد عبدالحق قدس سرہٗ اکثر می فرمود
کہ باوجود یکہ اولاد برادران و فرزندان
شان فرزندان من اند، لاکن دل ہمیں
می خواہد کہ یکے از زادان
خودم باشد،
اوشاں عرض کردند کہ اگر از زوجۂ
اولیٰ فرزند متولد نمی شود زوجۂ دیگر
باید کرد شاید حق تعالیٰ او را عطا
فرماید،
فرمود عالم الغیب خدائے تعالیٰ ست بر من در
عالم رؤیا ہیچ منکشف نگشتہ ازیں جہت
جرأت بایں امر نمی توانم و خود
را مورد و ملکۂ فساد نمی گردانم تا وقتیکہ

بشری تقاضے کے تحت رنجیدہ اور
ملول رہتے تھے، اور اپنے بھتیجے ملا احمد
عبدالحق قدس سرہ سے اکثر فرمایا کرتے
تھے کہ بھائیوں کی اولاد اور ان کی
اولاد کے بچے میرے ہی بچے ہیں، پھر
بھی یہ دل چاہتا ہے، کہ ایک اولاد
میری بھی ہو،
بھتیجے (ملا احمد عبدالحق) نے عرض
کیا کہ ان بیوی سے اگر اولاد نہیں ہے تو
دوسرا عقد کر لیا جائے اللہ چاہے گا
تو اس سے فرزند عطا فرمائے گا۔
ملا صاحب نے جواب میں فرمایا
کہ غیب کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی
جاننے والا ہے، اس سلسلے میں عالم
رویا میں مجھے کوئی اشارہ نہیں ملا ہے

كدام بزرگے كه برو اعتقاد من باشد
ازيں معنی خبر نخواهد داد و ارتكاب
ايں امر نخواهم كرد،

تا حضرت سيد مير محمد اسماعيل بلگرامی
قدس سره برموز باطن مولانا مطلع
گشته واز درگاه الٰہی ملہم گشت كه از
زوجهٔ دیگر فرزندان بوے میسر
خواهند گشت، سيد صاحب ازيں
معنی مولانا را خبر داد و تا در اواخر
عمر موكد شد، و كتخدا گشت در
قصبه سترکه نکاح دیگر کرد و حق
تعالیٰ از بطن ایں زوجه یک پسر عطا
فرمود که او را به عبدالعلی محمد موسوم گردانيد
و يک صبيه متولد شد،

(اغصان اربعه)

اس لئے میں اس معاملے (عقد ثانی)
میں اقدام نہیں کر سکتا، اور خود کو
جھگڑے فساد کا نشانہ نہیں بنا
سکتا، جب تک کوئی ایسا بزرگ
جس پر مجھے اعتقاد ہو، اس سلسلے
میں کوئی (الہامی) خبر نہ دے گا
میں عقد ثانی کرنے کا ارتکاب کروں گا
یہاں تک کہ حضرت میر محمد اسمٰعیل
بلگرامی قدس سرہ، ملا صاحب کے
مکنون خاطر سے باخبر ہوئے، اور درگاہ
الٰہی سے ان کو الہام ہوا کہ ملا صاحب
کی دوسری شادی سے اولاد ہوگی،
یہ الہامی اشارہ حضرت میر سید اسمٰعیل
بلگرامی نے ملا صاحب سے کہلوا دیا،
پھر آخر عمر میں آمادہ ہوکر ملا صاحب
نے دوسرا نکاح قصبہ سترکھ میں کیا
ان دوسری بیوی سے اللہ تعالیٰ
نے ان کو ایک فرزند جن کا نام
عبدالعلی ہے اور ایک بیٹی عطا فرمائی،

اور یہ صاحبزادے جن کو دنیا بحر العلوم کے نام سے یاد کرتی ہے، اپنے نامور والد ماجد ہی کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے، ملا صاحب نے اس اکلوتے فرزند کو بڑے لاڈ پیار سے پالا، اور جب وہ چار سال چار مہینے کے ہوئے، تو اُن کی بسم اللہ کی تقریب بھی ملا صاحب نے کی، ایک قلمی تحریر کے مطابق جو ملا عبد اللہ امیٹھوی (شاگرد رشید ملا نظام الدین فرنگی محلی) کے پوتے کی لکھی ہے، اس تقریب کا مختصر حال یہ ہے:-

والدم (یعنی پسر کلاں ملا عبد اللہ
امیٹھوی موسوم بہ مولوی شاہ علاء اللہ
احمد قلندر قدس سرہ) بیان می فرمودند
کہ در زمانیکہ تقریب مکتب یعنی بسم اللہ
حضرت ملک العلماء مولانا عبد العلی
صاحب قدس سرہ، منعقد شد در آن
محفل اجلۂ علمائے نامدار و فضلائے
والا تبار و مشائخ کبار از آن جملہ
جناب حضرت قاضی محمد تقی صاحب
موہوی قدس سرہ، نیز موجود بودند
حسب تجویز و ایماء جملہ اصحاب محفل
حضرت قاضی محمد تقی صاحب قدس
سرہٗ بسم اللہ از زبان خود حضرت
مولانا عبد العلی صاحب قدس سرہٗ

میرے والد بیان فرماتے تھے کہ جب
ملک العلماء مولانا عبد العلی صاحب قدس
سرہٗ (بحر العلوم) کی بسم اللہ کی تقریب
منعقد ہوئی تو اس محفل میں بڑے بڑے
علمائے وقت فضلائے زمانہ اور مشائخ
کبار موجود تھے، ان ہی میں حضرت
قاضی محمد تقی صاحب موہوی قدس
سرہ بھی تشریف رکھتے تھے، تمام حاضرین
محفل کی تجویز اور خواہش پر حضرت
قاضی محمد تقی صاحب قدس سرہٗ نے
اپنی زبان سے مولانا عبد العلی صاحب
سے بسم اللہ کہلوائی، اس سے قاضی
محمد تقی صاحب قدس سرہٗ کی زبان
کی برکت کی تاثیر ملاحظہ کرنا چاہیے'

در تبحر انواع علوم و فضائل کمالات	کہ فرخندہ صفات حضرت مولانا عبدالعلی
صوری و معنوی فخر تمام علما بعلاد لیا	صاحب قدس سرہٗ کی ذات تمام علوم
کل ہندوستان شد،	میں کیسی تبحر اور ظاہری و باطنی کمالات
	و فضائل کی کیسی جامع گزری ہے کہ
	ہندوستان بھر کے تمام علما اور اولیا
	اللہ کے لئے باعث فخر ہے،

ملا صاحب کا دوسرا نکاح، جو شیخ محمد کریم بن شیخ محمد علیم بن ملا شاہ محمد ولی محمد عثمان چشتی سرکھی کی دختر سے ہوا، کب ہوا، اس کا تعین مشکل ہے، "دراواخر عمر" سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے اور بعض دوسرے قرائن سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۱۴۱ھ و ۱۱۴۳ھ کے قریب قریب ہوا ہوگا، اس لئے کہ ملا صاحب نے یہ عقد اپنے پیر بھائی اور صاحب فیض روحانی میر سید اسماعیل بلگرامیؒ (وفات ۱۱۶۴ھ) کے مکاشفے کے مطابق کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملا صاحب کے پیر و مرشد حضرت سید السادات سید شاہ عبدالرزاق بانسوی قدس سرہٗ اس وقت پردہ فرما چکے ہیں، (وفات ۱۱۳۶ھ) ورنہ ان ہی سے اس سلسلہ میں رجوع کرنا اولیٰ و انسب ہوتا، ان کے خلیفہ اور پیر بھائی کا بیچ نہ ہوتا، اس کے علاوہ صاحبزادہ ملا عبدالعلی بحرالعلوم کی عمر ملا صاحب کی وفات کے وقت اٹھارہ سال کی تھی، اور صاحبزادی کی تیرہ سال کی،

در عمر ہفدہ سالگی از تحصیل علوم	ملا عبدالعلی (بحرالعلوم) سترہ سال
ظاہری فراغت یافت و در ہماں	کی عمر میں تحصیل علوم ظاہری سے فارغ
سال مولانا والد در قصبہ کاکوری	ہوگئے، اور اسی سال ملا نظام الدین
کتخدا کرد و خود بعد شش ماہ در	نے بیٹے کا عقد قصبۂ کاکوری (ضلع)

ہمیں سال بعالم علوی پیوست دختر سیزدہ سالہ ناکتخدا گذاشتہ ،	لکھنؤ میں کر دیا ، بیٹے کے نکاح کے چھ ماہ بعد ملا نظام الدین نے سفر آخرت اختیار فرمایا ، اور ۱۳ سالہ ناکتخدا بیٹی چھوڑی ،

ملا صاحب کا سالِ وفات سنہ ۱۱۶۱ھ ہے ، اس وقت صاحبزادے (بحر العلوم) اٹھارہ سال کے تھے اس سے دو ہی ایک سال قبل ملا صاحب کا عقد ثانی ہونا چاہئے ، (سنہ ۱۱۴۰ھ یا سنہ ۱۱۴۱ھ میں) زیادہ سے زیادہ سنہ ۱۱۳۶ھ یعنی پیر و مرشد کے وصال کے ، سال کے بعد تک دوسرے نکاح کا زمانہ جا سکتا ہے ،

ملا صاحب کی صاحبزادی کا عقد سہالی میں ملا صاحب کے بھانجے شیخ حفیظ ابن شیخ سیف الدین کے ساتھ ہوا ، جو صاحبِ اولاد ہوئیں ، صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کی طرف ملا صاحب نے بذاتِ خود توجہ فرمائی ، اگرچہ ملا صاحب کے تلامذہ جن میں بھتیجے اور متبنّٰی بھی شامل تھے ، صاحب درس و تدریس ہو چکے تھے لیکن ملا صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کو خود ہی تعلیم دی ؛ اور ہمہ وقت اس کے متمنی رہے ، کہ ان کا اکلوتا بیٹا ، خلف الصدق ثابت ہو ، خود ہی بیٹے کو پڑھاتے بھی تھے ، اور ملاقات کے لئے آنے والے اللہ والوں سے بیٹے کے لئے دعا کے طلب گار بھی ہوا کرتے تھے ،

ملا ولی اللہ فرنگی محلی جنھوں نے فرزند ملا نظام الدین کا کافی زمانہ پایا تھا ، اپنی تصنیف عمدۃ الوسائل للنجاۃ میں جو ملا صاحب کے فرزند ملا عبد العلی بحر العلوم کی حیات میں لکھی گئی تھی ، لکھتے ہیں :-

اکثر معتبرین از زبان صاحبزادہ والا	اکثر لوگوں نے جو معتبر اور ثقہ ہیں صاحبزادہ

ملا عبد العلی سلمہ ربہ نقل کردہ اند کہ ایشاں
می گفتند مولانا علیہ الرحمۃ بہت محبت
کہ با من داشت ہمیشہ برائے من دعائے
علم کردے و با ہر کہ از اہل اللہ
ملاقی گشتے از وے درخواست دعائے
برائے من کردے، چنانکہ روزے مولانا
علیہ الرحمۃ بگوشۂ مسجد نشستہ مرا درس
می دادند، کہ دریں ہنگام دو جوان
خوب تر در مسجد در آمدند دیدہ مولانا
علیہ الرحمۃ سلام گذاردند یکے از آنہا
بجانب راست دوم، از آنہا بجانب
چپ بنشستند و مولانا علیہ الرحمۃ
بغایت تکریم و تعظیم شاں کرد، ہمہ
حیراں گشتیم کہ ایشاں کدام کسانند کہ
جناب مولانا علیہ الرحمۃ چنداں بہ تکریم
شاں کوشید، بعد ساعتے اشارہ بمن
کردہ پرسیدند ایں کیست مولانا علیہ الرحمۃ
فرمود، پسر من برائے ایں دعا کنید
حق تعالیٰ او را علم نافع و فہم کامل عطا

ملا نظام الدین، ملا عبد العلی سلمہ ربہ کی
زبانی مجھ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے،
کہ ملا عبد العلی فرماتے تھے کہ ملا صاحب
جیسی محبت مجھ سے فرماتے تھے، اس
کی بنا پر ہمیشہ میرے لئے حصول علم
کی دعا فرمایا کرتے تھے، اور اہل
اللہ میں سے جس سے بھی ملاقات
ہوتی، اس سے بھی میرے لئے دعا
کراتے تھے، ایک دفعہ ایسا ہوا
کہ ملا صاحب مسجد کے ایک کونے میں
بیٹھے مجھے پڑھا رہے تھے، ناگاہ دو
خوبصورت جوان مسجد میں داخل ہوئے
اور ملا صاحب کو سلام کیا، ان میں
سے ایک ملا صاحب کی داہنی طرف
اور دوسرا بائیں طرف بیٹھ گیا، ملا
صاحب نے ان دونوں کی بے حد تعظیم
کی، ہم حیران تھے کہ آخر یہ کون
لوگ ہیں، جن کی اس قدر تعظیم ملا صاحب
کر رہے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد ان

فرماید، باہم بعجب نگریستند، وگفتند شما خود دعا درآید بر آنکہ اگر خواہید بفضلِ الٰہی ہمیں وقت تمامی علوم وے حاصل کردند، گفت آرے ممکن ست، از لطفِ الٰہی، لاکن مقصودِ من حصولِ علم بدیں طور نیست می خواہم کہ نورِ دیدۂ من بکسب واکتساب میسر شوند، ایں بگفت ودست بدعا برداشت وآں ہر دو کسان شریک دعا بودند ہرگاہ از دعا فارغ شد آنہا از نظر غائب شدند عجب بر عجب مرا افزود، پرسیدم کہ ایں ہاکدام کس بودند فرمودند از جملۂ اولیائے کرام درفلاں جزیرہ مشغول بحق داشتند،

نوواردوں نے میری طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کون صاحبزادے ہیں؟ ملا صاحب نے فرمایا میرا بیٹا ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسے علم نافع اور فہم کامل عطا فرمائے ان نوواردوں نے باہم ایک دوسرے کو پہلے تو تعجب سے دیکھا پھر بولے آپ کو خود یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو ابھی تمام علوم بفضل الٰہی صاحبزادے کو حاصل ہوجائیں، ملا صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے بے شک یہ بھی ہوسکتا ہے لیکن میرا مطلب اس طرح حصول علم سے نہیں ہے، یہ چاہتا ہوں کہ میرے نور نظر کو پڑھ کر اور کسب کے ذریعہ علم نصیب ہو، اتنا فرمانے کے بعد مُلا صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ان دونوں نوواردوں نے بھی دعا میں شرکت وامانت کی، جوں ہی مُلا صاحب دعا سے فارغ ہوگئے، یہ دونوں آنے والے

ہماری نظروں سے غائب ہوگئے،
مجھے حیرت پر حیرت ہوئی، بالآخر میں
نے ملا صاحب سے دریافت کیا، کہ
یہ کون لوگ تھے، ؟ فرمایا اولیائے
کبار میں سے تھے، فلاں جزیرے میں
یادِ الٰہی میں بسر کرتے ہیں،

ملا عبدالعلی (بحرالعلوم) نے اپنے والد ماجد ہی سے تعلیم پائی، اور فارغ التحصیل ہوگئے، اس وقت اُن کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی، اکلوتے بیٹے تھے، فارغ التحصیل ہونے کے باوجود درس وتدریس کی طرف توجہ نہیں کی، والد ماجد نے اس کے بعد شادی بھی کردی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے بعد بھی ملا عبدالعلی نے خاندان کی ذمہ داریوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی، اُن کی شادی کے چھ ماہ بعد ہی ملا صاحب کا انتقال ہوگیا، اب گھر کی ساری ذمہ داری، اُن ہی پر آپڑی، پھر بھی والد ماجد کی قائم مقامی کی طرف اُن کا دھیان نہیں گیا، دھیان کب گیا جب تابڑ توڑ دو واقعے پیش آئے، ایک واقعہ تو شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر جلسہ دستاربندی کے موقع پر پیش آیا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، دوسرا واقعہ جو اس سے قبل کا معلوم ہوتا ہے روایتاً ہم تک پہونچا ہے، وہ یہ کہ ملا صاحب کے وصال کے بعد ایک فقیر صدا لگاتا ہوا دروازے پر آیا، گھر سے ماما نے نکل کر اس کو کچھ دینا چاہا، فقیر نے نہیں لیا اور ملا صاحب سے ملنے کی خواہش کی، ماما نے جواب دیا کہ ملا صاحب پردہ فرما چکے ہیں، فقیر نے کہا اُن ملا صاحب سے نہیں اُن کے بیٹے ملا صاحب کو میں کہہ رہا ہوں، ماما نے اندر آکر ملا عبدالعلی سے کہا کہ باہر کوئی آپ کو پوچھ رہا ہے، نوجوان ملا عبدالعلی چھت پر کبوتر اُڑا رہے

تھے، اسی حالت میں باہر آگئے، ایک کبوتر بھی ہاتھ میں تھا، فقیر نے کہا آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ کبوتر اڑائیں، ملا عبدالعلی نے ہاتھ سے کبوتر اڑا دیا، یہ واقعہ مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی (خلید ملا عبدالعلی بحرالعلوم) نے بیان کیا۔

غالباً اس واقعہ کے بعد ٹیلے والا واقعہ ہوا کہ جلسۂ دستاربندی میں بٹیروں کی کابک ہاتھ میں لئے ملا عبدالعلی جلسہ گاہ پہونچے اور مجمع نے جب اندر جانے میں مزاحمت کی، تو انھوں نے بتایا کہ میں ملا نظام الدین استاذ الہند کا بیٹا ہوں، کسی نے جواب دیا کہ اُستاذ الہند کے بیٹے ہوتے تو اُن کی جگہ صدر میں بیٹھے ہوتے یا اس طرح یہاں دھکے کھاتے ہوتے، جملہ پوری طرح کارگر ثابت ہوا، اور ملا عبدالعلی کبوترا و ربٹیر کے مشغلوں سے تائب ہوکر والد ماجد کے مزار مبارک پر جاکر خوب روئے، اور علم کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے، والد ماجد کے نامور تلمیذ ملا کمال الدین سہالوی سے بھی رجوع کرتے رہے، جس کے نتیجہ میں فرنگی محل میں والد ماجد کے اجلۂ تلامذہ کے غلغلۂ درس و تدریس کے باوجود مرجع انام ہوگئے، یہاں تک کہ جب ایک ناگوار واقعہ پیش آیا تو حکومت وقت کے مقابلے میں ملا عبدالعلی بحرالعلوم کے گرد اتنی جمعیت اکٹھا ہوگئی تھی کہ حکومت وقت کو مزید کارروائی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہونا پڑا،

واقعہ اگرچہ ملا فہمی کا نتیجہ تھا لیکن اُس نے چشم زدن میں شیعہ سُنی رنگ اختیار کرلیا، جس کی تفصیل ملا عبدالاعلیٰ (فرزند اکبر ملا عبدالعلی بحرالعلوم) نے رسالہ قطبیہ میں اس طرح بیان کی ہے،

سید نورالحسن بلگرامی در زمانۂ سابق	سید نورالحسن بلگرامی جو اس وقت شیعہ
مذہب اہل تشیع می داشت، در حویلی	مذہب رکھتے تھے (فرنگی محل کے اندر
مولوی محب اللہ استقامت ورزیدہ	اپنے دوست) مولوی محب اللہ (بن) ...

بود، جہت بیماری طاقت رفتن برائے
زیارت روضہ نداشتند، دراں حویلی
طلب نمود، چونکہ مدرسۂ مولانا کامل
در اثنائے راہ بود و آں وقت فاتحہ
بر شربت کنند را امین بودی کردند
روضہ را دیدند و تکلم کردن نتوانستند
از دست اشارہ کردند کہ بندگاں
را منع کنید کہ ایں طرف راہ نیست
کہ می برند شاہ راہ فراموش کردہ
باشند بعضے طلبائے متعصبین فہمیدند کہ
ایں بدعت را اشارۂ شکستن کردہ
اند، یکبارگی شکستند، چوں مولانا
کامل از فاتحہ فارغ شدند طلبا
را بسیار غصہ فرمودند......

ملا عبدالحق بن ملا سعید) کے مکان میں
ٹھہرے ہوئے تھے، چونکہ بیماری کی
وجہ سے وہ تعزیہ کی زیارت کو
جا نہیں سکتے تھے، (اور یہ زمانہ
محرم کا تھا، غالباً عشرے کا روز
ہوگا) تعزیہ کو (جو فرنگی محل کی
گلی سے جلوس کے ساتھ گذر رہا
تھا، فرنگی محل کے پھاٹک کے
اندر) بلواکر اپنی قیامگاہ سے اس
کی زیارت کرنا چاہی، اُن کی قیام
گاہ یعنی مولوی محب اللہ کے مکان
تک جانے میں ملا بحرالعلوم کا مدرسہ
بیچ میں پڑتا تھا، اور اس وقت
بحرالعلوم حضرات حسنینؓ کی نذر
کے شربت پر فاتحہ دے رہے تھے،
انھوں نے تعزیہ آتے دیکھا تو فاتحہ
میں معروف ہونے کی وجہ سے بول
نہ سکے، ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ تعزیہ
لانے والوں کو روکو، اس طرف راستہ

نہیں ہے، شاید بھولے سے ادھر نکل
آئے ہیں بعض متعصب طلبا یہ سمجھے کہ
بحر العلوم نے ہاتھ سے جو اشارہ کیا
ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تعزیہ توڑ
ڈالا جائے، اچانک وہ تعزیہ پر ٹوٹ
پڑے، اور اُسے توڑ ڈالا، بحر العلوم
جب فاتحہ دے چکے، تو طلبا پر بے حد
غصہ فرمایا،

مگر واقعہ تو پیش آچکا تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ لکھنؤ میں شیعہ عملداری ہو چکی تھی، شجاع الدولہ کا زمانہ تھا یعنی اس وقت تک لکھنؤ اودھ کی راجدھانی نہیں بنا تھا، بہرحال اس واقعہ سے شیعوں میں ہل چل مچ گئی اور یہ شہرت ہوگئی کہ

مولانا از امین منحرف شدہ متوجہ
سوئے خروج شد بہیں دستاویز
قاضی غلام مصطفیٰ کہ مقتداے اہل
تشیع بودند واز مولانا کامل معاندت
دینی و دنیوی می داشت بلوہ عام
نمودہ خواست کہ مولانا کامل را
قصد بعہ وچہ این خبر بمولانا کامل
رسید۔ مولانا کامل نیز بلوہ خاص

مولانا بحر العلوم حضرات حسنینؓ سے منکر
ہو کر بغاوت پر آمادہ ہوگئے ہیں،
شیعیان لکھنؤ کے قاضی غلام مصطفےٰ
لیڈر تھے، انھوں نے اس کو بہانا
بنا کر اس لئے کہ وہ بحر العلوم سے
دین و دنیا کی عداوت جمع کیا، اور
بلوہ کر کے مولانا بحر العلوم کو زک
پہنچانا چاہی، بحر العلوم کو جب اس

عام نمودہ ارادہ محاربہ نمود،

کی خبر لگی تو انھوں نے بھی (اہل سُنت کے) عوام اور خواص کو اکٹھا کر کے ارادہ کر لیا کہ حملہ آوروں سے جنگ کریں گے"

"خاص و عوام کی اتنی بڑی فوج جمع کر لینا اسی وقت ممکن ہے، جب ان کا علمی اقتدار معاشرے میں پوری طرح سرایت کر چکا ہو، اتنی بڑی جمعیت بحر العلوم کے گرد اکٹھا ہو گئی تھی کہ حکومت وقت اور شیعہ لیڈر قاضی غلام مصطفیٰ:-

"تاب مقاومت نیاوردہ پیام صلح نمودند، مولانا کامل صلح فیما بین اسلام اصلح دیدند قبول کردند،

مقابلہ کی طاقت نہ پا کر صلح کے لئے پیغام دینے لگے بحر العلوم نے مسلمانوں کے درمیان صلح ہو جانے کو مناسب سمجھا اور پیغام صلح قبول کر لیا،

مگر بحر العلوم تک خبریں آنے لگیں کہ یہ صلح محض فریب ہے، مقصد یہ ہے کہ غفلت میں موقع پا کر بحر العلوم کو قتل کر دیا جائے، بحر العلوم نے عزیزوں اور دوستوں سے صلاح لی کہ کیا کرنا چاہئے، ہر وقت اپنی محافظت کا انتظام رکھنا قدرت سے باہر ہے، اعزہ نے جواب میں مشورہ دیا کہ:-

اصلح آنست کہ چندے سفر نمایند چوں مقدمہ کہنہ شود باز بیایند و آشنایاں جواب دادند کہ مکان مولانا ملارث گذاشتن خوب نیست ہمہ متفق شدہ تدارک این معنی خواہیم نمود،

بہتر یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لئے یہاں سے کہیں چلے جائیں، جب معاملہ پرانا ہو جائے پھر تشریف لے آئیں، دوستوں اور مخلصوں نے کہا، ملا نظام الدین کا آستانہ چھوڑنا مناسب نہیں ہے، ہم لوگ متحد و متفق ہو کر اس صورت حال کا

(تذکرہ کا کوری)

بحرالعلوم نے اعزّہ کے جواب سے بددل ہوکر مخلصوں سے کہا کہ ہمارے اعزا جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں، تیار نہیں معلوم ہوتے، تو تم کیا کرپاؤگے، پھر یہی طے فرمایا کہ لکھنو سے چلے جائیں، چونکہ یہ خیال تھا کہ مخلصین جانے سے روکیں نہ کہیں، اس لئے بلا اطلاع دیئے اور بہانے سے لکھنو چھوڑ کر شاہجہان پور، حافظ رحمت خان والی ملک روہیل کے پاس چلے گئے،

رسالۂ قطبیہ کے مصنف کے اس قول سے کہ بے اطلاع بحیلہاے بسیار مولانا بنیرت تمام ہجرت نمودہ" بحرالعلوم کے ایک شاگرد کے اس قول کا مطلب واضح ہوجاتا ہے کہ جب مولانا بحرالعلوم حج وزیارت کے لئے روانہ ہوگئے، تو "یہ بات "عقیدۂ وثیقہ" (قلمی) کے مصنف نے مقدمے میں لکھی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لکھنو سے روانہ ہونے کے لئے مولانا بحرالعلوم نے حج وزیارت کے لئے روانگی کا خیال ظاہر کیا ہوگا، جس سے عقیدۂ وثیقہ کے مصنف کو غلط فہمی ہوگئی، حالانکہ بحرالعلوم کو ہندوستان سے باہر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا،

یہ ناخوش گوار معاملہ تخمیناً ۱۱۷۲ھ میں یعنی استاذ الہند ملا نظام الدین کی وفات کے دس گیارہ برس بعد پیش آیا، ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے اغصان اربعہ (مطبوعہ) میں اس واقعہ کا اشارۃً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "در اوائل حال ادرا سانحۂ عظیمے در وطن پیش آمد، اسی کے ساتھ انھوں نے عزیزوں کے جواب کی وضاحت بھی کی ہے، اُن کا کہنا ہے کہ "میرے والد اور میرے چچا نے مجھ کو بتایا کہ "اس سانحہ کے بعد بحرالعلوم سے اور میرے دادا ملا محب اللہ" سے گفتگو ہوئی تھی، اور انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم لوگ (عزیز اور رشتہ دار) تو گھروں میں رہتے ہیں، اور آپکے پاس طالب علم بڑی تعداد میں ہیں، جو شہر میں سیر و تفریح کے لئے بھی جایا کرتے ہیں، اور آپ ان طالب علموں کو عزیزوں اور رشتہ داروں سے زیادہ مانتے ہیں، اگر شہر کے اوباشوں اور بدمعاشوں نے شہر میں کہیں آپ کے ساتھ یا آپ کے طلبہ کے ساتھ کوئی گستاخی کی، یا

جان لے لی تو ہم لوگ وہاں کہاں موجود ہوں گے، ہاں اگر ایسا ہوا کہ آپ کے گھر پر کوئی بری نیت سے آیا اور فساد کرنا چاہا، تو پہلے ہم اپنا سر آپ پر تصدق کریں گے، اس کے بعد جو ہوگا ہوگا، بحر العلوم نے فرمایا کہ محض اس حد تک ذمہ داری قبول کرنے سے میرا یہاں قیام ممکن نہیں ہے" میرے دادا ملا محب اللہ نے ہمہ وقت کی ذمہ داری (شرکت عمومی) لینے کی جرأت نہیں کی، اور بحر العلوم نے شہر کے گڑبڑ کا اندازہ کرتے ہوئے ترک وطن کر لیا" (اغصان اربعہ ص ۱۲۲، کا خلاصہ)

بحر العلوم کا یہ مزاج کہ وہ حکومت وقت سے مقابلہ تک کے لئے تیار ہو گئے، اپنے والد ماجد ملا نظام الدین کے غم خور مزاج کے برعکس تھا، ملا صاحب نے پوری زندگی فروتنی اور غم خوری میں گذار دی، اس قدر بردباری اور حلم اُن کے مزاج میں تھا کہ متعلقات فرنگی محل میں آباد کرایہ داروں تک سے حق و استحقاق کے معاملے میں بھی سختی کا رویہ برتنے سے انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ برادر زادے ملا احمد عبدالحق نے رعایا کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی سرکشی کا انسداد کیا،

رعایا اور کرایہ دار کا معاملہ تو ایک طرف ملا نظام الدین اپنے ہم چشموں اور معاصروں کے علمی اعتراضات تک پر سکوت اختیار کرتے تھے، خواہ اس میں خود ملا صاحب کی کتنی ہی سبکی کیوں نہ ہو جائے فرماتے تھے کہ

اگر اعتبار و رشد کسے ورا الزام ما
مجھے غلطی پر قرار دے کر اگر کسی کا اعتبار

باشد مارا قبول است،
اور مرتبہ علمی بڑھتا ہے تو میں غلطی قبول کرنے پر تیار ہوں،

فرماتے ہی نہیں تھے، بلکہ اس پر ایسا عامل تھے کہ اس کے برعکس ہونے پر بے حد ناراضگی ہو جاتی تھی، اس سلسلے میں ایک واقعہ ہو بھی گیا تھا، ایک صاحب علم نے ایک معقول مسئلے کے سلسلے میں ملا صاحب سے استفسار کیا ملا صاحب نے اسکا مناسب جواب بھی دے دیا، اس صاحب علم نے ایسی بحث و تکرار شروع کر دی

جس کا مقصد مقابل کو خاموش کر دینا ہوا کرتا ہے، مُلّا صاحب نے اس خیال کے پیش نظر کہ فضول بحث و مُباحثہ اہلِ علم کی شان کے خلاف ہے، خاموشی اختیار کر لی، بحث کرنے والے صاحب، مُلّا صاحب کے پاس سے گئے، اور سب جگہ مشہور کر دیا کہ میں نے مُلّا صاحب کو بحث میں چپ کر دیا، شدہ شدہ یہ بات مُلّا صاحب کے تلامذہ تک پہنچی، مسئلہ زیرِ بحث پر خود مُلّا صاحب اپنی بعض تصنیفات میں مفصل روشنی ڈال چکے تھے، بحث کرنے والے صاحب نے جو بات چھیڑی تھی، اُس کے ۲ جواب مُلا صاحب کی تصنیف میں لکھے موجود تھے، مُلّا صاحب کے طلبہ کو جب معلوم ہوا، تو اُن میں سے ایک صاحب بحث کرنے والے اہلِ علم کی خدمت میں پہونچے، اور اسی مسئلے میں ان سے بھڑ گئے، یہاں تک کہ اس کو خاموش کر دیا اور یہ بھی جتا دیا، کہ مُلّا صاحب جو بحث میں خاموش ہو گئے تھے، تو محض اسلئے کہ فضول کی تکرار اُن کا شیوہ نہیں، حالانکہ مسئلۂ زیرِ بحث کے بارے میں مُلّا صاحب اپنی تصنیف میں یہ سب لکھ چکے ہیں، طالب علم نے تو حقِ شاگردی ادا کر دیا، اور صحیح ادا کیا، لیکن مُلّا صاحب کو جب اس کی خبر لگی تو

ازاں طالب علم بسیار ناخوش وملول	اس طالب علم سے بے حد ناخوش اور
خاطر گشت و گفت اگر مرداں بطریق	رنجیدہ ہوگئے اور طالب علم سے فرمایا
طعن چیزے می گفتند مرا می گفتند	کہ اگر لوگ بطور طنز کچھ کہتے ہیں تو مجھ
ترا، اگر در الزام من اعتبار فاضلے گردد	کو کہتے ہیں تم کو نہیں کہتے ہیں، اگر مجھے
اولیٰ است ازانکہ بسبب من بربادی	کم علم قرار دینے سے کسی عالم کا اعتبار
وحرج درس فاضلے شود،	زیادہ ہوتا ہے، تو یہ بہ نسبت اس کے
	بہتر ہے کہ میری وجہ سے کسی صاحب
	درس فاضل کے درس میں خلل پڑے
	اور بربادی ہو،

صرف اسی تلقین ونصیحت پر بس نہیں کی، بلکہ :۔

او را از خانۂ خود وداع کرد وگفت کہ من باین قسم کارہا راضی نشوم و بایذاے احدے ارتکاب نکنم،

(عمدۃ الوسائل قلمی)

اس طالب علم کو اپنے یہاں سے خارج کر دیا، اور کہہ دیا کہ اس قسم کی حرکتوں سے میں راضی نہیں ہو سکتا، کسی شخص کو بھی رنج پہنچانے کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتا ہوں،

اس خاکساری اور فروتنی کا مطلب یہ نہیں کہ علم اور دین، کے حقوق کی نگہداشت سے بھی چشم پوشی فرماجاتے تھے، اس کے برعکس اہل ثروت اور دنیاوی اقتدار رکھنے والوں سے زیادہ التفات نہ فرماتے، اور اگر ایسے لوگوں سے کوئی حاضر خدمت ہوتا تو اس کی تعظیم کے لئے کبھی کھڑے نہ ہوتے، بلکہ فرماتے تھے کہ :۔

این ہمہ از روے ریاست

اہل ثروت کی اس طرح تعظیم کرنا دکھاوے میں داخل ہے،

اس سلسلے میں ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے لکھا ہے :۔

میاں شیخ غلام مخدوم ساکن سہالی کہ بجانی خدمت اخلاص و نیاز و قرابتے داشتند ازین خاکسار حکایت می کردند کہ من در ایام شباب خود بیمار شدم در مکانے کہ مولانا می نشست بسر بردے ازین سبب افتادہ می ماندم روزے

میاں شیخ غلام مخدوم ساکن سہالی نے جو ملا صاحب سے عقیدت بھی رکھتے ہیں، اور رشتہ داری بھی، مجھ سے بیان کیا کہ میں جوانی کے زمانے میں بیمار ہو گیا تھا، اور اس مکان میں جو ملا صاحب کی نشست گاہ تھی،

بعضے از امیران صاحب جاہ برائے ملازمت شان آمدند، دانستم کہ ایں وقت بالانشینی مناسب نیست خواستم کہ از تخت فرود آیم و برزمین نشینم فرمود اے فلاں بحال خود باش دیدین سفید پوشاں دیوانہ مگرد،

ایک تخت پر پڑا رہتا تھا، ایک روز کوئی صاحب عزت و اقتدار امیر ملا صاحب سے نیاز حاصل کرنے آیا، میں نے خیال کیا اس وقت مجھ کو تخت پر لیٹے رہنا زیبا نہیں ہے، میں تخت سے اتر کر نیچے فرش پر جا بیٹھوں (ملا صاحب اور صاحب اقتدار ملاقاتی بیٹھے تھے،) بیٹھنے کا ارادہ کیا، ملا صاحب نے فرمایا، غلام مخدوم! اپنی جگہ لیٹے رہو، سفید پوشوں (رئیسوں) کو دیکھ کر دیوانے نہ ہو جاؤ،

ہفت ہزاری منصب رکھنے والے ایک امیر نے جو ملا صاحب سے بھی تلمذ رکھتے تھے، اور عقیدت بھی، جمعہ کی نماز کے لئے ایک دفعہ کہلوا بھیجا کہ

انتظار من اگر حضرت فرمایند من ہم داخل جماعت گردم، و باقتدائے آنحضرت نماز گذارم،

اگر تھوڑا سا انتظار فرمالیں تو میں بھی جماعت میں شامل ہو کر حضور والا کی اقتدار میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کر لوں،

ان ہفت ہزاری منصب والے شاگرد اور عقیدت مند کو آنے میں وقت مقررہ سے کچھ تاخیر ہو گئی، ملا صاحب نے بغیر ان کی انتظار کئے نماز پڑھا دی، اور فرمایا:-

نماز خدا است نہ اہل دنیا و انتظار	نماز خدا کی ہے، دنیا والوں کی نہیں ہے
چنیں کساں داخل ریا است،	اور ایسے لوگوں کا نماز میں انتظار
(عمدۃ الوسائل)	کرنا دکھاوے میں داخل ہے،

لباس اور رہن سہن میں بھی ملّا صاحب کے یہاں کوئی امتیاز اور شناخت والی بات نہ تھی عام انسانوں کی طرح لوگوں میں بیٹھتے تھے، اجنبی پہچان بھی نہیں سکتا تھا، کہ اس مجمع میں ملا صاحب کون ہیں؛:-

ابو المعالی خاں برائے ملاقات آمد	ابو المعالی خاں ملاقات کیلئے آئے لوگوں
از مرماں پرسید کہ ملّا نظام الدین کجا است	سے پوچھا کہ ملا نظام الدین کہاں ہیں؟
مردم بمکان نشست مولانا قدس سرہ نشان	لوگوں نے وہ جگہ بتا دی جہاں ملّا صاحب
دادند و آں وقت جناب شاہ بر زمین	بیٹھا کرتے تھے، ابو المعالی وہاں گیا،
فرش ناکارہ نشستہ درس می دادند و	اس وقت ملّا صاحب زمین پر پیچھے ایک
چونکہ کر و فر علمائے ولایت دیدہ بود ایشاں	پھٹے پرانے کپڑے پر بیٹھے ہوئے تھے اور
را چوں بریں حالت دید نشناخت و دانست	سبق پڑھا رہے تھے، ابو المعالی علمائے
کدام فاضلے است کہ درس می دہد گفت	فارس کی شان و شوکت دیکھے ہوئے
مولانا نظام الدین بکدام جا می نشینند و	تھا، ملا صاحب کو جو اس بے سر و سامانی کے
درس می دہد، فرمود من نمیدانم کہ مولانا	عالم میں دیکھا پایا تو پہچان نہ سکا سمجھا کہ کوئی
کجا است نظام الدین نام من است،	مدرس ہوں گے جو لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں، ان سے
	پوچھا یہ مولانا نظام الدین کس جگہ تشریف رکھتے
	ہیں اور درس دیتے ہیں ملا صاحب نے فرمایا کہ

میں نہیں سمجھا تھا کہ مولانا کہاں ہے، نظام الدین میرا ہی نام ہے،

(باقی)

کلیلہ و دمنہ کے سنسکرت مآخذ
اور
اس کے فارسی تراجم

از

جناب شرف عالم صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر

ہندوستان عہد قدیم سے علوم و فنون اور معرفت و حکمت کا گہوارہ رہا ہے، عرب مصنفین بھی ہندوستان کو حکمت کی جنم بھومی تصور کرتے تھے، یہاں کے علوم و عرفان کی روشنی دور دراز ممالک تک پہنچی، چین، جاپان، برما اور سیام سے تشنگانِ علم طویل اور دشوار مسافتیں طے کرکے ہندوستان آتے تھے، اور فلسفہ و ریاضی اور طب و نجوم وغیرہ علم سے بصیرت افروز ہو کر اپنے وطن واپس جاتے تھے، برہمنوں کی تصنیفات علم و دانش کا خزانہ ہوتی تھیں، قدیم ہندوستان کی اہم ادبی کتابوں میں سنسکرت کی وہ تصنیف بھی قابلِ ذکر ہے جس کی بنیاد پر کلیلہ و دمنہ عالمِ وجود میں آئی۔ اس کے ابتدائی پس منظر کا ذکر اگرچہ روایت پر مبنی ہے، پھر بھی دلچسپی سے خالی نہیں

مقدمہ انوار سہیلی[1] میں مذکور ہے کہ ایک بادشاہ چین نے اپنے وزیر سے سنا کہ ہندوستان کے ایک خطہ کے حکمراں دابشلیم نے جس کی راجدھانی سومنات ہے، ایک شب خواب میں دیکھا کہ ایک خاص پہاڑ کے دامن میں جواہرات کا خزانہ دفن ہے، چنانچہ جب اس کی کھدائی ہوئی تو بہت سے صندوقوں کے ساتھ ایک مرصع صندوق برآمد ہوا جس کے اندر ایک

---

[1] انوار سہیلی ص ۳-۴ مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۳۰۶ھ

بکس تھا، اس میں ایک ڈبیہ کے اندر سفید حریر کے ٹکڑے پر کچھ لکھا ہوا تھا، ایک زادویشین نے جو جملہ علوم و فنون میں دستگاہ رکھتا تھا، دابشلیم کو بتایا کہ اس ٹکڑے پر سریانی زبان میں ہوشنگ کا نسب نامہ (ہوشنگ بن سیامک بن گیومرث بن سام بن نوحؑ) مرقوم ہے، اور چودہ نصیحتیں درج ہیں، دابشلیم نے غور کیا کہ اکثر متواتر پند و موعظت سامعین پر گراں گذرتی ہے، اور انسانی فطرت افسانے سننے کی زیادہ مشتاق رہتی ہے، اس لیے دابشلیم نے ایک حکیم روشن رائے بیدپا نامی برہمن سے سنسکرت میں ایک کتاب تصنیف کرائی جس کا نام کرتک و دمنک رکھا۔

ابوریحان البیرونی اپنی کتاب تحقیق ما للہند میں رقم طراز ہے کہ ہندوؤں کی کتاب پنچ تنتر (Panchtantra) سے عرب و عجم کی کلیلہ و دمنہ ماخوذ ہے،[1] تنتر (Tantra) سے مراد وہ دینی مضامین ہیں جن میں مذہب کے اخلاقی، تہذیبی اور عباداتی اصولوں کی وضاحت عقل و عرفان کی روشنی میں کی جائے۔ وید کے احکام عوام الناس کے لیے عملی طور پر سخت اور دشوار تھے، اور سماج کا ہر طبقہ وید کے اوامر و نواہی کی انجام دہی کا اہل نہ تھا، اس دشواری کے پیش نظر ویدی علماء نے تنتر مرتب کیں جس سے ان احکام پر عمل نسبتاً آسان ہو گیا، کیتھ (A. B. Keith) نے تنتر کو موضوع یا Subject matter کے معنی میں لیا ہے،[2] پنچ تنتر میں پانچ موضوعات پر تمثیلیں ہیں، جو وحوش و طیور کی زبانی بیان ہوئی ہیں، کرتکا، دمنکا اس کتاب کے دو اہم کردار ہیں، یہ دونوں (کرتکا اور دمنکا) (Karlaka, Damanka) جنگل کے بادشاہ شیر کے معتمد وزرا شغال (Jackals) ہیں، پنچ تنتر جب ایران (جس کا ذکر آگے آئیگا) پہنچی تو کرتکا اور دمنکا کی ذہانت و ذکاوت اور اہم کردار کی بنا پر اس کتاب کا نام پہلوی زبان میں کلیلگ و دمنگ رکھا گیا، اور دری[3] زبان میں چونکہ کلمات کے آخری "گ"، "ہا غیر ملفوظ" سے بدل جاتے ہیں،

---

[1] سبک شناسی، بہار مشہدی ج ۲ ص ۲۵۱ [2] Introduction to classical Sans
[3] سبک شناسی، بہار مشہدی ج ۱ ص ۲۴۹ Krit by G. Sastri. P.44

اس لیے کلیلگ و دمنگ کلیلہ و دمنہ ہو گیا،

اصلی پنچ تنتر اب باقی نہیں ہے، اس کے چار متنوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، ایک پنچ تنتر شمالی و غربی کے نام سے معروف ہے، جو گن ھیا (Gunadhya) کی بر ہت کتھا (Brihat Katha)، سوما دیو (Somadeva) کی کتھا سریت ساگر (Katha Sarit Sagar) اور کشیمندر (Kshamendra) کی بر ہت کتھا منجری (Brihat Katha Manjari) کا ماخذ ہے۔

دوسرا اُر تنتر کھانیکا (Ur Tantrakhyanika) جو کشمیری تنتر کھانیکا (Tantrakhyanika) اور پنچ کھیانیکا (Panchakhynika) پانچ کھیانہ تالیف پورن بھدر (Purnabhadra) کا ماخذ ہے، اور تیسرا تین متنوں کا ماخذ بنا، ایک پنچ تنتر جنوبی ہے، جسے ہرٹل (Hertel) نے ترتیب دیا ہے، دوسرا نیپالی اور تیسرا بنگال کے نارائن پنڈت کی تالیف ہتوپدیش (پند نامہ Hitopdesha) ہے، متن چہارم وہ ہے جس کا پہلوی میں ترجمہ ہوا۔[1]

پنچ تنتر کے زمانۂ تالیف کے بارہ میں کیتھ (Keith) نے ہرٹل (Hertel) کی رائے سے اتفاق کیا ہے، اس کی رائے میں پنچ تنتر عیسوی صدی کے اوائل میں تصنیف ہوئی، اس لیے کہ اس میں کچھ ایسے الفاظ (کیتھ نے یہ الفاظ مثلاً لاطینی (Dinarius) کا دنارا Dinara کی شکل میں استعمال نقل کیا ہے) استعمال ہوئے ہیں جو ہندوستان کے زمانہ میں مستعمل تھے، کیتھ پنچ تنتر برہمانیسی (Brahmanical) کے عہد حکومت میں اور گپت شہنشاہ کے عہد عروج میں یا اس سے چند سال قبل تالیف ہوئی۔

---

[1] A History of Sanskrit Literature By A.B. Keith, P. 246-247 - مقالہ ڈاکٹر تاراچند و ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی ۳۴۹ در مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی شمارہ سوم

تاریخ ادبیات سنسکرت (History of Sanskrit Literature) کے مولف کیتھ (A. Berriedale Keith) اور کلاسیکی سنسکرت ادبیات کا تعارف (Introduction To The Classical Sanskrit Literature) کے مولف جی ساستری (G. Sastri) دونوں متفق الرائے ہیں کہ پنچ تنتر ہی کا پہلوی ترجمہ ہوا، پھر دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوتا رہا، ان کی رائے میں اس کا پہلوی اور سریانی ترجمہ چھٹی صدی عیسوی میں اور عربی، عبرانی اور اسپینی ترجمہ بالترتیب آٹھویں، گیارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا لیکن سعید نفیسی نے احوال و آثار و اشعار رودکی[1] میں لکھا ہے کہ یہ تمام تراجم پنچ تنتر (مولف وشنو سرمن Vicnu Sarmanh) کے نہیں، بلکہ کرتکا و دمنکا، مولفہ بیدپا یا برہمن یا پیل یا برہمن کے ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں عبد اللہ ابن المقفع، فردوسی، نصر اللہ بن عبد الحمید شیرازی اور حاجی خلیفہ (مولف کشف الظنون) کے اقوال نقل کیے ہیں، کلیلہ و دمنہ کا عربی ترجمہ پہلوی کلیلہ و دمنہ کے اس نسخہ پر مبنی ہے، جسے حکیم بزرگ مہر نے ترتیب دیا تھا، زمانہ حال کی تحقیقات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بیدپا یا پیل یا کوئی شخص نہ تھا، بلکہ یہ ایک برہمن کا لقب تھا جو حکیم برزویہ نے عطا کیا تھا۔

کلیلہ و دمنہ کے ماخذ اور اس کے مصنف کے بارہ میں مورخین میں اختلاف ہے، لیکن سنسکرت ادبیات کے مورخین اور عربی و فارسی ادبیات کے مورخین یہ دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کلیلہ و دمنہ کا ماخذ سنسکرت کی کتاب ہے، جو ایک دفتر عقل و دانش ہے جس میں پند و نصائح کی پھیکی اور بے مزہ باتوں کو لطف و تفریح کی شیرینی اور چاشنی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور طبیعتوں کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانوں کی بنیاد حقائق پر رکھی گئی ہے، اور یہ افسانے اور حکایتیں وحوش و طیور کی زبان سے ادا کیے گئے، اس کا مقصد یہ تھا کہ افسانوں اور حکایتوں

---

[1] احوال و آثار و اشعار رودکی کوشش سعید نفیسی ص ۳۰۴

میں پوشیدہ علم و حکمت اور عقل و دانش کی باتیں افسانوں کے ذہن میں آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر منتقل ہوں، اور ان کا شعور افسانوں کے لطف سے محظوظ ہو، معلمین آسانی سے اس کا درس دے سکیں، اور متعلمین کے ذہنوں پر حکایتوں کے نقوش تا دیر قائم رہیں۔ اس کتاب میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا کہ بادشاہ اور اربابِ سیاست و مملکت بھی رعیت پروری، عدل گستری، قیام امن و راحت اور فتنہ انگیز عناصر کی زجر و توبیخ میں اس سے راہ نمائی حاصل کریں۔ حکمت عملی فرد اور جماعت دونوں کے لیے جداگانہ اہمیت رکھتی ہے۔ فرد کا تعلق تہذیب اخلاق سے ہے، جس کو مشرق کے مفکروں نے حکمت عملی کا ایک شعبہ قرار دیا ہے۔ حکمت عملی کی دوسری قسم کا تعلق جماعت سے ہے۔ یہ دو قسموں میں منقسم ہے، ایک جس کا تعلق خانگی زندگی سے ہے۔ اس کو تدبیر منزل کا نام دیا گیا، دوسری جس کا تعلق شہر و ولایت، اقلیم و مملکت کے رابطوں کی زندگی سے ہے۔ اس کو سیاستِ مدن کے نام سے موسوم کیا گیا، کلیلہ و دمنہ کا موضوع بھی سیاستِ مدن ہے۔

حکیم بیدپا برہمن ایک حقیقت پسند اخلاقی فلسفی تھا جس نے سنسکرت میں یہ لافانی گنجینۂ حکمت ترتیب دیا۔ راجہ دابشلیم کو یہ کتاب زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھی، وہ اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کا حل اسی سے ڈھونڈھتا تھا، گویا یہ کتاب جملہ مشکلات کی کنجی تھی۔ اس کے عہد میں یہ کتاب عوام سے پوشیدہ رہی، دابشلیم کے جانشینوں نے بھی علم و حکمت کے اس خزانہ کو اپنے سینوں میں پوشیدہ رکھا، اور اس کو عام نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ بادشاہوں کی خود غرضی کے علاوہ عوام کی علم سے محرومی بھی تھی۔ اس لیے یہ کتاب مدتوں ہندوستان کے صرف چند نامور حکمرانوں تک محدود رہی جنھوں نے ذاتی خزانہ کی طرح اسے دوسروں سے چھپائے رکھا۔ حسن اتفاق ہے کہ کسی طرح انوشیرواں کے زمانہ میں ایران میں متعارف ہوئی۔

انوشیروان (۵۳۱ء - ۵۷۹ء) کو ایک ہندوستانی برہمن سے معلوم ہوا کہ ایک حکیم بیدپا برہمن نے علم و معرفت اور عقل و حکمت کے نکات کتاب کی شکل میں مرتب کیے ہیں، جو کرتکاہ و دمنکا کے نام[1] سے معروف ہو، لیکن یہ قیمتی نسخہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے، سلاطین کو رعایا کی سیاست اور قواعد حکومت میں اس سے سبق ملتا ہے، اور وہ اسے سرمایۂ موعظت و بصیرت تصور کرتے ہیں، یہ سنکر انوشیروان کو اس کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، وہ جس قدر عدل گستری میں بے مثال تھا، اسی قدر علم و ہنر کا بھی سرپرست و مربی تھا، اس نے اپنی مملکت کے ایک نوجوان دانشور برزویہ کو پچاس لاکھ دینار دے کر اس کتاب کا ترجمہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا، برزویہ جملہ فضائل و کمالات سے آراستہ اور اس عہد کی تمام مشہور زبانوں سے واقف تھا، اس نے ہندوستان پہنچکر یہاں کے دانشوروں سے ظاہر کیا کہ وہ ایک طالب علم ہو اور علم و ہنر کی تحصیل کی غرض سے ہندوستان آیا ہے، کچھ عرصہ کے بعد اسے ایک قابل اعتبار برہمن دوست مل گیا، جس کو اس نے اپنا رازدار بنالیا، اور مختلف حیلوں اور تدبیروں سے کرتکا اور دمنکا کا نسخہ خزانۂ شاہی سے حاصل کرنے میں (تقریباً ۵۶۰ء) کامیاب ہوگیا، وہ سنسکرت زبان و ادبیات کا بھی ماہر تھا، چنانچہ اس نے پہلوی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اسے ساتھ لے کر ایران واپس آیا، مؤلف سبک شناسی محمد تقی بہار مشہدی کی رائے میں حکیم برزویہ نے اس کتاب کو ہندوستان سے ایران لاکر پہلوی میں ترجمہ کیا، احوال و آثار و اشعار رودکی کے مرتب و مؤلف آقای سعید نفیسی بھی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں،

"... نسخۂ از یں کتاب فراہم کردہ با خود بایران آوردہ و از زبان سنسکرت بزبان پہلوی ترجمہ کردہ"[2]

۱؎ مقدمہ چہار دانش از علامی ابوالفضل ۲؎ احوال و آثار و اشعار رودکی ص ۱۳۴

لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ کتاب مذکور ہندوستان میں ہی پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی ہوگی، اس لیے کہ حکیم برزویہ کا برہمن دوست اصل کتاب کو ایران لیجانے کی اجازت کسی حال مین نہیں دے سکتا تھا. اگر ترجمہ ایران میں ہوا تو اس کی صورت یہ ہوئی ہوگی کہ حکیم برزویہ نے اصل کتاب کو ہندوستان میں نقل کر لیا ہوگا اور اسی نقل کو لیکر ایران گیا ہوگا. انوشیروان اس کتاب کے مطالعہ سے بے حد مسرور ہوا، اور اپنی مملکت کا پورا نظام اس پر موقوف کر دیا، اور اس کتاب کی نظم و ترتیب کے لیے حکیم روزگار، فاضل زمانہ بزرگ مہر یا بزرگ جمہور یا بزرجمہر کو مامور کیا، جو اس کا وزیر و مصاحب بھی تھا، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم برزویہ سنسکرت کتاب کی نقل ہی لے گیا تھا، جسے بزرجمہر نے پہلوی میں ترجمہ کیا، یا حکیم برزویہ کے پہلوی ترجمہ کی اصلاح و ترمیم اور اس کی جدید ترتیب و تنظیم کی، انوشیروان نے حکیم برزویہ کو اس کے اس عظیم کارنامے کا صلہ عطا کرنا چاہا تو اس نے استدعا کی کہ صلہ کے بجائے اس کتاب میں اس کے حالات کا ایک باب بڑھا دیا جائے، انوشیروان نے اس کو منظور کر لیا اور بزرگ مہر کو اس کی تعمیل کا حکم دیا گیا،

ایران میں بھی اس کتاب کو انوشیروان اور اس کے اخلاف نے دوسروں سے پوشیدہ رکھا، فردوسی لکھتا ہے کہ بہرام چوبین (ہرمزد شاہ بن انوشیروان کا وزیر و رفیق و امیر لشکر) نے جو شہر کا ایک فرومایہ پہلوان تھا، انوشیروان کے بیٹے ہرمزد شاہ (۵۷۸ء تا ۵۹۰ء) کے خازن سے اس کتاب کو حاصل کیا، اور اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کو اپنا دستور العمل بنایا اور اس کے ذریعہ ایران کے ہر طبقہ کو مسخر کر کے خسرو پرویز بن ہرمزد شاہ بن انوشیروان (۵۹۰ء تا ۶۲۱ء) کو شکست دیکر ایران کی حکومت پر قابض ہو گیا، اور ہرمزد کو راہ فرار اختیار کر کے روم میں پناہ لینی پڑی، شاہنامہ (فردوسی مطبوعہ تہران ج ۵) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

پہلی صدی ہجری کے اوائل میں (۷ ویں ۸ ویں صدی عیسوی) عربوں کے تسلط کی وجہ سے ایرانی تہذیب و تمدن، مذہب و اخلاق اور سیاست و حکومت میں انقلاب پیدا ہوگیا، شاہ ایران یزدگرد سوم بن شیرویہ بن خسرو پرویز کے ملک و مال کے ساتھ یہ کتاب بھی غارت ہوگئی، ایک طویل مدت کے بعد عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۷۵۴ء۔ ۷۷۵ء) کو اس کتاب کے فوائد معلوم ہوئے، تو بڑی جستجو سے یہ کتاب ملک حبش سے بہم پہنچائی گئی، اور ابوالحسن عبداللہ ابن المقفع (متوفی ۷۵۷ء یا ۱۴۵ھ) نے پہلی بار اس کا عربی میں ترجمہ کیا، ابن المقفع نے اس میں مزید چھ فصلوں کا اضافہ کیا جو اسلامی اقوال پر مبنی تھے، خلیفہ مامون الرشید کو یہ کتاب بہت محبوب تھی، مامون الرشید (۸۱۳ء۔ ۸۳۳ء) کا وزیر فضل بن سہل سرخسی (متوفی ۲۰۳ھ) مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے ایک دن قرآن مجید پڑھ رہا تھا، ایک دوست نے اس سے پوچھا کہ تم نے قرآن کو کیسا پایا؟ فضل نے جواب دیا "خوش چوں کلیلہ و دمنہ".

عرب شاعر ابان بن عبد الحمید اللاحقی یا لاہجی (دوسری صدی ہجری) مداحِ آلِ برمک نے برامکہ کے حکم پر کلیلہ و دمنہ کو عربی نظم کا جامہ پہنایا، اس منظوم کلیلہ و دمنہ کے مختلف ابواب کے کل چھہتر ابیات اب باقی رہ گئے ہیں، عرب کے متعدد شعراء نے اسے نظم کیا، لیکن ابان ابن عبد الحمید اللاحقی اور علی بن داؤد کاتب کے منظومات معروف ہیں، عبداللہ بن ہلال الاہوازی نے کلیلہ و دمنہ فارسی کا عربی ترجمہ یحییٰ بن خالد برمکی (وزیر المہدی و ہارون الرشید) کے نام معنون کیا اور سہل بن نوبخت الحکیم نے اسے یحییٰ بن خالد مذکور کے لیے منظوم عربی میں پیش کیا۱،

دوسری بار سلسلۂ سامانیہ کے جلیل القدر حکمران ابوالحسن بن نصر بن احمد سامانی نے تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں اپنے وزیر ابوالفضل محمد بن عبیداللہ بلعمی کو حکم دیا کہ اس نسخہ کو

---

۱ سبک شناسی، محمد تقی بہار ج ۱ ص ۱۵۵

عربی سے دری نثر میں منتقل کیا جائے۔ مگر یہ دری کلیلہ و دمنہ بھی کلیلہ و دمنۂ پہلوی کی شکل دست برد زمانہ کی نذر ہو چکی ہے[1]، فارسی کے آدم الشعراء رودکی سمرقندی (متوفی ۳۲۹ھ یا ۹۴۱-۹۴۰ء) نے امیر نصر بن احمد سامانی کے ایما اور ابوالفضل بلعمی کی ترغیب پر اس کو فارسی نظم میں منتقل کیا۔ کلیلہ و دمنہ رودکی کا آغاز شعر ذیل سے تھا:-

ہر کہ نامخت از گذشتہ روزگار   نیز ناموزد ز ہیچ آموزگار

رودکی کا یہ کارنامۂ منظوم اب نایاب ہے، اس کے سولہ اشعار فرہنگ اسدی طوسی میں اور کچھ اشعار تحفۃ الملوک میں موجود ہیں، آقای سعید نفیسی کے بیان کے مطابق رودکی کی کلیلہ و دمنہ میں نو ہزار (۹۰۰۰) ابیات تھے نفیسی نے ایک سو پندرہ ابیات تحقیق کے بعد احوال و آثار و اشعار رودکی میں نقل کیے ہیں[2]۔

اوائل قرن ششم میں ابوالمظفر بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم غزنوی (۵۱۲ھ-۵۴۷ھ) کو خبر ہوئی کہ ابوالمعالی نصر اللہ بن محمد بن عبد الحمید منشی نے عربی نسخہ سے فارسی نثر میں کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ شروع کیا ہے۔ تو اس نے ابوالمعالی کی ہمت افزائی کی اور یہ حکم دیا کہ ابن المقفع کے کلیلہ و دمنہ کا ایسی سلیس و سہل فارسی میں ترجمہ کیا جائے جس سے ہر شخص مستفید ہو سکے، ابوالمعالی نے اس کی تکمیل کے بعد اس کو بہرام شاہ کے نام معنون کیا، اور یہ کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کے نام سے معروف ہوئی اور کلیلہ و دمنہ ابوالمعالی بھی کہتے ہیں۔ کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ۵۳۸ھ کے درمیان تالیف ہوئی۔ ابوالمعالی نصر اللہ نے اصل سنسکرت کرتکا و دمنکا پر دو تین اسلامی اور ایرانی حکایتیں بھی بڑھا دیں[3]، کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ابتک موجود ہے اور تہران سے حال ہی میں شائع بھی ہوئی ہے چھٹی اور اوائل ساتویں صدی ہجری کا نامور

---

[1] بیست مقالہ قزوینی ج ۲ ص ۲۲ [2] احوال و آثار و اشعار رودکی، سعید نفیسی ص ۴۳۳-۴۳۲ ص ۸۰۰ وغیرہ
[3] تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق ص ۳۰۹

فاضل و منشی عوفی، کلیلہ و دمنہ ابو المعالی کی تالیف کے تقریباً سو سال بعد اس کے بارہ میں لباب الالباب (تالیف ۶۱۸ھ یا ۱۲۲۱ء) میں اس طرح رائے زنی کرتا ہے:۔[۵]

"تا دور آخر الزمان و انقراض عالم ہر کس رسالتی نویسد یا در کتاب تفوق کند متضمن فوائد او تواند بود چہ ترجمہ کلیلہ و دمنہ کہ ساختہ است دست مایۂ جملہ کتاب و اصحاب صنعت و ہیچ کس انگشت بر آن ننہادہ است و آن را قدح نکردہ و از منشآت پارسیان ہیچ تالیف آن اقبال ندیدہ است و آن قبول نیافتہ۔"

ترتیب و تنظیم انشاء کے حسن اور دلکش اسلوب نگارش کی بنا پر یہ کتاب نثر فارسی کی بہترین کتابوں میں شمار کیجاتی ہے۔ یہ اپنے عہد کی انشاء کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، اس میں تمام صنائع و بدائع اور ادبی نکات و لطائف کا استعمال ہوا ہے، ادبی صنعتوں میں صنعت موازنہ اور قرینہ سازی نمایاں ہے، استدلال و استشہاد میں فارسی و عربی کے اشعار، احادیث نبوی اور بزرگوں کے اقوال کا برمحل استعمال کیا گیا ہے، صنعتوں کی کثرت کے باوجود ابو المعالی ان سے مغلوب نہیں نظر آتا، اس کی مسجع نثر کی پیروی بہت سے معروف نثر نگاروں نے کی جن میں عطا ملک جوینی مولف تاریخ جہاں کشای قابل ذکر ہے، مؤلف ہفت اقلیم امین احمد رازی کی رائے کے مطابق فارسی ادبیات کا کوئی نثری کارنامہ اس قدر تعریف و تحسین کا مستحق نہیں ہے جس قدر کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی، امین احمد رازی نے کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کی تعریف کرتے ہوئے محمد عوفی کے ان تمام جملوں کو من و عن نقل کر دیا ہے جو اوپر درج ہوئے ہیں۔[۶]

مترادفات، موازنہ و سجع کے استعمال سے عبارت موزوں ہو جاتی اور اس میں خوش آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، گرچہ کلیلہ و دمنہ ابو المعالی میں بڑی چابک دستی سے صنعتوں کا استعمال

۵۔ لباب الالباب عوفی ج ۱ ص ۲ و ۶۔ ہفت اقلیم۔ امین احمد رازی ص ۲۲۱

کیا گیا ہے، لیکن گلستان سعدی اس صفت میں کلیلہ و دمنہ سے بہت آگے ہے، کلیلہ و دمنہ کے مقدمہ میں ابو المعالی لکھتا ہے کہ ابن المقفع اور رودکی کے ترجموں کے بعد کلیلہ و دمنہ بہت بار ترجمہ کی گئی، لیکن ان تراجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ مترجمین کا مقصد صرف تحریر حکایات و تقریر سمر تھا نہ کہ تفہیم حکمت و ایضاح موعظت۔ اس لیے ابو المعالی نے آخر الذکر مقصد کو پیش نظر رکھکر اس کے ترجمہ و تالیف کا کام انجام دیا، اور ان قصوں اور افسانوں میں پوشیدہ اسرار و رموز کی توضیح و تشریح بھی کر دی تاکہ ایسی اہمیت و افادیت کی حامل کتاب صرف قصے کہانیوں کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائے، لیکن مغلق لغات، عربی عبارتوں کی کثرت، استعارات و تشبیہات و اشارات کی فراوانی کی وجہ سے اکثر قاری فہم معانی سے دور اور بے بہرہ رہ جاتے تھے، اس لیے یہ ترجمہ بھی قبول عام نہ حاصل کر سکا جو ابو المظفر بہرام شاہ کا اصل مقصد تھا۔

محمد تقی بہار نے اپنی تالیف سبک شناسی[1] میں ایک منظوم کلیلہ و دمنہ کے قلمی نسخہ کا ذکر کیا ہے، جسے ساتویں صدی ہجری میں امیر بہاء الدین قانعی طوسی (۶۵۵ھ یا ۱۲۵۷ء) نے ایشیائے کوچک کے سلجوقی فرماں روا عز الدین کیکاؤس کے نام معنون کیا تھا، قانعی نے یہ کلیلہ و دمنہ بحر متقارب میں نظم کیا تھا، یہ نسخہ کتاب خانہ حاجی حسین آقا ملک (تہران) میں موجود ہے۔

اس نسخہ کے متعلق سر ڈینسن (Sir Dension) اپنی کتاب The Ocean of story کے جلد ۵ صفحہ ۲۱ میں لکھتے ہیں کہ ابو المعالی نصر اللہ کی کلیلہ و دمنہ کے بعد احمد بن محمود الطوسی متخلص بہ قانعی کا منظوم ترجمہ ہے، یہ نسخہ عز الدین کیکاؤس (جو ۶۴۲ھ میں اپنے باپ کا جانشین بنا) کے نام سے معنون ہوا، سر ڈینسن کا قیاس ہے کہ غالباً یہ نظم ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء میں تالیف ہوئی ہے[2]

نظام الدولہ والدین امیر شیخ احمد سہیلی نے ملا کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی سبزواری

---

[1] سبک شناسی محمد تقی بہار ج ۲ ص ۲۵۱ [2] مجلہ دانشکدہ ادبیات شمارہ دوم سال چہارم ص ۱۳۳ مقالہ از ڈاکٹر تارا چند و ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی۔

دمتوفی ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء) کو حکم دیا کہ عقل و دانش کے اس سفینہ کو نئے لباس میں پیش اور اس میں جدید نکات کا اضافہ کرے، یہ تالیف اواخر نویں صدی ہجری میں مکمل ہوئی، اس بار بھی زبان کو سہل بنانے کا لحاظ رکھا گیا، لیکن زمانہ و ماحول کسی کو آسانی سے بغاوت کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے واعظ حسین کاشفی کی کوشش بھی مروجہ پرتکلف طرز انشا کے دائرے سے نکل سکی، اور لطافت و متانت میں کلیلہ و دمنۂ معالی کے پایہ کو نہ پہنچ سکی، اس کے باوجود اسے ہندوستان میں بڑی قبولیت و شہرت حاصل ہوئی، کاشفی نے کتاب کی ترتیب و تنظیم میں تغیر مناسب نہیں سمجھا، اور اس کی قدیم بنیاد یعنی کرتکا و دمنکا کے اصلی ابواب علحدہ کرکے اپنی کتاب مرتب کی اور شروع کے دو ابواب جو حکیم بزرگ مہر اور حکیم برزویہ کے احوال و کوائف سے متعلق تھے، اور بزرگ مہر کے پہلوی ترجمہ سے لیکر عربی و فارسی کے تمام ترجموں میں شامل ہوتے چلے آرہے تھے، کاشفی نے حذف کردیے اور باقی چودہ ۱۴ ابواب کو رواں اور سہل عبارت میں پیش کیا، اور تمثیل میں بھی عربی ابیات کے استعمال سے حتی الامکان احتراز کیا، لیکن حکایتوں کے دوران میں ضروری احادیث نبوی اور مشہور امثال کے نقل کرنے میں یہ احتیاط قائم نہیں رہی ہے، جابجا فارسی اشعار بھی نقل کیے گئے، کاشفی نے اپنی اس گرانقدر تالیف کو امیر شیخ احمد سہیلی کے نام انتساب کیا اور اس کا نام انوار سہیلی رکھا، محمد تقی بہار کی رائے میں انوار سہیلی گویا کلیلہ و دمنۂ ابوالمعالی کی تلخیص و توضیح ہے، اور اس ترجمہ میں اخلاق محسنی اور مخزن الانشا وغیرہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے[۱]،

شہنشاہ اکبر (۱۵۴۲ء - ۱۶۰۵ء) کی علم پروری اور وطن دوستی کا یہ بین ثبوت ہے کہ اس کے حکم سے ایک بار پھر ابوالفضل (۹۵۸ھ - ۱۰۱۱ھ/۱۵۵۱ء - ۱۶۰۲ء) نے انوار سہیلی یا کلیلہ و دمنہ کو آسان تر زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی، اور اس عروس کو خلعت دیبا عطا کرکے

---

[۱] سبک شناسی محمد تقی بہار ج ۳ ج ۱۹۰۔

عیارِ دانش کے نام سے موسوم کیا، اس زمانہ میں انوارِ سہیلی ہندوستان کے تعلیمی نصاب میں داخل تھی اور اس کو کلیلہ و دمنۂ بہرام شاہی سے زیادہ قبولِ عام حاصل تھا لیکن عربی کے ادق الفاظ اور فارسی کے مشکل استعارے انوارِ سہیلی میں بھی موجود تھے، اس لیے شہنشاہ اکبر نے اس کو سہل زبان میں لکھنے کا حکم دیا، ابوالفضل نے اس کام کو انجام دیا، اور ان دو ابواب کو بھی شامل کر لیا، جو حکیم بزرگ مہر اور حکیم برزویہ سے متعلق تھے، اور جسے واعظ حسین کاشفی نے نصر اللہ مستوفی کے نسخہ سے حذف کر کے انوارِ سہیلی ترتیب دی تھی، ابوالفضل کی طرزِ نگارش کا زندہ جاوید نمونہ اکبر نامہ ہے، جس میں اس نے انشاء پردازی کا منفرد طرز اختیار کیا ہے، مگر اس میں نامانوس اور مغلق الفاظ بکثرت ہیں، اس لئے اگر اکبر نامہ کی طرزِ نگارش کا مقابلہ عیارِ دانش سے کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا، عیارِ دانش کا طرز ایک عام دبیر کے جیسا ہے، اس میں ابوالفضل نے اگرچہ عنانِ قلم پر مضبوط گرفت رکھی ہے، اس کے باوجود اس کا زورِ قلم کہیں کہیں جولانی دکھاتا ہے، لیکن مجموعی طور پر سہلِ ممتنع کی مثالیں ملتی ہیں،

ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے پنچ تنتر پر مبنی تراجم اور اس کے فارسی نسخوں اور شائع شدہ کتابوں پر نقد کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب پنچ تنتر کے فارسی ترجموں میں عہدِ اکبری تک داستانوں کی ترتیب اور اس کے متن میں اتنا تصرف و تغیر ہو چکا تھا کہ اصل اور ترجموں میں کوئی مطابقت نہیں رہ گئی تھی، ترجموں میں عربی لغات و اصطلاحات کی کثرت تھی، اکبر نے اپنے زمانہ میں بہت سی سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، پنچ تنتر کے ترجمہ کا کام مصطفیٰ خالق داد عباسی کے سپرد کیا، اور حکم دیا کہ ایسی زبان میں ترجمہ کرے جس کو عام قاری بھی سمجھ سکیں، مصطفیٰ خالق داد عباسی نے حسب الحکم ترجمہ کر کے پنچاکیانہ کے نام سے موسوم کیا، اس کا نسخہ دہلی میوزیم میں موجود ہے، پنچاکیانہ پر ڈاکٹر تاراچند سابق سفیر ہند در ایران اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کا ایک مشترک، پُرمغز تحقیقی عالمانہ مقالہ دو قسطوں میں مجلۂ دانش کدۂ ادبیات، شمارہ دوم، شمارہ سوم (تہران) میں شائع ہو چکا ہے،

عالمی ادبیات میں بہت کم کتابیں کلیلہ و دمنہ کی شہرت و مقبولیت کا مقابلہ کر سکتی ہیں، اس کی تالیف و ترجمہ کا سلسلہ طویل صدیوں سے جاری ہے، اس سے مختلف ملکوں، ملتوں اور تہذیب و ثقافت کے لوگوں نے یکساں دلچسپی لی ہے، اس کی اہمیت و مقبولیت پر مرور ایام کا کوئی اثر نہیں پڑا، اس سے علماء، وزراء، سلاطین و امراء، افسانہ نگاروں اور داستان طرازوں وغیرہ مختلف طبقات کو یکساں دلچسپی ہے، اور وہ سب اپنے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کرتے ہیں،

براؤن کے بیان کے مطابق ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے بعد سریانی زبان میں اس کا ترجمہ ۵۷۰ء میں بود (Buda) یا پارودیو (Parudivot) نامی شخص نے کیا، اس کے بعد تمام تراجم و تالیفات کا ماخذ کلیلہ و دمنۂ ابن المقفع ہی رہی[۱]، تبتی (Tibetan) میں اس کا ترجمہ اصل سنسکرت نسخہ سے ہوا، اردو میں انوار سہیلی کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے ہوا، اس کے مترجم فقیر محمد خاں بہادر رسالہ دار المتخلص بہ گویا، لکھنوی ہیں، یہ ترجمہ مطبع نول کشور سے ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا ہے، عیار دانش کا مولوی حفیظ الدین نے ۱۸۱۵ء میں خرد افروز کے نام سے ترجمہ کیا، اس کی مقبولیت کا اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ساٹھ زبانوں میں اس کا ترجمہ مختلف زمانوں میں ہوا، ان میں سے چند زبانیں یہ ہیں: عبرانی، لاطینی، اسپانوی، یونانی، انگریزی، روسی، فرانسیسی، اطالوی، سلاوینی، ترکی، آلمانی، ڈنمارکی، چکسلواکی، ہلندی، ایسلندی، سویدی، لستانی، ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، برج بھاشا، تامل، تیلگو

---

[۱] A. Literary History of Persia. By Brown. E. G. Vol II P. 350

ملیالی، دکنی، افغانی، گرجی، ملایائی، جاوائی، حبشی، مدورائی، کناڈا، کرناٹک، کناری، مادی، سیامی، اور یدی (Yiddish، شمالی یورپ کے یہودیوں کی زبان) وغیرہ۔

زندگی ایک تغیر پذیر یا میاتی حقیقت ہے جس کے پہلو میں مکان و زمان کے تغیر و تبدل کا اثر ظاہر ہوتا رہتا ہے، علم و عقل کے مدارج بلندیاں حاصل کرتے جاتے ہیں، پرانی تحقیقات کی بنیاد پر نئی حقیقیں منظر عام پر آتی ہیں اور اس سے آگے دریافت و جستجو کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے، مگر یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مختلف ملکوں اور زمانوں میں اس کتاب کی ترتیب و تنظیم ہوتی رہی لیکن کسی شخص کو بھی اسکے مندرجہ نکات اور انکی تشریح و توضیح سے مجال انکار نہ ہوسکی، اور ہر دور میں یہ نکات و اشارات انسانوں کے لیے کارآمد سمجھے جاتے رہے، یہ اور بات ہے کہ اسکی تالیفات کی شکلیں اور انداز بیان بدلتے رہے لیکن اسکے اصل اصول اپنی جگہ پر قائم رہے، اور نہ صرف یہ کہ اس کتاب کا ترجمہ مختلف عنوانوں اور طرزوں پر ہوتا رہا، بلکہ اس کی بنیاد پر بے شمار اخلاقی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں سبق آموز کتابیں لکھی گئیں،

آخر میں اس کتاب کے ابواب کا خلاصہ پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے اسکی نوعیت کا کچھ اندازہ ہوسکے گا، پنچ تنتر ذیل کے پانچ ابواب پر مشتمل ہے:۔ دوست کی فرقت وجدائی (۲) حصول دوست یا دوست سازی (۳) جنگ و امن (۴) زمانہ تنگدستی وعسرت، اور (۵) بغیر فکر سلیم کے اعمال کا انجام۔ پنچ تنتر کے ان ہی پانچ ابواب کو پہلوی یا عربی میں چودہ ابواب پر پھیلا دیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عیب گو اور نمام کی باتوں سے اجتناب (۲) بدکاروں کا انجام بد (۳) موافقت دوستاں، اس کے مقاصد و فوائد (۴) دشمنوں کے احوال معلوم کرنا اور انکے حیلوں سے ہوشیار رہنا۔ (۵) غفلت و تساہل کی مذمت (۶) آفت تعجیل و ضرر شتاب کاری (۷) دشمنوں کی بلا سے محفوظ رہنے کے لیے احتیاط و تدبیر (۸) ارباب مکر پر اعتبار نہ کرنا اور ان سے پرہیز کرنا (۹) عفو و درگذر کے فضائل (۱۰) فزوں طلبی کی برائیاں اور اسکے مذموم نتائج (۱۱) جزائے اعمال و طریق مکافات (۱۲) سکون اور وقار کی فضیلتیں (۱۳) اہل غدر و خیانت سے احتراز (۱۴) انقلاب زمانہ پر التفات نہ کرنا بلکہ قضا و قدر پر ایمان کامل رکھنا۔

مشہور مستشرقین اور اُن کی تصنیفات[1]

(جائزہ اور تعارف)

از

جناب سلمان شمسی صاحب ندوی

مستشرقین نے اپنی مہم کو چلانے اور اپنی تحقیقات کی اشاعت کے لئے ہر ممکن وسیلہ کو اختیار کیا جن میں سے چند کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے،

(۱) اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابوں کی تالیف، جن میں اسلامی نقطۂ نظر، قرآن مجید اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو موضوع بنایا جاتا ہے، جن میں سے اکثر نصوص و متون کی تحریفات پر مشتمل ہوتی ہیں،

(۲) رسائل و مجلات کی اشاعت:- جس میں اسلام اور بلاد عربیہ کے مسائل پر بحث ہوتی ہے،

(۳) عالم اسلام میں مشنریوں کا قیام:- جو بظاہر انسانی خدمت اور گرام سدھار کے نام پر کام انجام دیتی ہیں لیکن ساتھ ہی پُرخطر اور دور رس نتائج لوگوں کے دلوں میں چھوڑ جاتی ہیں ان خدمات کے تحت اسپتال، ڈسپنسریں، یونین کالج، یتیم خانوں اور مہمان خانوں کا بہت سے مقامات پر پورا انتظام موجود ہے، اس کے علاوہ مسیحی نوجوانوں کی بہت سی انجمنیں عالم اسلام

---

[1] یہ مضمون مصنف کی زیر ترتیب کتاب کا ایک ٹکڑا ہے،

میں قائم ہو چکی ہیں،

(۴) یونیورسٹیوں اور علمی سیمیناروں میں محاضرات و مقالات کے اجتماعات کا انتظام:
اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے، کہ اسلامی ملکوں کی یونیورسٹیوں اور سیمیناروں میں انھیں شرکت کی دعوت دیجاتی ہے چنانچہ قاہرہ، دمشق، رباط، کراچی اور علی گڈھ کے علمی مراکز میں انھیں اظہارِ خیال کا پوری آزادی سے موقع ملتا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں،

(۵) انھوں نے اپنے قلم کے زور سے اسلامی ملکوں کی صحافت اور وہاں سے نکلنے والے جرائد و اخبارات کی بڑی تعداد کو خرید لیا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ فرخ اور ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی کی مشترکہ کتاب "التبشیر والاستعمار" جسے استشراق کے سلسلہ میں بڑے مرجع یا (Source) کا درجہ حاصل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو،

"مسیحی کارکنوں نے مصر کی صحافت سے خاص طور سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا، اس کے ذریعہ انھیں عیسائی نظریات کی اشاعت میں جس قدر مدد ملی، وہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں مل سکی ہو، اُن کے بے شمار مضامین مصر سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوتے ہیں جن میں سے اکثر اجرت کے ساتھ اور بہت کم اعزازی طور پر چھپتے ہیں،"

(۶) اپنے ذہنی خاکوں کو عملی شکل دینے کے لئے کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے، جن میں بظاہر صرف عام عناوین سے بحث کی جاتی ہے، یہ کانفرنسیں ۱۷۸۳ء سے لے کر اب تک مسلسل منعقد ہوتی رہی ہیں۔

(۷) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopedia of Islam) کی اشاعت، جو "دائرۃ المعارف" کے نام سے مختلف زبانوں میں شائع ہوتی ہے، اور اس کے

جدید ایڈیشن برابر شائع ہوتے رہتے ہیں، عربی میں اس کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۳۳ء میں ہوا، جس کی اب تک ۱۴ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان مستشرقین نے اس کتاب میں اسلام کے نام پر زہر گھول کر خرافات و اباطیل کا ذخیرہ جمع کیا ہے، اور افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک اس کتاب کو ماخذ (Source) کی حیثیت حاصل ہوتی جاتی رہی ہے، اور اس کو کتاب الحوالہ (Reference Book) سمجھا جانے لگا ہے، جو اسلامی ثقافت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یہ مستشرقین کے مقاصد و وسائل کا مختصر سا جائزہ تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اس ضمن میں مشہور مستشرقین، اُن کی اہم تصنیفات اور رسائل کا ذکر بھی کر دیا جائے، جو سامراجی ملکوں میں اُن کی زیرنگرانی شائع ہوتے رہے ہیں،

صحافت و رسائل: (الف) ۱۷۸۷ء میں فرانسیسیوں نے مستشرقین کی ایک انجمن قائم کی، اُس کے ماتحت آسیویہ کے نام سے ایک رسالہ نکالا،

(ب) ۱۸۲۳ء میں لندن میں علوم شرقیہ (Oriential Studies) کی ہمت افزائی کی غرض سے ایک انجمن قائم ہوئی، اس کے زیرنگرانی رسالہ مجلہ الجمعیۃ الاسیویۃ الملکیۃ" شائع ہوا، اس صدی میں امریکی مستشرقین کے زیر اہتمام نکلنے والے رسائل میں مجلۃ الدراسات الشرقیۃ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ صوبہ OHIO کے شہر Combien سے شائع ہوتا تھا، اور اس کے مختلف اڈیشن روس، لندن، اور دوسرے مقامات سے شائع ہوتے تھے، معلوم نہیں اس وقت اس نام سے شائع ہوتا ہے یا کسی دوسرے نام سے، اس پر سیاسی سامراج کی پوری چھاپ تھی،

(ج) اس وقت امریکی مستشرقین کے قلم سے نکلنے والے رسائل میں مشہور یہ ہیں:-

مجلہ شئون الشرق الاوسط (The islamic world Affairs) جو بڑی حد تک سیاست سے متاثر ہے،

(د) سب سے خطرناک رسائل وہ ہیں جو امریکی مشنریاں نکال رہی ہیں، ان میں صموئیل زویمر (S. Zwemer) کے زیر ادارت نکلنے والا رسالہ العالم الاسلامی (The muslim world) خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہ رسالہ ۱۹۱۱ء میں پہلی بار نکلا، اور اب بھی (Hart Force) امریکہ سے شائع ہوتا ہے، حال میں اس کے مدیر اعلیٰ کینٹ کراج (K. cragg) تھے،

(ذ) اسی سے ملتا جلتا رسالہ (Le Mode Musulman) ہے جو ایک فرانسیسی مستشرق کے زیر نگرانی نکلتا ہے،

مشہور مستشرقین اور اُن کی تصنیفات!

اے، جے، آربرے A. J. ArBerry	مشہور انگریز مستشرق ہے، اس کی اسلام دشمنی ضرب المثل ہے. اسلامک انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں ہے، آج کل کیمبرج یونیورسٹی

کا پروفیسر ہے، وہ ہمارے معاصر مصری فاضلوں کا استاذہ چکا ہے، اس کی مشہور ترین کتابیں حسب ذیل ہیں،

۱۔ الاسلام الیوم :۔ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی،

۲۔ مقدمۃ لتاریخ التصوف :۔ ۱۹۴۲ء " " "

۳۔ التصوف :۔ ۱۹۵۰ء " " "

۴۔ ترجمۃ القرآن :۔ ۱۹۵۰ء " " "

الفریڈ جیوم A. Gaom	متعصب انگریز ہے، تعصب اُس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، لندن یونیورسٹی میں لکچرار ہے، اس کی تحریریں مشنری روح کا غلبہ ہے، اس کی تصنیفات

میں معرکۃ الآرا کتاب "الاسلام" ہے، مصری حکومت نے بہت سے نوجوانوں کو مشرقی زبانوں کی تحقیقات کے لئے اُس کے پاس بھیجا ہے۔

بارون کیرادی فو Baron carra de voux	فرانسیسی مستشرق ہے، اسلامک انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں اس کا نام اہم ترین ہے۔
ایچ - اے، آر، گب H. A. R. Gibb	انگلینڈ کا معاصر مستشرق ہے، مصر کی لنگویج اکیڈمی کا ممبر رہا ہے، آج کل امریکہ میں اسلامیات کا پروفیسر ہے، دائرۃ المعارف کے

مرتبین میں یہ بھی ہے، اس کی اہم تصنیفات یہ ہیں :-

۱- طریق الاسلام: ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے،

۲- الاتجاہات الحدیثۃ فی الاسلام: ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی ہے،

۳- المذہب المحمدی: یہ بھی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اب تک مختلف اڈیشن چھپ چکے ہیں،

۴- الاسلام والمجتمع الغربی اس کی کئی جلدیں ہیں، اس کی تالیف میں دوسرے لوگ بھی شریک ہیں،

۵- مجموعۂ مضامین :-

گولڈ زیہر Gold Zieher	علمی بددیانتی اور اسلام دشمنی کے لئے مشہور ہے، دائرۃ المعارف کی ترتیب میں اس کا بھی حصہ رہا ہے

قرآن مجید اور حدیث پر اس کی تصنیفات ہیں، اس کی کتابوں میں تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جس کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے،

جان مانی نارڈ *Mynard*	متعصب امریکی ہے، "رسالۃ دراسات الشرقیۃ" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکا ہے اس رسالہ کے مضامین اس کی زہرافشانی کے شاہد ہیں،
ایس۔ایم۔زویمر *S. M. Zwemer*	مشنری مستشرق ہے، اس لئے اسلام کے ساتھ اس کی دشمنی دوہری ہے، رسالہ "العالم الاسلامی" کا بانی اور کتاب "الاسلام

تحد لتقیدۃ" کا مصنف ہے، یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب اس کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو مشنریوں کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء لکھنؤ میں پڑھے گئے تھے، اس کی علمی اور تبلیغی سرگرمیوں کی یاد میں امریکیوں نے ایک اوقاف قائم کیا ہے، جس کے تحت لاہوتی مطالعہ اور مبلغین کی جماعت تیار ہوتی ہے،

عزیز عطیہ سوریال	مصری مسیحی مستشرق ہے، اسکندریہ کی یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے،

اور اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ہے، اسلامی تعلیمات کی تخریب میں اس کا بڑا حصہ ہے، اس کے لئے اس نے بہت سے وسائل اختیار کئے ہیں، صلیبی جنگوں سے متعلق اس کی بہت سی تصنیفات ہیں:۔

جی۔ فون گروبارم *G. Von Graev Bovem*	یہودی النسل جرمن ہے، بعد میں امریکہ میں سکونت اختیار کر لی، اور تدریس کا شغل اختیار کیا، شکاگو یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے ہیں، اس کی تصنیفات میں

اسلامی اقدار پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے، لکھنے میں بڑا ماہر ہے، اس کی مشہور کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ اسلام العصور الوسطیٰ:۔ ۱۹۴۶ء میں پہلی بار چھپی۔

۲۔ الاعیان المحمدیہ:۔ ۱۹۵۱ء میں چھپی،

۳- محاضرات فی شرح الاسلام المعاصر : ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی،

۴- دراسات فی تاریخ الثقافۃ الاسلامیہ : ۱۹۵۴ء " "

۵- الاسلام :- مختلف مقالات کا مجموعہ ہے : ۱۹۵۴ء میں چھپی،

۶- الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیہ : ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی

فلپ حتی P. K. Hitti	لبنانی مسیحی مستشرق ہے، پرنسٹن یونیورسٹی میں پہلے اسلامک اسٹڈیز کے استاد تھے، پھر اس کے ہیڈ ہوگئے، آج کل امریکہ کے وزیر خارجہ

کے کاؤنسلر ہیں، ان کی شدید کوشش رہتی ہے، کہ انسانی تہذیب کی تشکیل میں اسلام کی کوتاہی ثابت کی جائے، مسلمانوں کی طرف کسی مرتبہ و شرف کی نسبت نہونے پائے،

دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۲۹ پر الادب العربی کے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"عربوں میں ادبی زندگی کی علامتیں پہلے نہ تھیں، ان کا ظہور انیسویں صدی کے اخیر میں ہوا ہے، نئی تحریک کے قائدین کی صف اول میں لبنان کے وہ نصاری ہیں، جنھوں نے امریکی مبلغین کی کوششوں سے تعلیم کی منزل طے کر کے نئی روشنی اخذ کی"

ان کی ساری کوشش یہ رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے علم و فضل کو ناقص قرار دیا جائے ان کی رائے میں یہ کوتاہی اور کمی عصر جدید ہی میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے ہر مرحلہ میں رہی ہے ان کی یہ رائے اُن کی اپنی تصنیفات میں دیکھی جا سکتی ہے،

اُن کی بعض کتابیں یہ ہیں :-

۱- تاریخ العرب : اصلاً انگریزی میں ہے، عربی میں بعد میں ترجمہ ہوئی، پوری کتاب

اسلام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن و استہزا سے بھری ہوئی ہے،

۲- تاریخ سوریا۔

۳- اصل الدروز دیانتہم۔ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی،

اے، جے، ونیسنک A. J. Wensinck	پہلے مصر کی لسانی اکیڈیمی کا ممبر تھا، طیب حسن ہواری نے اس کو الگ کرایا، اس کے نزدیک قرآن مجید رسول اللہ صلعم

کی تصنیف ہے، انھوں نے مذہبی اور فلسفیانہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کرکے اس کو لکھا ہے، دیکھئے:- "المستشرقون والاسلام" ص ۱۷، اس کی دوسری مشہور کتاب عقیدۃ الاسلام ہے جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی،

لوی ماسنیون، L. Massignon	فرانسیسی مستشرق ہے، شمالی افریقہ میں فرانس کی وزارت نوآبادیات کا ایڈوائزر تھا، مصر کے مشنریوں کا روح

رواں ہے، اس نے دنیائے اسلام کا کئی بار سفر کیا، مصر کی لسانی اکیڈمی اور دمشق کی المجمع العلمی العربی کا ممبر، فلسفۃ التصوف اس کے امتیازی علوم ہیں، اس کی مشہور کتابوں میں الحلاج الصوفی الشہید فی الاسلام ہے، یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ اس کے مقالات و محاضرات کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی ترتیب میں اس کا بڑا حصہ ہے،

ڈی۔ بی۔ میکڈونالڈ D. B. Macdonald	امریکی مستشرق ہے، یہ بھی دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی مشہور کتابوں میں:

"تطور علم الکلام والنظریۃ الدستوریۃ فی الاسلام" مطبوعہ ۱۹۰۳ء اور "الموقف الدینی والحیاۃ فی الاسلام" مطبوعہ ۱۹۰۸ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

مجید قدوری | عراق کے عیسائی ہیں، واشنگٹن یونیورسٹی میں اورنٹیل اسٹڈیز کے ہڈآف ڈپارٹمنٹ اور مجلس علوم شرقیہ کے سرگرم رکن ہیں، یہ بھی اسلام کے خاص ناقدوں میں ہیں، ان کی شاہکار کتاب "الحرب والسلام فی الاسلام" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ مطبوعہ مقالات بھی ہیں۔

ڈی ایس، مارگولیس D.S. Margoliouth | نسلاً انگریز، اور انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں سے ہیں مصر و دمشق کی اکیڈمیوں کے ممبر رہے ہیں، ان کی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:-

۱- التطورات المبکرۃ فی الاسلام:- مطبوعہ ۱۹۱۳ء

۲- محمد و مصطلح القرآن: " ۱۹۰۵ء

۳- الجامعۃ الاسلامیہ: " ۱۹۱۲ء

نیکولسن R. A. Nicholson | مشہور انگریز مستشرق ہے، دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار ہے، مصر کی لسانی اکیڈمی کا بھی ممبر رہا ہے، اسلامی فلسفہ و تصوف اس کا خاص موضوع ہے، اس کے باوجود اس کو اسلام کے روحانی نظام ہونے سے اتفاق نہیں ہے اور اس کو وہ سطحی مذہب قرار دیتا ہے، (۱) تصوف الاسلام مطبوعہ ۱۹۱۱ء اور (۲) التاریخ الادب العربی: مطبوعہ ۱۹۳۰ء اس کی مشہور کتابیں ہیں،

ہنری لامنس | فرانسیسی مستشرق اور دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار ہے، اس کی اسلام دشمنی مشہور ہے، فرانسیسی میں اس کی دو کتابیں ہیں، "اسلام" اور طائف،

اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض کے نام اوپر آچکے ہیں:-

۱۔ حیاۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آرنلڈ ٹوئن بی: A. Toynbee

۲) الاسلام، ولیم میور: William muir

۳۔ دین الشیعہ الفرڈ گیوم: A. G. om

۴۔ تاریخ شارل الکبیر ڈونالسن: D. M. Donolson.

۵۔ الاسلام: ترپن: Bishop Turpim.

۶۔ الاسلام تحد لعقیلاۃ ہنری لامنس F. Lammens.

۷۔ دعوۃ المسلمین زویمر: S. M. Zwemer

۸۔ الاسلام الیوم کینتھ کراج K. Cragg.

۹۔ ترجمۃ القرآن اے جے آربری۔ A. J. Arbery

۱۰۔ تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی، گولڈزیہر Gold Ziehir

۱۱۔ تاریخ العرب " " "

۱۲۔ الیہودیۃ فی الاسلام فلپ حتی P. Hitti

۱۳۔ عقیدۃ الاسلام ابراہیم کاش Abraham Kash

۱۴۔ الحلاج الصوفی الشہید فی الاسلام ونسنک Wensnik

۱۵۔ الحرب والسلام مجید قدوری

۱۶۔ تطور علم الکلام والفقہ والنظریۃ الدستوریۃ فی الاسلام۔ لوی ماسینون: L. Massignon

۱۷۔ الاتجاہات الحدیثہ فی الاسلام	میکڈونالڈ	Mecdo Nald
۱۸۔ طریق السلام	اے آر گب	A.R. Gibb
۱۹۔ التصوف فی الاسلام	" "	"
۲۰۔ مصادر تاریخ القرآن۔	نیکولسن	Nicholson
۲۱۔ اصول الاسلام فی البئۃ المسیحیہ۔	آرتھر جیفری	Arthur Jeffeiry
۲۲۔ مقدمۃ القرآن۔	آر۔ بل	R. Bell
۲۳۔ التطورات المبکرہ فی الاسلام۔	"	" "
۲۴۔ محمد و مطلع الاسلام	مارگولیس	D. S. Marglio uo
۲۵۔ الاسلام	"	" "
۲۶۔ الجامعۃ الاسلامیّہ		
۲۷۔ تنظرۃ الی الاسلام	.	. . . .
۲۸۔ اسلام العصور الوسطی	اریک بتمان	A. Bel mon
۲۹۔ الاسلام	جی، ون، گرونیبام	
۳۰۔ الاعیاد المحمدیہ	" "	Von Greevleaun
۳۱۔ الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیۃ	" "	" "
۳۲۔ دراسات فی تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ	" "	" "

مستشرقین کا سب سے بڑا کارنامہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ہے، گو یہ بھی بددیانتی سے خالی نہیں لیکن اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے، اس کے اہم مقالہ نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱- ابراہیم کاش — الیہودیہ فی الاسلام کا مصنف ہے،

۲- سی سی۔ ایڈمز C.C. Adoms — امریکن یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے، الاسلام فی التجدید فی مصر کا مصنف ہے،

۳- ادوارفرمان E Ferman — "تاریخ المسلین وفتوحاتہم" کا مصنف ہے،

۴- ایڈون کیلوری E Calverry — رسالہ العالم الاسلامی کے اڈیٹر رہ چکے ہیں انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں بھی حصہ لیا، اور قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں استاد رہے،

۵- اریک شرود — انھوں نے "اُمت محمدؐ" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں کتاب لکھی تھی،

۶- ایلڈر The mus lim world Elder کے اڈیٹر ہیں،

۷- الفرڈ کارلٹن A. Carllon

۸- ال ازنبرج L.Eisembeeg

۹- ڈبلو۔ ایوانو W. Iwanow

۱۰- بانجر F. Balinger

۱۱- اے۔ باگیرد۔ A. Baglare.

۱۲- جے۔ بارتھ، J. Barth

۱۳۔ آر۔ پیرٹ	R. Peret -
۱۴۔ آر۔ بسٹ	R. BessT-
۱۵۔ بشپ،	Beshop
۱۶۔ سی۔سی۔ برگ،	C.C. Berg
۱۷۔ ایچ۔ایچ۔ برو	H. H. Brau
۱۸۔ آئی۔ ال۔ پرنسل	I.L Previncsal
۱۹۔ ار۔ بل،	R. Bell

موصوف نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن میں اصول الاسلام فی البیئۃ المسیحیہ مطبوعہ ۱۹۳۶ء اور مقدمۃ القرآن مطبوعہ ۱۹۵۴ء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۲۰۔ ام۔ پلنسر	M. Plenser
۲۱۔ ایف، بول	F. Buhl.
۲۲۔ وی، ٹی، بوشنر،	V. T. Buchner
۲۳۔ جے، پیدرسن	J. Pederson
۲۴۔ ایس۔ ایچ، بیکر	
۲۵۔ اے۔ ایس۔ ترتیون	A.S. Teiton
۲۶۔ ارچوڈی،	R.chudi
۲۷۔ ٹی، ایچ ٹائی ناہال،	T. H. Joynaball
۲۸۔ گارڈ فرائی	Gourd Fray
۲۹ ڈبلیو جورکومن	W. Jorkomon

۳۰-	جویڈی	Guidi.
۳۱-	بی۔گوئیل	B Goil
۳۲-	گی۔ڈوسوڈ،	G. Dussaud.
۳۳-	ڈی،آل، ڈلاویڈا،	D.L. Dell vid
۳۴-	ڈی۔ بور۔	D. Boer.
۳۵-	ڈیٹیرشی۔	Dielec
۳۶-	ای ڈینیٹ	E. Dinet
۳۷-	آر روبرٹ	R. Robert

ان کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں،

۱ القوانین الاجتماعیة فی القرآن،

۲- القرآن والتوراة فی القوانین الاجتماعیة، (مطبوعہ ۱۹۲۵ء)

۳۸	ریکنڈارف	Recenderf.
۳۹	کے،ایف،زیٹرسین،	K.F. Zettersa.
۴۰	او-اسپایس،	O. Spies
۴۱	ایم،اسٹریک،	M. Streck.

ان کی کتاب تاریخ الحروب الصلیبیہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی،

۴۲	ایچ۔اسپیر	H. Spyer.
۴۳		Snouk Horgzcvji
۴۴		R. Slart-meul

۴۳ - بی ۔ شریک ، B. Schrecch

۴۴ - جے ۔ شیلفر J. Shelfar

۴۵ - ایس ، مرسر S. Merser.

۴۶ - C. Von Areudonk.

۴۷ - H. Fuches.

۴۸ - کے ، فولرز K. Vollers.

۴۹ - ایف ، ووکا ، F Vocca

۴۹ - اے ، فیشر ، A. Fecher

۵۰ - کارل بروکلمان Karl Brockelman.

موصوف اصلاً جرمن ہیں، جرمن زبان میں عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے، تاریخ الشعوب الاسلامیہ بھی انہی کی کتاب ہے ، روس کی مجلس علمی کے رکن بھی رہ چکے ہیں ،

۵۱ - آر ۔ اے ، کرن ، R. A. Kern

۵۲ - کور ۔ A. Cour.

۵۳ - کوشی ولسن ، K. Wilson.

۵۴ - کریمرز J. H. Kromers.

۵۵ - لانگ ورتھ ڈامیس ، Longwarth Dames

۵۶ - T. Luwicri.

۵۷ - Bernard Lewies

ان کی مشہور کتاب العرب فی التاریخ ہے ، یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی ہے ، آجکل

صاحب کتاب لندن میں پروفیسر ہیں،

۵۸ - G. Marsais

۵۹ - T. Menzel

۶۰ - Morrison

۶۱ - V. Minorski

۶۲ - نیلنو Naleno

۶۳ - H. S. Nebredy

۶۴ - ہارٹنر HarTner

۶۵ - ہارٹمان Harman.

۶۶ - ان کی کتاب الاسلام والقومیۃ" شائع ہوئی ہے،

۶۷ - ایچ۔ ڈیون H. D. unne

۶۸ - ایچ ریڈ، H. Reed

موصوف ٹرکی میں عیسائی مشنری کا کام انجام دے کر بعد میں امریکن یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے، اور کئی کتابیں لکھیں،

۶۹ - M. TouTsma

۷۰ - J. Torovits.

۷۱ - A. Yongman.

۷۲ - A. J. Huwsman

۷۳ - B. Heller.

۷۴۔ Huart

۷۵۔ ام وات M. wat.

ان کی کتاب "تجرد الاختیاز فی الاسلام" شہرت عام حاصل کر چکی ہے،

۷۶، جے واکر، J. Walker

۷۷، پی، وِلک P. Willeck

۷۸، T. H. Wair

۷۹، C. young

۸۰، J. Welhouser.

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے علاوہ انھوں نے اس کا اختصار

۱۔ موجز دائرۃ المعارف الاسلامیہ Short Encyclopedia of Islam

۲۔ دائرۃ المعارف مں قسم الدین، Encyclo Pedia of Religion and Ethicks

۳۔ دائرۃ المعارف العلوم الاجتماعیہ Encyclopedia of Social Science

۴۔ اور دراسۃ التاریخ Study in History

لیکن ان سب کو اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

کتابیات

۱۔ التبشیر والاستعمار، (عربی) ڈاکٹر عمر فروخ ــــ ومصطفےٰ خالدی

۲۔ المستشرقون والاسلام، عربی طیب حسن ہواری
۳۔ الاسلام غداً " دکتور محمد البہی
۴۔ الاسلام علی مفترق الطریق " محمد اسد (لیوپولڈ)
۵۔ المبشرون والمستشرقین، " ڈاکٹر محمد البہی
۶۔ الاستشراق، ماله وما علیہ ڈاکٹر سباعی
۷۔ حرکات ھدامة، ×
۸۔ orientalstudies R. K. Siddiqi
۹۔ اسلامی ممالک میں مغربیت کی کشمکش، سید ابوالحسن علی ندوی،
۱۰۔ السنة ومکانتھا فی التشریع الاسلامی، ڈاکٹر سباعی،
۱۱۔ رسائل و مجلات،

سلسلۂ حکمائے اسلام

حصۂ اوّل و دوم

یوں تو اردو میں مشاہیر حکمائے اسلام کے حالات میں متعدد الگ الگ کتابیں موجود ہیں، الغزالی، امام رازی، ابن رشد تو اسی ادارہ کی کتابیں ہیں، لیکن کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی، جس میں ان سب کے حالات یکجا کر دیئے گئے ہوں، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، جس میں اُن کے حالات و سوانح و اخلاق کے ساتھ اُن کی ہر قسم کی فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، حصۂ اوّل: قیمت :- ۔/۷

حصۂ دوم: " ۔/۸ "منیجر"

جہانگیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط

از جناب کبیر احمد صاحب جائسی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شاہانِ صفویہ اور مغلوں کے تعلقات شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں زیادہ مستحکم ہوئے، جب وہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہندوستان چھوڑ کر ایران جانے پر مجبور ہوا، ایران میں شہنشاہ طہماسپ نے اس کے شایان شان پذیرائی کی اور ہر طرح سے اس کی مدد کر کے اس کے تخت و تاج کو واپس دلانے کی پوری کوشش کی، شاہ طہماسپ کی اس ہمدردی اور محبت کا ہمایوں عمر بھر معترف رہا، اس کے انتقال کے بعد جب جلال الدین اکبر تخت نشین ہوا، تو شاہانِ صفویہ سے اس کے بھی بڑے اچھے تعلقات رہے، اور دونوں میں مراسلت و مکاتبت بھی رہی، تاریخوں میں ان کے چند خطوط ملتے ہیں[1]، اکبر کے انتقال کے بعد جب نور الدین جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر ایران کے بادشاہ سے تعلقات شگفتہ رکھے اور جہانگیر اور شاہ عباس میں مراسلت اور مکاتبت کی رسم جاری رہی، ان دونوں بادشاہوں کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عباس کے قندھار پر بزور قبضہ کے بعد ان کے تعلقات کی بنیادیں ہل گئیں، اس سلسلہ میں قندھار کے قضیہ پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے، اگر جہانگیر، شاہجہاں کی بغاوت فرو کرنے میں نہ لگ جاتا تو ممکن تھا کہ قندھار کو شاہ عباس سے بزور واپس لینے کی کوشش کرتا، قندھار کے مسئلہ کو

[1] زندگانی شاہ عباس، ج ۴، ص ۸۲

نصر اللہ فلسفی نے زندگانی شاہ عباس اول میں تفصیل سے بیان کیا ہے[1]، یہاں اسکا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس زمانے میں شاہانِ صفویہ کی حکومت ایران میں قائم ہوئی اُس زمانے میں قندھار، خراسان، مرو، خوارزم، سیستان، کابل اور بدخشاں، ابو الغازی سلطان حسین میرزا بایقرا کے زیرنگیں تھے، جو امیر تیمور کے اخلاف میں تھا، سلطان حسین کے انتقال کے بعد ۹۱۲ھ میں جانشینی کے مسئلہ پر اس کے لڑکوں میں اختلاف ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان حسین کی سلطنت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی، اور خراسان پر محمد خاں شیبانی کا قبضہ ہو گیا۔ یہ چنگیز خاں کے لڑکے جوجی خاں کے اخلاف میں تھا۔ قندھار پر ظہیر الدین بابر کا قبضہ ہوا جو تیمور کے اخلاف میں اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ہے۔ بابر نے اس کی حکمرانی اپنے لڑکے میرزا کامران کے سپرد کر دی تھی،

۹۴۳ھ میں شاہ طہماسپ اول نے قندھار کے قلعہ پر فوج کشی کی، وہاں کے لوگ مدافعت نہ کر سکے اور قندھار شاہ طہماسپ اول کے قبضہ میں چلا گیا۔ قبضہ کے بعد جب طہماسپ قزوین واپس گیا تو میرزا کامران نے لاہور سے ایک بڑا لشکر ساتھ لیا اور قندھار پر حملہ کر کے اس کو واپس لے لیا، شاہ طہماسپ اس وقت سلطان سلیمان خاں سے جنگ میں مصروف تھا، اسلیے قندھار کے معاملہ پر توجہ نہ کر سکا، اور وہ مرزا کامران کے قبضہ میں رہا،

بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں اس کے تخت و تاج کا وارث قرار پایا، لیکن جلد ہی اس کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا پڑا، اس نے شاہ طہماسپ سے ایران میں پناہ گزیں ہونے کی درخواست کی، جو قبول ہوئی، اور ہمایوں ایران چلا گیا،

---

[1] زندگانی شاہ عباس، ص ۴۹ تا ۱۰۸ ج ۴

یہاں ہمایوں کے کچھ دنوں قیام کے بعد شاہ طہماسپ نے اپنے ایک لڑکے سلطان مراد مرزا کو ایک بڑا لشکر دے کر ہمایوں کے ساتھ کیا کہ وہ ہندوستان پر دوبارہ قبضہ میں اس کی امداد کرے، ہمایوں، شاہ عباس کی اس ہمدردی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے وعدہ کیا کہ جب وہ دوبارہ اپنی سلطنت پر قابض ہو جائے گا تو قندھار کو ایرانی حکومت کا ایک حصہ تسلیم کرے گا، لیکن اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس وعدہ کو پورا نہیں کیا، یہاں تک کہ ۹۶۲ھ میں کوٹھے سے گرنے سے اس کی موت ہوگئی،

ہمایوں کے انتقال کے بعد شاہ طہماسپ نے قندھار کو بزور شمشیر واپس لینے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور اپنے بھتیجے سلطان حسین میرزا کو اس مہم پر متعین کیا، اس نے ۹۶۵ھ میں قندھار پر قبضہ کر کے اس کو ایرانی سلطنت کا جزو بنا لیا،

شاہ عباس جب تخت نشین ہوا تو اس کو اپنے کئی مخالفوں کا سامنا کرنا پڑا، اس زمانے میں قندھار پر دو صفوی شاہزادوں کی حکومت تھی، جو بیرونی حملہ آوروں سے سخت پریشان تھے، مگر اس وقت شاہ عباس خود مخالفوں کو زیر کرنے میں مشغول تھا، اس لیے ان شہزادگان کو اس سے کسی قسم کی مدد ملنے کی امید نہ تھی، اس لیے وہ مجبوراً اکبر کی پناہ میں چلے گئے، اور قندھار کی حکومت انھوں نے اکبر کے سپرد کر دی، اس طرح ۱۰۰۳ھ میں قندھار پھر قلمرو ہند میں شامل ہو گیا، شاہ عباس، اکبر کا ایک بزرگ کی طرح ادب کرتا تھا، اس لیے مخالفوں کو زیر کرنے کے بعد بھی اس نے قندھار پر حملہ نہیں کیا، اور اس کو اکبر کے پاس رہنے دیا،

اکبر کے انتقال کے بعد جب جہانگیر تخت و تاج کا وارث ہوا، اس زمانے میں شاہ عباس آذربائیجان اور گرجستان میں ترکانِ عثمانی سے برسرِ آزما تھا، مگر جنگ میں مشغول ہونے

کے باوجود اس نے جہانگیر کو تعزیت کا خط لکھا اور اپنے سفیر کے ذریعہ اس کو بھیجا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں سفراء کی آمد و رفت شروع ہو گئی، اور شاہ عباس براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے قندھار کی واپسی کا مطالبہ کرتا رہا۔

۱۰۲۷ھ میں جہانگیر نے خان عالم کو اپنا سفیر بنا کر ایران بھیجا، اور اس کے ہاتھ خط کے ساتھ گراں بہا تحائف بھی بھیجے، یہ سفیر شاہ عباس کے پاس دو سال تک مقیم رہا ۱۰۲۹ھ میں اسے ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی، اور شاہ عباس نے خان عالم کے ساتھ اپنے ایک سردار زینل بیگ بیگدلی شاملو کو خط اور بیش قیمت تحائف دے کر جہانگیر کے پاس بھیجا۔ شاہ عباس نے اس سفیر کے ہاتھ جو خط بھیجا تھا اس میں قندھار کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہیں تھا، لیکن اپنے سفیر کو زبانی سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں جہانگیر اور اس کے درباریوں سے بات چیت کرے۔ شاہ عباس نے خان عالم سے چلتے وقت کہا تھا:

"خصوصیت و یگانگی میانۂ ما حضرت پادشاہ والا جاہ زیادہ از آنست کہ با یکدیگر مضائقہ با لکاء و مملکت داشتہ باشیم، لیکن در باب قندھار کہ داخل خراسان و ملک موروثِ ایں برادر دوستی دوست است، مردم دور و نزدیک کہ چشم بر امور متعارفۂ صوری دارند و از عالمِ معنی بیخبر، سخنانِ لایعنی در محافل و انجمنہا بر زبان آوردہ حمل بر نوعِ دیگر می نماید، سزاوارِ محبت و مقتضاءِ طرفین آنست کہ آں برادر کامگار بجہت رفعِ طعنِ اضداد آں ملک را کہ از ولایت ہندوستاں بغایت دور و در میانہ سنگِ شاہراہِ محبت است، بایں برادر مرحمت نمایند، باز گذارد و اگر باز گذاشتنِ آں بر طبعِ شریفِ آں حضرت بسیار دشوار باشد، ما رضای خاطر انور را بر مطالب عالیۂ دنیوی راجح می دانیم، اما برسم سیرو تشکار بآں حدود

خواہیم آمد کہ چند روزی باتفاق منسوبان آنحضرت در شکارگاہ ہای آں ولایت بنشاط سیر و شکار پرداختہ باز گردیم، و از منسوبان آنحضرت راہ و رسم مہمان پذیری و میزبانی بظہور آید و بر عالمیان ظاہر گردد کہ باز گذاشتن آں ملک بایشان محض خصوصیت و یگانگی است، و درمیانہ مغایرت و جدائی نیست[۱]"

شاہ عباس کا سفیر زینل بیگ لاہور آیا جہاں جہانگیر مقیم تھا، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو تعظیم و تکریم کے مراسم ادا نہیں کیے، صرف خط اور تحائف جہانگیر کے سامنے پیش کر دیے، اس پر جہانگیر کو سخت تعجب ہوا، اور بہت برہم ہوا، اس نے درباری آداب ادا کرنے کی طرف زینل بیگ کو توجہ دلائی اور حکم دیا کہ جس طرح دوسرے سفرا دربار کے مراسم ادا کرتے ہیں وہ بھی ادا کرے، مگر اس نے نہیں کیا، چند ہی دنوں کے بعد جہانگیر جشنِ ولادت منانے کے لیے لاہور سے دہلی چلا گیا، اور جاتے وقت ایرانی سفیر کو واپسی کی اجازت بھی نہ دی، زینل بیگ کو چونکہ قندھار کے مسئلہ میں جہانگیر اور اس کے درباریوں سے کوئی صاف جواب نہیں ملا تھا، اس نے یہ طے کر لیا کہ بلا اجازت ایران چلا جائے، لیکن کچھ تحائف جو اس کے ساتھ نہ آسکے تھے، اب موصول ہوئے، اس لیے وہ مجبوراً ان کو پیش کرنے کے لیے دہلی گیا، وہاں بھی اس کو قندھار کے سلسلہ میں کوئی صاف جواب نہیں ملا، اس نے ان تمام معاملات سے شاہ عباس کو مطلع کیا، شاہ عباس نے سمجھ لیا کہ اب مروت اور محبت سے قندھار ہاتھ آنے والا نہیں، اس لیے ۱۰۳۱ھ میں خراسان گیا اور وہاں سے سیر و شکار کے بہانہ سے عازمِ قندھار ہوا، اس زمانے میں جہانگیر کی طرف سے قندھار کا حاکم عبدالعزیز خاں تھا، اس کو شاہ عباس نے یہ پیغام بھیجا:-

---

[۱] بحوالہ زندگانی شاہ عباس، ج ۴، ص ۹۰، چاپ تہران ۱۳۳۹ھ

"...... چون در سفر خیر اثر خراسان کہ بنا بر مصالح ملکی اتفاق افتادہ از فرط شوق سیر و شکارِ آن حدود دیم، طریق آنکہ توجہ موکب ہمایون را بآن طرف محض سیر و شکار تصور نمودہ از روی یکدلی و یگانگی باستقبال آمدہ سعادت رکاب بوسی دریابند، کہ چند روزی کہ درین حدود بشکار و سیر و پرداختیم، ایشان نیز در رکاب اشرف بودہ از جانب برادر کامگار میہمان پذیر بودہ لوازم میزبانی بظہور آوردند و خاطر مطمئن و آسودہ دارند کہ سوای اعزاز و احترام نسبت بملازمان حضرت پادشاہ والاجاہ برادر بجان و دل برابر امری محظور خاطر صفا آئین نیست، و غرض اصلی از نہضت بنوعی کہ بجانِ عالم گفتہ بودیم، آنست کہ بر عالمیان بتخصیص معاندان او زبکیہ قرب و جوار طرفین ظاہر گردد کہ مملکتِ او شما یکی است، و درمیانہ جدائی نیست و حمل بر نوع دیگر نکنند[1] ..."

شاہ عباس کے اس پیغام کے جواب میں عبد العزیز خاں نے لکھا کہ وہ اس ارادہ سے باز رہے، اور واپس چلا جائے، ورنہ وہ اور اس کے ساتھی جنگ سے دریغ نہ کریں گے، شاہ عباس قندھار پر حملہ کے لیے بہانہ ڈھونڈھتا تھا، اس جواب کے پاتے ہی قندھار کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ کر لیا، جہانگیر کو اس کی خبر ملی تو اس کو بڑا تعجب ہوا، اس کو شاہ عباس جیسے دوست سے اس طرح کے حملے کی توقع نہ تھی، اس لیے اس واقعہ کا جہانگیر پر بڑا سخت رد عمل ہوا، بقول نصر اللہ فلسفی "چون خبر پیش رفتن شاہ عباس را بسوی قندھار شنید مصمم شد کہ با قوای فراوان بسوی ایران آید، و سوگند خورد کہ پس از نجات دادن قندھار تا اصفہان پیش رود[2]"

---

[1] بحوالہ زندگانی شاہ عباس، ج ۴، ص ۹۹-۱۰۰ [2] ایضاً ص ۱۰۰

اس کے بعد جہانگیر نے قندھار پر حملہ کے لیے عجلت کے ساتھ اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور اس کی کمان شاہزادہ خرم (شاہجہاں) کے سپرد کی لیکن اسی زمانے میں نورجہاں اور خرم کے اختلافات حد سے زیادہ بڑھ گئے، اور وہ جہانگیر سے بغاوت کر بیٹھا جہانگیر اسکی بغاوت کو فرو کرنے میں مشغول ہوگیا، اس لیے اس کی فوج قندھار پر حملہ نہ کر سکی، شاہ عباس نے قندھار کو فتح کرنے کے بعد دو بڑی بڑی خالص سونے کی کنجیاں بنوائیں اور محبت آمیز خط کے ساتھ جہانگیر کے پاس بھیجیں، یہ خط تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ خط مجھکو ایک قدیم بیاض میں بھی ملا ہے، اس کے ساتھ اسی سلسلہ کے دو خطوط ایسے بھی ہیں جو ابھی تک کہیں میری نظر سے نہیں گذرے، اس لیے بیاض کا سرسری تعارف کرانے کے بعد وہ خطوط نقل کیے جاتے ہیں،

یہ بیاض انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانہ میں ہے، اور اس کا نمبر متفرقات ۵ تقطیع "۵ × ۸" کی ہے۔ اس کے اوراق پر زیادہ تر انتخابِ اشعار درج ہے، بیاض میں حسب ذیل چار ترقیمے ہیں:۔

(۱) تحریر فی التاریخ ۲۴ر شہر محرم الحرام ۱۰۲۳ھ در دار الخلافہ آگرہ تحریر یافت۔

(۲) تمت، تمام شد، روز پنجشنبہ در مقام قلعہ ماندو لب حوض چنبل تاریخ ۱۹ر ۱۰۲۶ھ۔

(۳) تاریخ شانزدہم شہر رمضان المبارک ۱۰۵۹ھ در دار المومنین حیدر آباد قلمی گردید

احقر الفقیر علی اکبر سبزواری

(۴) ، شہر ربیع الاول ۱۰۲۰ھ ...... در بلاد آگرہ تحریر یافت۔

ان ترقیموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیاض چار مختلف بیاضوں پر مشتمل ہوگی، بیاض پر کوئی مہر نہیں ہے، اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا اصل مالک کون تھا، لیکن

دو ترقیمے اس کا آگرہ میں لکھا جانا ثابت کر رہے ہیں، اور جہانگیر اور شاہ عباس کے خطوط کی شمولیت سے اور بھی اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ بیاض کسی ایسے شخص کی ملکیت رہی ہوگی جس کا دربار سے قریبی تعلق رہا ہوگا، مگر سردست اس قیاس کی کوئی داخلی اور خارجی شہادت پیش کرنا مشکل ہے، اس بیاض میں چند اوراق کے بعد سب سے پہلے جو خط ملتا ہے اسکا عنوان ہے "نقل کتابت شاہ عباس بحضرت ظل اللہ شاہ نور الدین جہانگیر"

اس خط کا متن درج ذیل ہے، مگر اس متن اور اُس متن میں قدرے اختلاف ہے جو زندگانی شاہ عباس جلد چہارم ص ۱۰۳ - ۱۰۴ پر درج ہے، چونکہ اس وقت متن کو مرتب کرنا مقصود نہیں ہے، اس لیے یہاں زندگانی شاہ عباس سے یہ خط نقل کیا جاتا ہے۔

"نسایم و عواتی کہ از نفحات اجابت آن غنچۂ مراد شگفتہ نکہت فزای مشام یگانگی باشد، و لوامع معانی کہ از لمعات خلوص انجمن اتحاد منور گشتہ ظلمت زدای غایلۂ بیگانگی گردد، عطر بزم خلت و ولای اعلی حضرت ظل الٰہی و شمع جمع آن نور پرور والٰہی گردانیدہ و مشہود رای انور و مکشوف ضمیر منیر ضیا گستر میگرداند کہ بر دل دانش پسند و خاطر آسمان پیوند آن برادر بجان برابر کہ آئینہ چہرۂ دانش و بینش و مرآت جمال حقایق آفرینش است منعکس پذیر خواہد بود کہ بعد از سنوح قضیۂ ناگزیر نواب جنت مکان علیین آشیان شاہ بابام انار اللہ برہانہ، چہ قسم قضایا در ایران روی دادہ بعضی ممالک از تصرف منسوبان این دودمان ولایت مکان بیرون رفتہ بود، چون این نیازمند درگاہ بی نیاز متقلد امور سلطنت شد، بیمن توفیقات الٰہی و حسن توجہ دوستان انتزاع جمیع ملک کہ در تصرف مخالفان بود مید انستیم، معترض آن نشدہ از عالم اتحاد و برادری سر مد بود یم کہ ایشان نیز بطریق آبا و اجداد جنت مقام خود در تفویض آن

توجه مبذول فرمایند، چون بتغافل گذرانیدند مکرر، بنامه و پیام و کنایه و صریح تصریح
طلب آن نمودیم که شاید در نظر هست، ایشان این ملک حقیر قابل مضایقه نبوده،
مقرر فرمایند که بتصرف منسوبان این دودمان داده، رفع طعن اعدای و بدگویان
و قطع زبان درازی عیب جویان گردد، جمعی تیسیر این امر را در عهدهٔ تعویق و تاخیر
انداختند، و چون حقیقت این گفتگوها در میان دوست و دشمن اشتهار یافت
و از آن جانب جواب مشعر به رد و قبول نرسید، بخاطر عاطر رسید که طرح سیر و شکار
قندهار اندازیم، شاید بدین وسیله گماشتگان آن برادر نامدار کامگار از روی
روابط الفت و خصوصیتی که درمیانه مسلوک است، موکب اقبال را استقبال
نموده بخدمت اشرف فائز گردند، و مجدداً بر عالمیان رسوخ قواعد یگانگی
طرفین ظاهر شده باعث زبان کوتهی حاسدان و بدگویان شود، بدین عزیمت
بی یراق قلعه گیری متوجه شده، چون بالکای فراه رسیدیم منشور عاطفت مبنی بر
اظهار ارادهٔ سیر و شکار قندهار بحاکم آنجا فرستادیم که مهمان پذیر بوده باشد، و عزت
آثار خواجه باقی کرکیراق را نیز طلب فرموده بحاکم و امرای که در قلعه بودند پیغام دادیم
که میانه اعلی حضرت پادشاه ظل الله و نواب همایون ما جدائی نیست و الکائی که بدست
از همدیگر می دانیم و بطریق سیر متوجه آن صوبیم، نوعی نکنند که کلفت خاطری بهم
رسد، ایشان مضمون حکم و پیغام مصلحت انجام را بگوش حقیقت نیوش نشنیده
و مراسم الفت و اتحاد جانبین را منظور نداشته اظهار تمرد و عصیان نمودند، و چون
بحوالی قلعه رسیدیم باز عزت آثار مشار الیه را طلب فرموده آنچه لازمهٔ نصیحت
بود با و گفته فرستادیم و تا ده روز دیگر عساکر منصوره را قدغن فرمودیم که پیرامون

حصار نگرونند، نصائح سودمند نیامده، در مخالفت اصرار نمودند، چون بیش ازین مسامحه گنجایش نداشت، باوجود عدم اسباب قلعه گیری بلشکر قزلباش بتسخیر قلعه مشغول شده ودر اندک فرصتی غازیان برج و باره را با زمین هموار نموده کار بر اهل قلعه تنگ شده امان خواستند، ما نیز بیمان روابط محبت را که از قدیم الایام فیما بین این دو سلسلهٔ رفیعه مسلوک بوده، و طریقهٔ برادری که مجدداً از زمان میرزائی آن اورنگ نشین بارگاه جاه و جلال میانهٔ ایشان و نواب همایون ما بنوعی استقرار یافته که رشک فرمای سلاطین روی زمین است، منظور داشته بمقتضای مروت جبلی تقصیرات و زلات ایشان را بعفو مقرون فرموده مشمول عواطف و عنایات سالماً غانماً باتفاق رفعت پناه نظاماً حیدر بیگ یوزباشی، که از صوفیان صادق قدیم این درگاه است، روانهٔ درگاه معلی گردانیدیم، حقا که بنیاد وداد و اتحاد موروثی و مکتسبی از جانب این ولاجوی نه بمرتبهٔ مشید و مستحکم است که بجهت صدور بعضی امور که بموجب تقدیر از مکمن امکان بمنصهٔ ظهور آمده باشد خلل پذیر گردد:

میانِ ما و تو رسم جفا نخواهد بود بجز طریقهٔ مهر و وفا نخواهد بود

مرجو آنکه از آن جانب نیز بهمین شیوهٔ مرضیه مسلوک بوده بعضی امور جزئیه را منظور انظار خجسته آثار نفرموده اگر خدشهٔ بر عارض الفت ظاهر شده باشد، بحسن عطوفت ذاتی و محبت ارثی در ازالهٔ آن کوشیده، گلشن همیشه بهار خلت و یگانگی را سرسبز و خرم گردانیده همگی همت گردون اساس بتاکید قواعد وفاق و تصفیهٔ مناهل اتفاق که نظام بخش انفس و آفاق است، مصروف فرمایند و کل ممالک محروسهٔ ما را بخود تعلق دانسته بهر کس خواهند شفقت فرموده اعلام بخشند، که بلا مضایقه با او سپرده میشود، این جزویات را خود چه قدر

و اعتبار باشند، امرا و حکامی کہ در قلعہ بودند اگرچہ مرتکب امری چند کہ منافی مراتب دوستی بود شدند، اما آنچہ واقع شدہ است از جانب ماست، و ایشان لازمۂ نوکری و شرط جانسپاری بتقدیم رسانیدہ اند، بیقین کہ آنحضرت نیز شفقت شاہانہ و عنایت پادشاہانہ شامل حال ایشان خواہند فرمود و ما را شرمندہ نخواہند ساخت، زیادہ چہ اطناب نماید، ہموارہ چتر فرقد سای ہم آغوش تائیدات غیبی باد۔"

اس کے بعد اسی صفحہ پر دوسرا خط اس عنوان سے ہے: "نقل کتابت شاہ عباس کہ بہ بندگان حضرت نورالدین جہانگیر نوشتہ شد" جس کا متن حسب ذیل ہے:-

[ص ۱۴] "برادر عزیز بجان برابر، آن پادشاہ دانشور عاقبت اندیش، سعادت یار منظور انظار حضرت آفریدگار واضح لایح باشد کہ چون از بوقلمون روزگار چنان واقع شد کہ قندھار را صوفیان صافی طویت (؟) این دودمان علیہ بتصرف درآوردند ہرچند خود این معنی راضی نبود، اما خود انصاف دہند کہ در عالم یگانگی نگہداشت قندھار (کلمہ ای از بین رفتہ است) و در بود با وجود عذرخواہی نمودہ می باید کہ اگر خواہند اصفہان و خراسان را پیشکش ملازمان ایشان [عبارت ص ۱۴ براین کلمہ تمام شود، بعد از بیست و چند اوراق، ورقی بیاید کہ بر آن مکتوبی بعنوان "نقل جواب مراسلۂ شاہ عباس کہ بہ بندگان حضرت نوشتہ" مندرج است، قبلاً سطر چند ہم ہست کہ جزو آخرین مکتوبی معلوم میشود، گمان غالب بندہ این است کہ آن عبارت مربوط با این مکتوب است بندہ آن عبارت را اینجا می نویسد] نماید شنیدہ شد کہ در لاہور جار زدہ اند کہ ہیچکس نام قندھار نبرد بلکہ بگوید کہ ہم اصفہان و عراق است، ہر گاہ پا شدت میسر باشد چہ تصدیع می کنند چون بیداند؟ ([بخواہند؟] ہر جا کہ فرمایند قرچغۂ غلام قورچی آہنگ رو بروی لشکر شود:

دم از مہر زن با کمین دہ پیام　　　حکایت براین ختم شد والسلام

یہ خط میری نظر سے کسی بھی تاریخ کی کتاب میں نہیں گذرا۔ اگر یہ خط صحیح ہے اور اس کا متن بالکل ٹھیک نقل ہوا ہے تو پھر ہم کو جہانگیر اور شاہ عباس کے تعلقات پر پھر سے نظر ڈالنی ہوگی۔ اس سلسلہ کا سب سے دلچسپ خط وہ ہے جو اس عبارت کے بعد اس بیاض میں درج ہے۔ ہم اس موقع پر اس کی نقل درج کرتے ہیں۔ بعد ازاں اپنی گذارش پیش کریں گے۔

نقل جواب مراسلۂ شاہ عباس کہ بندگانِ حضرت نوشتہ:-

"مضمون نامۂ بلاغت میمون برادر عزیز ارجمند خلاصۂ خاندانِ حشمت و عزت شاہ عباس بخاطر ملکوت ناظر بہجت تازہ روی نمود، آنچہ درباب تدبیرات جنگ و صف کشیدن نوشتہ اند چہ بہ ازیں دل چناں میخواہد کہ ایں سانحہ چنان بمعرکہ آید، شایانِ بزرگ گروہ ہای ایزدی باشند۔ آنچہ در اظہارِ عرض تحمل بزرگی خود ساختہ بود ایں لائق بزرگاں و علانژادان نبود۔ خاطرِ ہمایوں را بس گران آمد، ہرچہ عیان است چہ حاجتِ بیانست، وقتی کہ بندگان حضرت صاحب‌قرانی ملکہای عراق و خراسان و روم را در تحتِ تصرف داشتہ اند، چہ قدر ممالک محروسہ گذشتہ وضبط بود و ہرگز لافِ خود و خودپرستی نزدند باوجود حشمت و بختیاری آنحضرت و سخن سرسری از زبان بتوفیق اللہ تعالیٰ ہیچ پادشاہی در سلطنت و لوازم جہان آرائی جہانبانی کم و کاستی نیست و ہمیشہ ایں سلسلۂ علیہ گورگانی صاحب‌قرانی بااعدای دین و دولت و باغیان و دشمنان ملک و ملت مظفر و منصور برآمدہ!

بزرگش نخوانند اہل خرد | کہ نام بزرگان بزشتی برد
بترس از غلط کاری روزگار | کہ چون تو بسی را غلط کردہ کار۔

ہرگاہ کہ ملازمان رفیع الشان مجوز این معنی باشند و زیادتی و پیش دستی نمایند لازم است کہ این جانب نیز بندگان ہواخواہان و خادمان دولت پناہ امر عالی معالی شود کہ بزودی بازوی شجاعان و غازیان سعادت کیش و ہزبران جنگ نہاد ملک

خراسان و عراق را پامال حوادث بگردانند"

والسلام

مذکورہ بالا دونوں خطوط کے سلسلے میں ابھی کئی باتیں تحقیق طلب ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ عباس کا خط کس سفیر کے ذریعہ ہندوستان آیا، دوسری یہ کہ جہانگیر کا خط لے کر ایران کون گیا؟ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جہانگیر کے اس تلخ و تند لہجہ کا شاہ عباس پر کیا اثر پڑا ہوگا، کیا واقعی یہ خط شاہ عباس تک پہنچا یا صرف لکھا گیا، پھر سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کو بھیجنا مناسب نہیں سمجھا گیا؟ یہ تمام سوالات تاریخ سے متعلق ہیں، اس لیے ہم ان کا جواب مورخین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ان خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

کیا شیخ حمید الدین ناگوری فیضی کے دادا تھے؟

از جناب محمد طیب صاحب صدیقی ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

فیضی یکم شعبان ۹۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ میں انتقال کیا، وہ عربی النسل تھے، یمن [illegible] ان کے اجداد کا وطن تھا، شیخ موسیٰ جو ان کی پانچویں پشت میں ہیں، نویں صدی میں سیوستان کے قصبہ ریل میں آباد ہوئے، دسویں صدی ہجری کے ابتدا میں فیضی کے دادا شیخ خضر ہندوستان آئے اور ناگور میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں ایک متمول عربی خاندان میں شادی کرلی،

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری فیضی کے اجداد میں ہیں، صاحب خلاصۃ الکلام نے تو پورے اعتماد کے ساتھ لکھدیا ہے کہ شیخ خضر کے والد کا نام قاضی حمید الدین ناگوری ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"شیخ ابو الفیض فیضی و فیاضی بن شیخ مبارک بن شیخ خضر بن قاضی حمید الدین ناگوری بحسب و نسب از مشائخ عرب است ...... و قاضی مشار الیہ استاد خواجہ قطب الدین اوشی کاکی بود۔"[1]

علی احمد خاں ہاشمی رقمطراز ہیں :-

"شیخ فیضی فیاضی پسر شیخ مبارک است کہ نبائر شیخ حمید الدین ناگوری بودہ"[2]

ابو طالب تبریزی اصفہانی مصنف تذکرہ خلاصۃ الافکار لکھتے ہیں :

لہ خلاصۃ الکلام قلمی ص ۴۹۶، ۲ے مخزن الغرائب قلمی ص ۹۳۵

"شیخ فیضی بن شیخ مبارک برادر کلاں شیخ ابوالفضل است کہ دارالانشاء اکبر بادشاہ تعلق بوی داشتہ ونسب نامش بہ قاضی حمید الدین ناگوری کہ استاد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی است می پیوستہ"[1]

بارہویں صدی ہجری کے مشہور تذکرہ نگار، والہ داغستانی نے لکھا ہے :۔

"شیخ فیضی بن شیخ مبارک و برادر مہین شیخ ابوالفضل است از اولاد قاضی حمید الدین ناگوری است کہ استاد خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی بودہ"[2]

اس مسئلہ پر خود فیضی کی رائے زیادہ اہم ہوگی، وہ لکھتے ہیں :۔

"قاضی حمید الدین ناگوری پور عطاء الدین بخاری در بخارا بزاد. در زمان معز الدین سام با پدر بدہلی آمد سہ سال بقضای ناگور پرداخت........ بخواجہ قطب الدین پیوند دوستی گزید........ شب پنجم رمضان شش صد وچہل وچہار (۶۴۴ھ) بی رنجوری بعالم علوی شتافت خوابگاہ دہلی"[3]

واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں حمید الدین نام کے دو بزرگ گذرے ہیں، ایک قاضی حمید الدین جو تین سال تک ناگور کے قاضی کے عہدہ پر فائز رہے، اور جن کا مزار مہرولی دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے مزار کے پائیں ہے، وہ قاضی حمید الدین ناگوری کہلاتے ہیں، دوسرے سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوریؒ جو سلطان العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے پیر بھائی ہیں، ان کا مزار ناگور میں ہے، قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ اور حضرت زکریا ملتانی، حضرت جلال الدین تبریزیؒ،

---

[1] خلاصۃ الافکار، قلمی، ص ۱۳۴ [2] ریاض الشعراء، قلمی ص ۳۰۸ [3] آئین اکبری ج ۳ ص ۲۸۱ مطبوعہ نولکشور۔

شیخ سورئیؒ ، اور حضرت شہاب الدین پیر جگ جوتؒ جیٹھلی ضلع پٹنہ کے پیر بھائی ہیں ، یہ سلطان شمس الدین التمش اور قاضی منہاج سراج کے زمانہ میں تھے ، ان کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا ، اور شیخ حمید الدین ناگوری نے ناگور (راجپوتانہ) میں ۱۲۷۴ء میں انتقال کیا جس طرح ہجرت نبوی کے بعد مہاجرین کے یہاں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ پہلی اولاد نرینہ پیدا ہوئے ، اسی طرح دہلی کی فتح کے بعد شیخ حمید الدین ناگوری پہلی اولاد نرینہ ہیں ، اصول الطریقۃ اور سرور الصدور ان کی تصانیف ہیں ، سرور الصدور ان کے ملفوظات کا مجموعہ جسے ان کے پوتے شیخ فرید الدین نے جمع کیا ، یہ ناگور کے قریب سوآی کے رہنے والے ہیں ، اس لیے بہت سے لوگ ان کو شیخ حمید الدین سوای بھی کہتے ہیں ، ان سے اور حضرت زکریا ملتانی سے فقر و غنا کے مسئلہ پر خط و کتابت ہوتی تھی ،

قاضی حمید الدین ناگوری محض ناگور کے قاضی ہونے کی وجہ سے ناگوری مشہور ہو گئے ۔ ان کا اصل نام محمد بن عطا بخاری تھا ، طوالع الشموس ان کی مشہور تصنیف ہے ، ان کا ایک رسالہ عشقیہ ہے ، جس میں عشق الٰہی کے مضامین شاعرانہ نثر میں بیان ہوئے ہیں ، طوالع الشموس میں اسمائے حسنہ کی شرح تصوف و طریقت کی زبان میں ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری نے شمس الدین سمرقندی سے فیض حاصل کیا تھا ، اور معز الدین سام کے زمانہ میں اپنے والد کے ساتھ بخارا سے دہلی آئے تھے ، دہلی سے ناگور کی قضا پر مامور کیے گئے ، یہاں سے بغداد تشریف لے گئے ، اور یہاں سے حج بیت اللہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ گئے ، وہاں سے واپس ہو کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے ، اور ان ہی کے ساتھ رہنے لگے ، وہ سماع کے بڑے دلدادہ تھے ، اور سلطان شمس الدین التمش کے

عہد حکومت میں علما کی مخالفت کے باوجود بادشاہ وقت سے اس کی اجازت لے لی تھی، دہلی میں سماع کا آغاز ان ہی کی آمد کے بعد سے ہوا۔

بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے استاد تھے، لیکن اس بارے میں تحقیق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ قطب صاحب کی پیدائش کا سال ۵۸۲ھ اور وفات کا سال ۶۳۳ھ ہے، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری شیخ خضر کے والد اور فیضی کے پردادا ہیں، جو قرین قیاس بھی نہیں ہے، صرف "ناگوری" کی نسبت کے سبب سے تذکرہ نگاروں کو مغالطہ ہوگیا ہے، قاضی صاحب اور ان کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے، اور فیضی کے اسلاف کا وطن یمن تھا، اگر فیضی کے خاندان سے ان کا تعلق ہوتا تو شیخ ابوالفضل نے آئین اکبری کے خاتمہ میں جہاں اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، ان کا ذکر ضرور کرتا، اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری کا فیضی کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بزم صوفیہ

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

اہلِ چمن کے کیوں نہ لگے تن بدن میں آگ
جب باغباں لگائے خود اپنے چمن میں آگ

دار و رسن کی نذر کریں جاں وہ ہم نہیں
ہم وہ ہیں جو لگاتے ہیں دار و رسن میں آگ

اس شان سے ہیں ہم سوئے منزل رواں دواں
صحرا میں جیسے تند ہوا، جیسے بن میں آگ

محفل میں انجماد تھا جبتک تھے ہم خموش
ہم لب کشا ہوئے تو لگی انجمن میں آگ

غنچہ کے رنگ پر بھی ذرا ڈالیے نظر
یہ بھی تو دیکھئے ہے لبِ خندہ زن میں آگ

کیا شکوۂ عداوتِ اغیار کیجئے
اہلِ وطن جب آپ لگائیں وطن میں آگ

جلتا رہے گا تا بہ ابد آدمِ حزیں
روزِ ازل لگی تھی دلِ اہرمن میں آگ

پیشانیاں جو رہتی تھیں اب تک عرق سے تر
پوشیدہ آج ان کی ہے ہر ہر شکن میں آگ

ابھریں گے شعلہ بن کے کبھی یہ لہو کے داغ
زیرِ زمیں بھی ہم ہیں چھپائے کفن میں آگ

جو اتصالِ تیشہ و خارا کی دین ہے
کچھ اس سے مختلف ہے دلِ کوہکن میں آگ

سوزِ دروں سے اپنی تو ہستی ہی جل گئی
پھیلی جو شہرِ دل سے لگی ملکِ تن میں آگ

ہم دل جلوں کی تلخیٔ گفتار ہو معاف
سینہ سے بڑھ کے آگئی کام و دہن میں آگ

کس نے عطا کیا ہے اسے سوزِ دل ولیؔ
آئی کہاں سے لالۂ خوں پیرہن میں آگ

غزل

از

جناب عروج زیدی رامپور

شورشِ فتنہ و بیدادِ ستم جاگے ہیں
اک قیامت سی جلو میں ہے جو ہم جاگے ہیں

راہِ منزل میں چراغاں! غلط اندیشی ہے
رہ نمائی کو مرے نقشِ قدم جاگے ہیں

اب کھلی ہیں غمِ دوراں سے ہماری آنکھیں
وہ الگ بات ہے جو ہم شبِ غم جاگے ہیں

خوابِ راحت میں تھے ہم جب تھا مقدر بیدار
اب جو جاگے ہیں تو بادیدۂ نم جاگے ہیں

میری تکبیر نے وحدت کا بھرم رکھا ہے
کلمہ پڑھتے ہوئے اصنامِ حرم جاگے ہیں

ضبطِ تحریر میں لاتا ہے انھیں خونِ جبیں
ورنہ کیا بات ہے کیوں لوح و قلم جاگے ہیں

خود فریبی ہے کہ افسونِ گراں خوابی ہے
نیند کے ماتے یہ کہتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

بے خبر سوتے تھے آغوشِ رواداری میں
آج بھی تم نے جگایا ہے تو ہم جاگے ہیں

میں نے بخشی ہے انھیں دولتِ احساس عروج
بے نیازی سے مری، اہلِ کرم جاگے ہیں

نوائے عصر

نوائے حیات کے بعد جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے قلم سے پیش لفظ اور مولانا شاہ معین الدین احمد کے قلم سے تعارف ہے۔

قیمت ۳ ؎

مطبوعات جدیدہ

اتحاف النبیہ فیما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ | از حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ترتیب و تحشیہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، تقطیع متوسط کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات: ۱۹۴ قیمت: معہ ر پتہ:- المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور، نمبر ۲ پاکستان۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور تصنیف الانتباہ من سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ کا جو علم ظاہر و باطن کے سلاسل و اسناد پر مشتمل ہے، پہلا جزء جو سلاسل تصوف کے بیان میں ہے، عرصہ ہوا مع اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے، لیکن دوسرا جزء غیر مطبوعہ اور نایاب تھا، پاکستان کی جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم مولانا عطاء اللہ حنیف کو حسن اتفاق سے اس کا وہ نسخہ دستیاب ہو گیا، جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن، اور اُن کے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی نظر سے گذر چکا تھا، مگر یہ ناقص تھا دوسرا مکمل نسخہ مشہور فاضل مولانا عبد الرشید نعمانی کے یہاں سے فراہم کرکے اس کو ضروری حواشی اور اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس جزء میں حدیث و فقہ کی اہم اور متداول کتابوں کے اُن کے مصنفین تک اسناد و اجازات درج کیے گئے جو شاہ صاحب کو اُن کے شیوخ و اساتذہ اور ان کو انکے شیوخ و اساتذہ نے دئے تھے، اسکے علاوہ اس میں حدیث و فقہ کے متعلق دوسرے مفید معلومات بھی ہیں، خصوصاً کتب حدیث کے طبقات اور تقلید و اجتہاد پر پُر مغز اور جامع

بحث کی گئی ہے، فاضل مرتب نے تصحیح میں بڑی سعی و کاوش سے کام لیا ہے، اور شاہ صاحب اور اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تصنیفات اور دوسری جن کتابوں میں اس قسم کے مباحث مذکور ہیں، اس کی تصحیح میں ان سب سے استفادہ کیا ہے، حواشی میں متن کے اسماء و اعلام اور کتابوں کے متعلق معلومات اور مقدمہ میں سند و اسناد اور بعض مصطلحات فن کی تشریح و تعریف، علم اسناد کی دینی اہمیت و ضرورت کی وضاحت اور شاہ صاحب تک مرتب نے اپنے اسناد تحریر کئے ہیں، آخر میں مراجع و مصادر کا مکمل انڈکس بھی ہے، اس نادر و کمیاب علمی و دینی کتاب کی اشاعت پر لائق مرتب اور مکتبہ سلفیہ دونوں اہل علم کی تبریک کے مستحق ہیں،

گل رعنا۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۰۶ مجلد مع گردپوش، قیمت ﷽ ۔ پتہ، علمی مجلس، چھتہ نواب مختار فراشخانہ، دہلی ۶۔

مرزا غالب مرحوم نے کلکتہ میں قیام کے زمانہ میں اپنے ایک عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اپنے اردو و فارسی کلام کا ایک انتخاب گل رعنا کے نام سے کیا تھا، یہ اولین انتخاب مفقود و معدوم تھا، چند سال پہلے حیدرآباد کے بلگرامی خاندان میں اس کا مکمل خطی نسخہ مشہور محقق اور ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب کو مل گیا، جس کو انھوں نے بڑے اہتمام سے ایک مفید مقدمہ اور تحقیقی حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، اس مجموعہ میں غالب کی ایک سو سولہ اردو اور ستائیس فارسی غزلوں کے انتخاب کے علاوہ ان ہی کے قلم سے ایک دیباچہ و خاتمہ جو فارسی زبان میں ہیں، شامل کیا ہیں، حسن اتفاق سے گذشتہ سال گل رعنا کا وہ نسخہ بھی لاہور میں مل گیا، جو خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، فاضل مرتب نے غالب کے مختلف متداول و غیر متداول دواوین کے علاوہ اس سے بھی ترتیب و تحشیہ میں مدد لی ہے، حواشی دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں، اور ان میں مختلف نسخوں کے اختلاف کو واضح

کیا گیا ہے، مقدمہ میں غالب کے کلکتہ کے سفر اور گل رعنا کی دستیابی کی دلچسپ روداد اور غالب اور ان کے مختلف دواوین کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، لیکن مقدمہ اور مرتب کی بعض دوسری تحریروں میں کہیں کہیں تضاد ہو گیا ہے، مثلاً مقدمہ میں انھوں نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے متعلق لکھا ہے کہ "انھیں شعر و سخن سے کوئی واسطہ نہ تھا"، نیز "ایک مولوی کی جسے شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا"، حالانکہ اس مولوی کی سخن فہمی کی غالب نے خود اپنے قصائد میں تعریف کی ہے، اور لائق مرتب نے بھی ذکرِ غالب میں ص ۴۶ ۔ ۴۷ پر لکھا ہے کہ "یہ شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، اور غالب ان کے پایۂ سخن سنجی کو مانتے تھے، مقدمہ میں انھوں نے آزاد کی روایت کو بالکل مہمل قرار دیا ہے، مگر ذکرِ غالب میں اس کے اس جز سے اتفاق کیا ہے کہ مولوی صاحب اور مرزا خانی کوتوال کے کہنے پر غالب نے اپنا رنگِ سخن بدل دیا تھا، اسی طرح یہاں غالب کی دلی سے کلکتہ کی روانگی نومبر یا دسمبر ۱۸۲۶ء میں درج ہے، عیارِ غالب میں دسمبر ۱۸۲۶ء اور ذکرِ غالب میں "غالباً اگست ۱۸۲۶ء" لکھی گئی ہے، تعجب ہے کہ غالبیات کے ایک دیدہ ور ماہر کے قلم سے اس قسم کی متضاد باتیں کس طرح نکل گئی ہیں، نسخہ حمیدیہ کو بالکل ساقط الاعتبار کہنا بھی عیب ہے، جب کہ خود مرتب کو بھی اعتراف ہے کہ "سال بھر پہلے تک اردو دیوان کا یہی قدیم نسخہ تھا"۔ اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں ایک اہم اور مفید اضافہ ہوا ہے۔

مجلہ سیفیہ غالب نمبر: مرتبہ جناب متین سید صاحب متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۷۰، قیمت درج نہیں، پتہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال۔

سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو نے بھی غالب صدی تقریبات کے سلسلہ میں کالج میگزین کا غالب نمبر شائع کیا ہے، جو بڑے سلیقہ اور خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا ہے، اس میں غالب کے فن اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر متنوع اور دلکش مضامین اور چند منظومات شامل ہیں

غالب کی بعض تحریروں کا عکس اور اردو کلام کا مختصر انتخاب بھی دیا گیا ہے، کالج کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ کئی مشہور اہل قلم کے مضامین بھی ہیں، اس نمبر میں اہم اور قابل ذکر مضمون جناب عبد القوی دسنوی صدر شعبۂ اردو کے قلم سے "نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی" ہے، اس میں بھوپال سے دریافت ہونے والے دیوان غالب کے دو قلمی نسخوں یعنی نسخۂ حمیدیہ جو ۱۹۱۸ء میں دریافت اور ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا، اور دوسرا گذشتہ سال غالب صدی کی دھوم دھام میں نو دریافت نسخہ جو دیوان غالب بخط غالب نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے رام پور اور نقوش لاہور غالب نمبر حصۂ دوم میں "بیاض غالب" کے نام سے شائع ہوا ہے، کے متعلق اصحاب علم و ادب کے بیانات اور تحریریں جمع کرکے مفصل معلومات اور ان سب اشعار کا ذکر ہے جن پر مرزا نے اپنے قلم سے اصلاحات کی ہیں، گو حال میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے نسخۂ بھوپال ثانی کے جس کا بخط غالب ہونا تقریباً مسلم سمجھا جاتا تھا، بارہ میں متعدد شبہات وارد کئے ہیں، تاہم اس سے دسنوی صاحب کی محنت و کاوش میں کوئی فرق نہیں آتا، ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "غالب کا صحیفۂ منسوخ" بھی نوک طرز کا دلچسپ ہے، سید حیدر عباس رضوی اور ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضامین بھی خاصے ہیں، البتہ پروفیسر مجیب صاحب کے مضمون میں غالب کی آزاد مشربی اور اباحیت کو جن الفاظ میں سراہا گیا ہے، وہ ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امیر کی شان سے فروتر بھی ہے اور غیر ضروری بھی، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر غالب پر شائع ہونے والے اچھے نمبروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے،

(ض)

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: للعہ/

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " للعہ/

۳۔ اسوۂ صحابیات: " عا/

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: غلعہ/

۵۔ حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلعہ/

حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: للعہ/

شعر الہند (حصہ اول) " غلعہ/

شعر الہند (حصہ دوم) " للعہ/

۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشا پردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ/

۱۰۔ سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیرِ طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور ان کی تصنیفات: قیمت للعہ/

۱۲۔ ابنِ خلدون: ابنِ خلدون کے سوانحِ زندگی اور اس کے فلسفہ کی تشریح (زیرِ طبع)

۱۳۔ اقبالِ کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، ان کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت للعہ/

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی، تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل لکھے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۲۶ قیمت: عہ/ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے ا
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی
مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلاتفریق مذہب و ملت
نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے
مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتا
انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف
کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا ک
سلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے
یہ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورت
درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلاتفریق مذہب
پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب ا
غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے ابواب
دنیا پر یورپ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارنامے اور مختلف علوم
ن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ضخامت :- ... صفحے، قیمت :

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زادو بوم سرتاپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب و مشرکین عرب غیرہ سب اہل … غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دین اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون اور ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۲۳۰ صفحے، قیمت :- ۵/ر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ